سلسلہ ندوۃ المصنفین دہلی

23

ہندوستان میں مسلمانوں

کا

نظامِ تعلیم و تربیت

جلد دوم

تالیف

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

ندوۃ المصنفین، اردو بازار، دہلی

سلسلۂ مطبوعات ندوۃ المصنفین (۲۳)

ہندوستان میں مسلمانوں
کا
نظامِ تعلیم و تربیت

جلد دوم

جس میں نہایت تحقیق و تفصیل کے ساتھ یہ واضح کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں قطب الدین ایبک کے زمانے سے لے کر اب تک تاریخ کے مختلف دوروں میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت کیا رہا ہے، اسی کے ساتھ جگہ جگہ اہم اور معرکۃ الآرا مباحث آگئے ہیں

تالیف
حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی
صدر شعبۂ دینیات، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن
رفیق اعزازی ندوۃ المصنفین

مطبوعہ
مطبع انتظامی حیدرآباد دکن
باہتمام، عمید الرحمن عثمانی، ندوۃ المصنفین، اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ والصلاۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔

بجائے ایک جلد کے وہی کتاب جو ایک مختصر سے مضمون کی شکل میں شروع ہوئی تھی دو جلدوں میں تقسیم ہوگئی۔ پہلی جلد کے بعد دوسری جلد اب آپ کے سامنے ہے۔ جنگ کی افراتفری میں جہاں دنیا کے دوسرے بڑے چھوٹے کام متاثر ہو رہے ہیں، اشاعت و طباعتِ کتب کا مسئلہ بھی حسبِ رسدی کے مطابق مصائب کا شکار ہے کتاب کی اس دوسری جلد کی کاپی دلی میں لکھی گئی، چھپنے کے لیے حیدر آباد آئی۔ اس طولِ عمل کی وجہ سے جو رکاوٹیں پیدا ہوئیں، اب ان کی تفصیل

سفینہ اپنا کنارہ جب آلگا غالبؔ خدا سے کیا ستمِ جورِ ناخدا کہیے

البتہ اس تگ و دو اور ذمہ داریوں کو مختلف حضرات کے سپرد کرنے کا خمیازہ کہیے یا بحالتِ بیکسی و مسافرت اس غریب کتاب کے چھپنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ علاوہ عام طباعتی اغلاط کے دو جگہ ایسی ناقابلِ عفو فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں کہ ان کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے پڑھنے سے پہلے ہی ناظرین کو ان سے واقف کردینا ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو کتاب کا ص ۲۰۹ اس میں ایک روایت کے متعلق یہ لکھا گیا تھا کہ کس کتاب کی یہ روایت ہے اس کا اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے لیکن بحمد اللہ بعد کو امام بخاری کی کتاب ادب المفرد میں وہ روایت مل گئی، اس لیے پہلی عبارت کو قلمزد کر کے کتاب کا حوالہ دے دیا گیا۔ لیکن کاتب صاحب کی مہربانی کہ انھوں نے اسے قلمزد نہیں فرمایا، گویا روایت کے مل جانے اور نہ ملنے کا ذکر اس میں درج کیا ہے۔

اسی طرح ص ۲۹۰ میں ایک نوٹ جس کا اندراج حاشیہ میں ہونا چاہیے تھا، کاتب صاحب نے اصل کتاب کی عبارت میں اس کو اس طرح شریک کردیا ہے کہ مضمون ہی خبط ہو کر رہ گیا

ہے۔ اربابِ نظر سے توقع ہے کہ ان غلطیوں کو معاف فرمائیں گے۔
باقی عام غلطیوں کے متعلق کیا لکھا جائے۔ غلط ناموں کا اضافہ عموماً مفید ثابت نہیں ہوا ہے مشکل ہی سے پڑھنے والے ان سے نفع اٹھاتے ہیں، کاغذ کی گرانی کے اس زمانہ میں اس لیے اس کے اضافے کی ہمت نہ ہوئی۔
کتاب کی پہلی جلد کو پڑھکر مختلف دوائر اور حلقوں میں اس کا جو اثر لیا گیا مسکین مصنف کی توقعات سے وہ بہت زیادہ ہے۔ البتہ ترتیب اور مضامین کا عنوانوں سے خالی ہونا ان دونوں باتوں کی بجا شکایت لوگوں نے ضرور کی ہے لیکن کن مجبوریوں سے یہ نقائص رہ گئے ہیں، اب اسے کیا بتایا جائے اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ اشاعت میں انشاء اللہ ان کوتاہیوں کا ازالہ کر دیا جائیگا۔ خصوصاً ذیلی عنوانوں کا اندراج اصل کتاب میں اور ان ہی کے اعتبار سے مفصل فہرست کا شروع میں اضافہ بہت ضروری ہے البتہ ترتیب مضامین کے متعلق تصنیفی نفسیات کے ایک بہت بڑے ماہر کا مشورہ یہ ہے کہ موجودہ ترتیب کو بدل کر مضامین کی ترتیب کی جو شکل بھی اختیار کی جائے گی اس میں آورد کی بدمزگی کے ساتھ آمد کا لطف جاتا رہے گا۔ ان کا خیال ہے کہ اس قسم کی کتابوں کو جو محض کتاب بنانے کیلئے نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ دوسرے مقاصد کے حصول کا ذریعہ ان کو بنایا گیا ہو ان کے لیے یہ قطعاً غیر مناسب ہے کہ آب پاشی کی رپورٹ یا بنیوں کا مدولری کھاتہ ان کو بنا دیا جائے ان کی رائے ہے کہ جس حال میں کتاب قلم سے نکل پڑی ہے اسی حال میں اسکو چھوڑ دیا جائے۔ لاکھوں مرتبہ کتابوں کے ساتھ آخر کیا بگڑے گا اگر ایک غیر مرتب کتاب بھی لوگوں کے سامنے ہو۔
منجملہ دیگر اہم مقاصد کے جو اس کتاب کے لکھنے میں مصنف کے پیش نظر تھے، بڑا مقصد "نظامِ تعلیم کی وحدت" کے نظریہ کو پیش کرنا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بعض ممتاز مفکرین اور اربابِ سعی و عمل نے اسے مستحق توجہ قرار دیا ہے۔ بلکہ مولینا سید سلیمان ندوی نے خصوصیت کے ساتھ مختصر لفظوں میں خاکسار مصنف سے چاہا کہ "اس تعلیمی خاکے" کو مرتب کر کے انکی خدمت میں پیش کروں سید صاحب موصوف نے معارف ماہ جولائی ۵ھ میں شذرات کے تعارفی نوٹ کیساتھ اس خلاصہ کو شائع بھی کر دیا ہے۔ جس کو اب کتاب کے آخر میں شامل کر لیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جماعت بندی

قدیم نظامِ تعلیم پر جو اعتراضات اس زمانے میں کیے جاتے ہیں ان میں ایک نمایاں اعتراض یہ بھی ہے کہ جماعت بندی کا جو دستور عصری مدارس و کلیات میں ہے، یہ چیز اس وقت نہ تھی اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک یہ اعتراض صحیح ہے، اتنی سخت صف آرائی جس کی پابندی آج کل کی تعلیم گاہوں میں کی جاتی ہے۔ اتنی سخت کہ صف سے الگ ہو کر اگر کوئی کچھ بھی پڑھنا چاہے نہیں پڑھ سکتا، بلکہ پڑھنے اور سیکھنے کے لیے ان علمی صفوف میں سے کسی نہ کسی صف میں اپنے آپ کو شریک کرنا ناگزیر ہے، میں یہ مانتا ہوں کہ اس کا رواج اس وقت نہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس فوجی صف بندی کے اصول کو تعلیم گاہوں میں داخل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہوئی؟

جماعت بندی کی ضرورت

جہاں تک میں سمجھتا ہوں اگر ایسا نہ کیا جائے اور ہر پڑھنے والے کو آزادی دی جائے کہ جس کتاب کو جس وقت چاہے پڑھے۔ تو تنخواہ دار استادوں کی محدود جماعت سے ظاہر ہے کہ اس کا نباہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، اب تو ہر اسکول میں چند اساتذہ مقرر ہیں، ہر استاد سے چند صفوف اور جماعتوں کا تعلق ہے جسے جو کچھ پڑھنا ہے ان ہی صفوف میں گھس کر پڑھنا ہے، انفرادی طور پر ہر طالب العلم کے لیے بلکہ طلبہ کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے لیے کون نظم کر سکتا ہے۔

جماعت بندی کا نقصان

بلا شبہ اجر و مزد کے اس عہد میں اس طریقے کے سوا اور کوئی دوسرا طریقہ تعلیم کا ممکن بھی نہیں لیکن اس کا نتیجہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک ہی لاٹھی سے آپ

اپنی لانبی انگلیوں کو توڑے یا چھوٹی انگلیوں کی رگوں کو ڈھیلی کرکے اپنے آپ کو دکھ میں مبتلا کرے۔ دماغوں اور ذہنوں کو جب قدرت ہی نے برابر کرکے پیدا نہیں کیا ہے تو تعلیم جس کا بالکلیہ قاطبۃً تعلق دماغ و ذہن ہی سے ہے، سوچنے کی بات یہ تھی کہ اس قدرتی تفاوت سے آزاد ہو کر جس حد تک لوگ نفع اٹھا سکتے ہوں نفع اٹھانے کا ان کو موقع دیا جائے۔ آپ نے تو اس کو سوچا نہیں اور جن لوگوں نے اپنے امکان کی حد تک اس میں آزادی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہی کو مطعون و ملام ٹھہرایا۔ زیادہ دن کی بات نہیں ہے۔

نواب صدیق حسن کی تعلیم | مرحوم نواب صدیق حسن خاں[1] بھوپال والے مفتی صدرالدین خاں صاحب سے دلّی میں پڑھتے تھے۔ مفتی صاحب نے ان کی خاص دماغی حالت

[1] ہندوستان کے ان عالموں میں جن کی کتابیں ہند کے سوا مصر و قسطنطنیہ میں بھی طبع ہوئی ہیں ان میں نواب صاحب بھی ہیں۔ خدا نے ان کو ایک موقع دیا تھا جس سے علم و دین کی خدمت میں انھوں نے پورا پورا نفع اٹھایا اسلامی علوم میں شاید ہی کوئی فن ہو کہ جس میں نواب صاحب کی کتاب نہ ہو لیکن مجھے مصر کی ایک کتاب جس اکتفاء القنوع میں یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ اس نے نواب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

اصلہ من عوام الناس الا انہ توصل الے ملکۃ بھوپال فی اقلیم الدکن فی الہند وتزوج بہا وصار نائبا عنہا فعندما اغتنی بالمال جمع الیہ العلماء وارسل الناس فابتاع الکتب الخطیۃ من کل جہۃ وجمع مکتبۃ کبیرۃ وکلف من حولہ من العلماء بالتالیف ثم اخذ مصنفاتہم ونسبہا بل کان یختار الکتب القدیمۃ التی لم تکن لہا سوی النسخۃ الواحدۃ ویغیر العنوان ویبدلہ باسم اٰخر ویضع علی الصحیفۃ الاولی اسمہ القائم	دراصل ان کا تعلق عوام کے خاندان سے ہے لیکن کسی طرح بھوپال دکن کی ملکہ تک رسائی حاصل کی اور ان سے شادی کرلی اور ان کی طرف سے نائب بن بیٹھے۔ پھر جب دولتمند ہو گئے تب علماء کو اپنے اردگرد جمع کیا اور لوگوں کو کتابوں کے خریدنے کے لیے ادھر ادھر دنیا کے مختلف حصوں میں روانہ کیا جو ہاتھ کی لکھی ہوئی قلمی کتابیں فراہم کرکے ان تک پہنچاتے تھے۔ اس ذریعے ایک بڑا عظیم کتب خانہ اس شخص نے جمع کرلیا اور

ص ۲۵۲

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کو دیکھ کر ان کے لیے اسباق کا الگ مستقل انتظام کر دیا تھا اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ بیان تقریباً نواب صاحب کے اپنے قلم ہی کا قلمبند کیا ہوا ہے ۔

ایک سال آٹھ ماہ کی مدت میں کتب دانشمندی کو سبقاً سبقاً حاصل کیا۔ تحصیل کی سند حاصل کی۔ کتب متداولہ علوم رسمیہ جن کو اس مدت میں حاصل کیا یہ ہیں۔

مختصر معانی، تا آخر عبادات شرح وقایہ، معاملات ہدایہ، اوائل توضیح وتلویح اصول فقہ میں، سلم مع ملاحسن وحمداللہ و قاضی مبارک منطق میں، میبذی تمام و قدرے شمس بازغہ وصدرا مالعیم الاجسام تک، میر زاہد ملاجلال تابحث دلالت، میرزاہد شرح مواقف تابحث وجود، میرزاہد رسالہ تامذہب منصور، صحیح بخاری کے تین جز سماعاً، اول تفسیر بیضاوی قراۃً، دیوان متنبی نصف اول، بعض دیوان حماسہ، سبعہ معلقہ، مقالہ اول اقلیدس، قطبی مع میر قطبی شرح عقائد نسفی تمام، حاشیہ بحر العلوم بر میر زاہد، مقامات حریری و ہندی چند مقالات، شرح مطالع سماعاً، ص ۷ ہم ۲

ایک سال آٹھ مہینے کی مدت خیال کیجیے اور چھبیس کتابوں کے اس پشتارے کو ملاحظہ کیجیے۔ آج کوئی باور کر سکتا ہے کہ نصاب نظامیہ کی یہ اعلیٰ سخت دشوار کتابیں ایک شخص نے ڈیڑھ سال و د

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اور اپنے دربار کے علماء کو حکم دیا کہ کتابیں تصنیف کریں پھر انہی کی تصنیف کردہ کتابوں کو اپنی طرف منسوب کر لیتے تھے بلکہ ایسی قلمی کتابیں جن کا دنیا میں ایک ہی نسخہ تھا اس کا نام اور ابتداء کا دیباچہ بدل کر لوح کتاب پر اپنا نام القاب فاخرہ کے ساتھ درج کر دیتے تھے

اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب مرحوم کے متعلق اس قسم کی باتیں ہندوستانی مولویوں میں بھی مشہور ہیں اور غالباً کسی ہندی مولوی ہی سے مصر کے اس عیسائی عالم کو اس کا سراغ ملا۔ لیکن خود نواب صاحب کے ملنے والوں سے جہاں تک میں نے سنا ہے عقیدتاً وعملاً ان کی حالت جیسی کچھ ہو لیکن علم کی سب تعریف کرتے ہیں ۱۲۔

مہینے میں پوری کرلیں۔ بلاشبہ جماعت کی پابندیوں کے ساتھ اس کا تصور دشوار ہی نہیں، ناممکن ہے، لیکن جس قسم کی آزادی مفتی صاحب نے نواب صاحب کو عطا کی تھی اور خدا نے جیسی طبیعت ان کو ارزانی فرمائی تھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ جو بات سوچی نہیں جاسکتی ہے وہ وقوع پذیر ہوئی تھی۔

قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کی تعلیم

حضرت قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی کی زبانی بھی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ "ہم نے مختلف علوم وفنون کی انتہائی کتابیں تقریباً پونے تین سال میں تمام کی تمام پڑھ لی تھیں[۱]

کسی موقع پر مولانا انوار اللہ خاں نواب فضیلت جنگ استاذ سلطان دکن خلد اللہ ملکہٗ کی ایک روایت طریقہ مطالعہ کی گذری ہے۔ مولانا نے آخر میں اس کی وجہ کہ کتابیں جلد کیوں ختم ہوتی تھیں۔ یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ طریقہ مطالعہ کی وجہ سے سبق کا زیادہ حصہ چونکہ طلبہ کے لیے سمجھا سمجھایا رہتا تھا۔ بجز چند شکوک وشبہات کے ازالے کے، استاذ کو کچھ کہنا نہ پڑتا تھا، اس لیے سبق کی مقدار زیادہ ہوتی، روزانہ صفحات کے صفحات ہو جاتے تھے۔

ایک ہی کتاب کا متعدد مقامات سے پڑھنا

جماعت کی قیدوبند سے جس زمانے میں علم وتعلیم آزاد تھا طلبہ کو اس کا بھی موقع دیا جاتا تھا کہ چاہیں تو ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے شروع کردیں۔ مولانا آزادی نے اپنی تحصیل کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میر طفیل محمد سے وہ اور ان کے خالہ زاد بھائی ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

طریق تحصیل چنیں بود کہ پیوستہ مسلسل	تحصیل علم کا طریقہ یہ تھا کہ مسلسل دو
دو کتاب یا کتابے واحد را از دو مقام	کتابیں یا کسی ایک کتاب کو دو جگہ سے
بہ سماعت وقرأت یکدگر می خواندم	پڑھتے، ہم دونوں باری باری اس طرح پڑھتے
	کہ ایک پڑھتا اور ایک سنتا۔

گویا کل دو آدمی ایک جماعت میں تھے، باری باری سے سبق ایک دن ایک پڑھتے اور

[۱] صفحہ ۳۹ تذکرۂ رحمانیہ۔

دوسرا سنتا، دوسرے دن پڑھنے والا سنتا اور سننے والا پڑھتا، یوں استاد کو پورا موقع ان کی خواندگی کی اصلاح کا ملتا تھا خصوصاً عربی زبان میں تو اس کی شدید ضرورت اعراب اور حرکات کی وجہ سے ہے ، گو ظاہر ہے کہ اتنی توجہ سے استاد چند ہی طالب العلموں کو پڑھا سکتا ہے۔ مولانا آزاد کا یہ فرمانا کہ ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے شروع کر دیتے تھے۔ اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ کتابوں یا علوم کی دو قسمیں ہیں، بعض علوم تو ایسے ہیں کہ جب تک ان کے اول کو نہ پڑھا جائے آخر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ مثلاً اقلیدس کا جو حال ہے۔ مگر علم کی ایک قسم وہ بھی ہے کہ اول کو آخر کے بغیر اور آخر کو اول کے بغیر پڑھ سکتے ہیں، مثلاً فقہ کے ابواب کا جو حال ہے۔ آپ معاملات کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں، خواہ نماز روزہ و صلوٰۃ کے مسائل آپ سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں۔ یہی حال نماز یا روزہ کے مسائل کا ہے کہ کسی کو مساقاۃ یا مضاربت کے مسائل نہ معلوم ہوں تو اس سے نماز و روزہ کے مسائل کے سمجھنے میں کیا دشواری پیش آسکتی ہے۔ میرے نزدیک تو اس طریقے کا ایک کتاب کا پڑھانا ان چند کتابوں کے پڑھانے سے بہتر ہے، جن کی تھوڑی تھوڑی مقدار تا نصاب پڑھا کر چھوڑ دی جاتی ہیں، اور اس کا اچھا طریقہ یہی ہے کہ بجائے دو کتابوں کے ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے پڑھایا جائے۔ لیکن یہ ساری آزادیاں آزاد درس ہی میں برتی جا سکتی ہیں۔ جماعت بندی کی گھسیٹ میں نہ تو یہ ممکن ہے نہ وہ، بلکہ جو چل رہا ہے وہی ٹھیک ہے۔

قلیل عرصے میں زیادہ پڑھنے کا موقع ذہین طالب العلموں کو ایک تو اسی لیے مل جاتا تھا کہ ان کو اونٹ کے گلے میں لٹکا نہیں دیا جاتا تھا، ہرن کو اپنی چال سے اونٹ کو اپنی چال سے چلنے کی آزادی تھی۔ ممکن ہے کہ کچھ اس کو بھی دخل ہو جو مولانا آزاد کے بیان سے ثابت ہوتا ہے، یعنی ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے پڑھنا اور سب سے بڑی قیمتی بات وہ نسبت تھی جو

اساتذہ و طلبہ کے باہمی تعلقات

اس زمانے میں اساتذہ اور طلبہ میں قائم ہو جاتی تھی۔ ایسے اساتذہ جو بغیر کسی معاوضے کے پڑھایا کرتے تھے، ان کی طرف سے طلبہ کے قلوب میں ممنونیت کے جو جذبات پیدا ہو سکتے ہیں وہ تو ظاہر ہی ہے، لیکن معاوضہ والے استادوں کی بھی

شفقت و مہربانی طلبہ کے حال پر مبنی رہتی تھی، دیکھ دردیں جس طرح کام کرتے تھے، بتدریج یہی چیزیں تعلقات کو بڑھاتے ہوئے ایک ایسی حد پر پہنچا دیتی تھیں کہ شاگردوں کا تعلق استادوں سے کبھی اتنا بڑھ جاتا تھا کہ شاید ماں باپ کے ساتھ بچوں کو اتنا تعلق نہیں ہو سکتا۔ اب آپ خود ہی خیال کیجیے استاد کا جب یہ حال ہو، مثلاً اکبری عہد کے ایک عالم جو طبیب بھی تھے اس لیے حکیم الملک گیلانی کے نام سے مشہور تھے۔ اصلی نام شمس الدین تھا، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ملازم تو دربار کے تھے، اکبر کے خصوصی معالجوں میں یہ بھی داخل تھے، لیکن

"پیوستہ طلبہ را درس گفتے و بے ایشاں طعام نخوردے" (ص ۱۵ تذکرہ علمائے ہند)

مسلسل طلبہ کو اسباق پڑھاتے رہتے اور ان کے بغیر کھانا نہیں کھاتے۔

تنخواہ بہ صیغۂ طبابت مل رہی ہے، ایک حرف بھی نہ پڑھاتے تو ان کی تنخواہ میں پیسے کی کمی نہیں ہو سکتی تھی، نہ پڑھانے سے اضافہ لیکن تعلیم کے لیے معاوضہ کی ضرورت اس زمانہ کا سوال ہی نہ تھا، اور اسی کے ساتھ طلبہ کو اپنے گھر سے کھانا بھی دینا، ان کا اتنا خیال کہ جب تک سب طالب العلم جمع نہیں ہو لیتے، خود بھی وہ کھانا نہیں کھاتے، سوچا جا سکتا ہے کہ ایسے استادوں کا قدرتاً تلامذہ کے قلوب پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔

مولانا برکات احمد ٹونکی کی درسگاہ اور طلبہ کے کھانے کا نظم

میں نے عرض کیا تھا کہ خود ہمارے استاد مولانا برکات احمد ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کا قریب قریب یہی معاملہ تھا، وہ بھی تنخواہ طبابت کی راہ سے پاتے تھے لیکن عمر بھر پڑھاتے رہے اور دس بیس طالب العلموں کو کھانا دے کر پڑھاتے رہے۔ اس راہ میں وقت کی، مال کی، دل کی، دماغ کی جو قربانیاں حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کرنی پڑیں ان سے وہ یا ان کا خدا ہی واقف ہے۔ لیکن اس کا اثر کیا تھا، میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی طالب علم حضرت سے رخصت ہوا ہو اور بچوں کی طرح بلبلا کر رو نہ پڑا ہو، دوسروں کا حال کیا بیان کروں خود راقم الحروف کا حال بھی یہی تھا، اور اب بھی حضرت والا کی پدرانہ شفقتوں کا جب خیال آتا ہے دل تڑپ اٹھتا ہے، بیتے ہوئے دن

زندگی کے سامنے آجاتے ہیں۔[1]

کوئی یقین کر سکتا ہے، اس قصہ کا جس کے راوی مولانا آزاد

استاد کا تعلق شاگرد سے

بلگرامی ہیں، استاذ و شاگرد کے تعلقات کہاں تک پہنچے ہوئے تھے ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ جن کا ذکر مختلف حیثیتوں سے پہلے بھی گزر چکا ہے۔ ان کے حالات میں مولانا رقمطراز ہیں کہ ملا محمود کی وفات بالکل جوانی میں ہوئی، ان کے استاد مولانا محمد افضل، جنھیں شاہ جہاں کے دربار سے استاذ الملک کا خطاب تھا، اس وقت زندہ تھے، سنیے، استاذ کو خبر ملتی ہے کہ شاگرد مر گیا۔

"تا چہل روز استاذ راکسے بہ تبسم نہ	چالیس دن تک استاذ کو کسی نے مسکراتے
دید و بعد چہل روز استاد بہ شاگرد ملحق شد	ہوئے نہیں دیکھا اور بالآخر چالیس دن بعد مرحوم
شخصے ایں مصرعہ تاریخ یافت :-	شاگرد سے جاملے اور جنت کو سدھارے ایک شخص نے یہ مصرع تاریخ کہی

"زمحمود وافضل بگو آہ! آہ!"

مولانا احمد الدین بگوی کا حال

اور یہ تو خیر دو ڈھائی سو سال کی بات ہے۔ تیرھویں صدی کے ایک

---

[1] بے ساختہ یہاں اس واقعہ کے ذکر پر اپنے کو مجبور پاتا ہوں، حضرت حکیم صاحب بعض خاص پیچیدگیوں کی وجہ سے عزیز ترین مالی دشواریوں میں مبتلا ہو گئے، لیکن ایک اندرونی واقعہ تھا جس کی دوسروں کو خبر نہ تھی مصارف اپنے حال پر جاری تھے۔ طلبہ کی جتنی تعداد پہلے کھانا کھاتی تھی اندر سے ان کے لیے ہمیشہ کھانا آتا رہا۔ ایک دن حضرت کی اہلیہ محترمہ کو بالآخر انہی طلبہ کے لیے یہ کرنا پڑا کہ سونے کے کنگن انھوں نے اپنے ایک معتمد طالب العلم کے حوالے کیے، بازار سے بیچ کر یا گرو رکھ کر ان کے روپیہ سے گیہوں اور گھی خرید کر لا دے کہ طالب العلموں کے کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا، کنگن فروخت کیے گئے اور ان طالب العلموں کو کھلا دیے گئے، جن کی طرف سے دنیا میں حکیم صاحب یا ان کے اہل خاندان کو ایک حبہ کا نفع نہ اس وقت پہنچا تھا اور نہ اب پہنچ رہا ہے۔ اب قربانیوں کی ان مثالوں کو کہاں ڈھونڈا جا سکتا ہے، لیکن ان شاء اللہ یہی نیکیاں حضرت والا کو اب کام آ رہی ہونگی اور خدا سے امید ہے کہ ان کے پوتوں کے لیے آبا کا یہ صلاح باعث فلاح بن جائے۔ وما ذلک علی اللہ العزیز

عالم مولانا احمد الدین صاحب بگوی المولود ۱۲۱۷ھ لاہور میں درس دیتے تھے۔ حضرت شاہ اسحٰق صاحب محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ صاحب حدائق حنفیہ نے لکھا ہے کہ :۔

مولانا احمد الدین اور ان کے بھائی[1] سے جس قدر انتشار علم منقول و معقول پنجاب میں ان ہر دو بھائیوں سے ہوا کسی دوسرے سے نہیں ہوا۔ ہزارہا آدمی صرف بھائی سے لیکر ان سے فارغ التحصیل ہوئے۔ گویا پنجاب میں کوئی صاحب علم ان کی شاگردی سے بے بہرہ نہ ہوگا کوئی بالذات، کوئی بالواسطہ ان کے تلامذہ میں منتسب ہوگا۔ (حدائق ص۴۸۹)

بہرحال مولانا احمد الدین کے متعلق اسی کتاب میں لکھا ہے کہ :۔

حالت صحت و بیماری میں طالب العلموں کو سبق پڑھاتے رہتے تھے، طالب العلموں میں اگر کوئی بیمار پڑ جاتا تو اپنے ہاتھ سے دوا تیار کر کے دیتے۔" (حدائق ص۴۸۹)

مولانا عبداللہ بدایونی

ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنے ایک ہم وطن عالم استاد مولانا عبداللہ بدایونی کے متعلق یہ لکھ کر :۔

سالہا در بداؤں درس و افادہ فرمودہ	برسہا برس بدایوں میں درس و تدریس کی مسند
خیلے از دانش مندان نامی کہ بمرتبہ اشتہار	بچھائے رہے، بڑے بڑے مشہور و معروف معقولات
رسیدہ اند ——— از	میں ان سے وابستہ رہے اور ان کی درس گاہ
دامن او برخاستہ و مردم اکناف و اطراف	سے اٹھے اور دور دراز اطراف ملک سے
از قصبات و ولایات بہ ملازمت شریفش رسیدہ	لوگ آتے ——— اور خدمت بابرکت میں

[1] ان کا نام مولانا غلام محی الدین بگوی تھا۔ "بگا" پنجاب کے کسی گاؤں کا نام ہے۔ یہ بھی شاہ اسحٰق رح ہی کے فیض یافتوں میں ہیں لکھا ہے کہ لاہور میں لال کی مسجد میں تیس سال تک درس دیتے رہے۔ آخر میں فالج کا جب اثر ہوا تو بگا اپنے گاؤں چلے گئے جہاں تیرہ چودہ سال تک اسی بیماری کی حالت میں درس دیتے رہے۔ شاہی مسجد لاہور کے مشہور مدرس مولانا غلام محمد (جو بیک واسطہ خاکسار کے بھی استاذ ہیں، یعنی میرے استاذ مولانا محمد اشرف ملتانی جن سے ادب، ریاضی کی کتابیں فقیر نے پڑھی ہیں) انہی کے شاگرد تھے۔ فالحمد للہ۔

بہ سعادت جاودانی می رسیدند — رہ کر استفادہ کرتے

خود ملا عبدالقادر صاحب نے بھی شرح صحائف اور تحقیق در اصول ان ہی سے پڑھی تھی
ملا صاحب نے اپنا تجربہ ان کے علم کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ

مجھے از مسترشدان فیاض و متعلمان
صافی قریحہ شریک بودند و اشکالات دقیق
می آوردند ہرگز ندیدم او را کہ در افادہ
و افاضہ و حل آں ابحاث شریفہ و نکات
غامضہ احتیاج بہ مطالعہ افتادہ باشد

باکمال مسترشدین اور صاف دل طلبہ
کی ایک جماعت شریک ہوتی اور دقیق دقیق
اشکالات پیش کرتی مگر با ایں ہمہ ان مباحث
علمیہ اور مشکل نکات کے حل کے لیے آپ کو
مطالعہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔

جس سے اس زمانے کے طریقۂ درس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے جیسا کہ

گونگا درس اور نااہل اساتذہ

عرض کیا تھا کہ درس کے اس طریقہ سے ایک طرف طلبہ کی استعداد کا امتحان ہوتا رہتا تھا، اور دوسری طرف استادوں کی قابلیت کا بھی پتہ چلتا تھا جسے عصری طریقۂ تعلیم نے بالکل اندھیرے میں ڈال دیا ہے۔ اس گونگے درس میں عالم و جاہل ہر قسم کے استادوں کی کھپت بآسانی ہو رہی ہے۔ لیکن جس زمانہ میں استادوں سے طلبہ کو "اشکالات دقیق" اور ابحاث شریفہ و نکات غامضہ کے دریافت کرنے اور ان پر استادوں سے بحث کرنے کا حق حاصل تھا، ناکاروں کی گنجائش حلقۂ تدریس میں ناممکن تھی۔

طلبہ سے کام نہیں لیا جاتا تھا

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، اس کے متعلق کافی بحث پہلے ہو چکی ہے۔ اس وقت مجھے اسی میاں عبداللہ بداؤنی کے متعلق ملا عبدالقادر کی یہ شہادت پیش کرنی ہے کہ میاں صاحب کی منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی تھی۔

از بے اہتمام متاع خانہ خواہ قلیل باشد
یا خواہ کثیر و سائر مصالح ضروری مایحتاج الیہ
پیادہ بدکان و بازار تشریف می بردہ برداشتہ

اپنے گھر کے لیے سودا خواہ زیادہ ہو یا
کم اور تمام دوسری ضرورت کی چیزیں میاں
صاحب پیادہ پا دکان اور بازار سے جاکر

بمنزل می آورد[1]	لاتے اور خود اپنے اوپر لاد کر ان کو گھر پہنچاتے

ملا صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے کہ :۔

درمیان راہ جماعت طلبہ را سبق نیز می فرمود و ہر چند می گویند کہ حاجت تصدیع (تکلیف ۱۲) مخدومی نیست ما ایں خدمت را بجا می آریم قبول ندارد	راستہ میں طلبہ کی ایک جماعت کو سبق پڑھاتے، وہ سب کہتے کہ حضرت کو تکلیف کی ضرورت نہیں ہے ہم لوگ اس خدمت کی بجا آوری کے لیے حاضر ہیں، انجام دے لیں گے لیکن آپ اسے قبول نہیں فرماتے۔
(ص ۵۹ ج ۳)	

اور یہ تھا طلبہ کے ساتھ اساتذہ کا تعلق، طلبہ اصرار کر رہے ہیں کہ مجھے دیجیے ان چیزوں کو گھر تک پہنچا آتا ہوں، لیکن پیٹھ پر گٹھری لدی ہوئی ہے، سبق ہو رہا ہے، اور طلبہ کو تکلیف دینا نہیں چاہتے

---

[1] دارالعلوم دیوبند کے سابق مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کو خاکسار نے دیکھا تھا، ان کا بھی یہی حال تھا، حالانکہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے مدرسے کے سب سے بڑے مفتی تھے اور اسی لیے اخباروں میں عموماً ان کے زمانے میں لوگ ان کو مفتی اعظم کے لقب سے یاد کرتے تھے لیکن آخر عمر تک ان کو اسی حال میں دیکھا گیا کہ عصر کی نماز کے بعد نہ صرف اپنے گھر کا سودا سلف، بلکہ محلہ کی بوڑھی بیوہ عورتوں کی فرمائشوں کو بازار سے خرید کر ان کے گھر تک پہنچانا ایک ضروری کام کی حیثیت سے انجام دیتے تھے۔ ملا عبدالقادر نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ میاں عبداللہ کا یہ طریقہ نیا نہ تھا، بلکہ روش سلف و خلف کی یہ پیروی تھی، خدا کا شکر ہے کہ ان آنکھوں نے بھی خلف میں ایسی ہستیوں کو دیکھا تھا۔ ریاست ٹونک میں اسلامی ریاست کی ایک شان اب تک یہ باقی ہے کہ شریعت کا محکمہ وہاں قائم ہے، جس میں ناظم محکمۂ شریعت کے سوا چند مفتی بھی ریاست سے مقرر رہیں۔ ان مفتیوں میں ایک بزرگ مولانا نور الحق قدس سرہٗ بھی تھے۔ خاکسار نے چند رفقاء کے ساتھ ان سے مشکوٰۃ اور جلالین کے چند اجزاء پڑھے تھے۔ مولانا نور الحق باوجود مفتی شریعت ہونے کے بازار سے بھاجی دال بھی، الغرض خانگی سودا گھر کا خود خرید کر لاتے، ساری زندگی اسی طریقے سے گذاری ۱۲۔

شاگرد سے کام لینا رشوت کے مرادف ہے

اس سلسلے کا ایک دل چسپ عبرت آموز واقعہ حضرت جناب مولانا قاری عبدالرحمن صاحب محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جن کا ذکر ابھی گذرا ہے۔ قاری صاحب کے سعادت مند حفید رشید جناب قاری عبدالحلیم صاحب معلم حالی ہائی اسکول پانی پت نے قاری صاحب کی جو سوانح عمری "تذکرہ رحمانیہ" کے نام سے مرتب کی ہے اسی میں اس قصہ کو شیخ محمد ابراہیم حسن صاحب کی ایک کتاب "منظوم درۂ مرتشیؒ" سے بایں الفاظ درج فرمالیا ہے:۔

"میں (یعنی شیخ محمد ابراہیم) حضرت کے پاس بیٹھا تھا، آپ نے ایک خط لکھا اور اس انتظار میں تھے کہ کوئی خادم خاص نظر پڑے تو اس سے ڈاک میں ڈلوایا جائے، کسی مستفید شاگرد نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا "لائیے یہ خط میں ڈال آؤں" اور بے حد اصرار کیا۔ حضرت نے فرمایا، میں تم سے یہ کام لینا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ تمہارا تعلق میرے ساتھ تعلیم کا ہے۔ میرا حق استادی سمجھ کر یہ خط ڈاک میں ڈالو گے۔ میرے نزدیک یہ بھی ایک گونہ رشوت ہے۔ اس کے بعد لوجہ اللہ تعلیم کا خلوص باقی نہ رہے گا۔ لہذا میں تم سے یہ معمولی کام لیکر اپنا ثواب کیوں ضائع کروں" (ص ۱۹۹)

قاری عبدالرحمن پانی پتی کے تلامذہ

یہ زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے، قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شمار اپنے زمانے کے مشہور مدرسین میں تھا۔ حضرت شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی استاذ الکل کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ علماء کا ایک طبقہ آپ کے حلقۂ درس سے اٹھا۔ مولانا حالی صاحب کا ذکر تو گزر ہی چکا، صحاح ستہ کی کل کتابیں مولانا حالی نے قاری صاحب ہی سے پڑھی تھیں، ان کا ایک مستقل معرکۃ الآراء مقالہ بھی قاری صاحب کے خصوصیات و حالات پر چھپ چکا ہے۔ ان کے سوا پیر جماعت علی شاہ، مولانا گل حسن، مولانا مشتاق احمد امیٹھوی اور بیسیوں علماء نے آپ سے تعلیم حاصل کی، بلکہ جن لوگوں نے قاری صاحب سے استفادہ کیا ہے، اس فہرست میں شیخ الہند حضرت مولینا محمود حسنؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسے اکابر ملت کے اسمار گرامی بھی ہیں۔سوچنے کی بات ہے کہ جس کی ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گذری۔اس نے اپنے اس التزام کو کہ کسی شاگرد سے کسی قسم کا کوئی ذاتی کام اپنا نہ لوں گا' اور اس کو آخر وقت تک نباہ دینا کیا عزم وارادے کی حولی قوت کی دلیل ہے۔

تعلیم میں توجہ تام

شاگردوں سے کام لینے کو بھی رشوت قرار دینے کا غالبًا مطلب وہی ہے جس کا پتہ ان ہی کے ایک دوسرے طرزِ عمل سے چلتا ہے اسی کتاب میں قاری عبدالحلیم صاحب نے حضرت کا ایک اور قصہ نقل کیا ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ آپ سے ایک شیعی عالم کسی خاص فن کی کتاب پڑھا کرتے تھے۔مضمون سے ان کو چونکہ زیادہ دلچسپی تھی اس لیے چاہا کہ وقت ذرا زیادہ ہو جائے لیکن حضرت قاری صاحب عدم گنجائش کی وجہ سے راضی نہ ہوئے۔ان شیعہ صاحب کو خیال ہوا کہ اختلافِ مذہب کی وجہ سے غالبًا یہ بے اعتنائی برتی گئی۔یہی خیال کر کے انھوں نے عرض کیا کہ" اگر میں شیعیت کو ترک کر دوں اور سنی ہو جاؤں تو پھر تو آپ پوری توجہ کے ساتھ وقت دیں گے" حضرت نے ان کی زبان سے یہ سنکر فرمایا۔"تم مذہب تبدیل کرو یا نہ کرو' میری توجہ علم کے لیے ویسی ہی رہے گی' اس میں بال برابر فرق نہیں آسکتا۔

(تذکرۂ رحمانیہ ص ۱۹۲)

گویا تبدیل مذہب کی رشوت دے کر قاری صاحب کی توجہ کو ذرا زیادتی کے ساتھ اپنی طرف وہ مائل کرانا چاہتے تھے' خدمت لینے میں ان کو غالبًا یہی خیال ہوتا ہو گا کہ خدمت کی رشوت دے کر بہ نسبت دوسرے طالب العلموں کے بعض لوگ استاد کی توجہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں اور وہ شاگردوں میں اس فرق کو روا نہ رکھتے تھے۔

شاگرد کے ساتھ بے اعتنائی پر خفگی کا عالم

مذکورہ واقعہ سے اس تعلیمی بے تعصبی کا بھی آپ کو اندازہ ہوا ہو گا' جو ان بزرگوں میں عمومًا پایا جاتا تھا۔شاگردوں کا مقام اساتذہ کے قلوب میں کہاں پر تھا۔تذکرہ غوثیہ جو حضرت شاہ غوث علی بہاری وطنًا و پانی پتی

نزہلا کے حالات میں ایک دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں ایک قصہ مولانا فضل امام خیرآبادی کا درج ہے غالباً شاہ غوث علی صاحب کے ساتھ کا واقعہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مولانا فضل حق خیرآبادی جو مولانا فضل امام کے صاحبزادے ہیں، جوان تھے، اور اپنے والد کے ساتھ خود بھی دلّی میں درس دیتے تھے، جہاں مولانا فضل امام ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے صدر الصدور تھے۔ ایک طالب العلم مولانا فضل امام سے پڑھنے آیا۔ انھوں نے مولوی فضل حق صاحب کے پاس اس کو بھیج دیا کہ مجھے فرصت نہیں ہے تم ہی پڑھا دیا کرو، یہ طالب العلم بے چارا کچھ غبی تھا مولوی فضل حق صاحب کی جوانی کا زمانہ چند اسباق کے بعد ان کا جی اکتا گیا۔ ایک دن پڑھاتے ہوئے کتاب پھینک دی اور برا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ طالب العلم مولانا فضل امام کے پاس پہنچا، اور حال بیان کیا، "یہی سننے کی بات ہے" مولانا فضل امام آپے سے باہر ہو گئے۔ مولوی فضل حق کو اسی وقت طلب کیا طلبی کا فقرہ تھا" بلاؤ اس خبیث کو" جوان عالم بیٹا ہے، لیکن ایک طالب العلم کی تحقیر کی ہے۔ مولوی فضل حق سامنے آتے ہیں۔ لکھا ہے کہ بے تحاشا ایک تھپڑ مولوی فضل امام نے رسید کیا، پگڑی دور جا پڑی اور فرماتے جاتے تھے تو طلبہ کی قدر کیا جانے۔ بسم اللہ کے گنبد میں پلا ہے خبردار! میرے طالب العلموں کو اگر کبھی کچھ کہا۔

شیخ منصور لاہوری

بہر حال میں تو اساتذہ اور تلامذہ کے باہمی تعلقات کی مثالیں پیش کر رہا تھا۔ ملا عبدالقادر بداؤنی نے اپنی تاریخ میں ایک واقعہ نقل کیا ہے شیخ منصور لاہوری اکبری دربار کے امرا میں تھے۔ ایک زمانے تک مالوہ کے قاضی القضاۃ رہے، پھر پنجاب کے علاقہ بجواڑہ اور حدود دامن کوہ کے ضبط و ربط کی خدمت ان ہی کے سپرد ہوئی۔ یوں ہی وہ مختلف عہدوں اور مناصب پر سرفراز ہوتے رہے۔ بڑی جاگیر کے مالک تھے۔ علاوہ امیر کبیر ہونے کے علم میں بھی ان کا پایہ غیر معمولی تھا۔ ملا عبدالقادر نے لکھا ہے :۔

درہمہ علوم عقلی کہ در ہندوستان متعارف	ان تمام علوم عقلیہ میں آپ کو کمال حاصل
است مستحضر و خوش طبع و سلیم والفہم و متصرف بود	تھا جو ہندوستان میں متعارف ہیں اور وہ

با امراء و ملوک صحبت بسیار داشت

اور بادشاہوں کے ساتھ عموماً اٹھنا بیٹھنا تھا

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری خدمات کی مشغولیت کی وجہ سے درس و تدریس میں زیادہ حصہ نہ لے سکے، مگر ان کے صاحبزادے ملا علاء الدین کا رنگ دوسرا تھا۔ ملا عبدالقادر ہی نے لکھا ہے کہ اکبر نے

"ہر چند کہ تکلیف سپاہی گری نمود نہ قبول

فوجی خدمت کے لیے بہت کچھ کیا مگر قبول

نہ کردہ بدرس و افادہ مشغول شد

نہیں کیا اور درس و تدریس میں بازمشغول ہے

چاہتے تو کوئی ہزاری منصب فوج رکھنے کے صلے میں ان کو بھی مل جاتا، لیکن جو موروثی جاگیر والد سے ملی تھی اسی پر قناعت کر کے ساری عمر پڑھنے پڑھانے ہی میں گذار دی۔ طلبہ کے ساتھ ان کا جو سلوک تھا، اور اسی کو مجھے پیش کرنا ہے۔ ملا عبدالقادر نے لکھا ہے:۔

وہر چہ از جاگیر حاصل می شد ہمہ صرف طلبہ بود (ص۱۵۶)

جو کچھ جاگیر سے حاصل ہوتا سب طلبہ پر خرچ کر ڈالتے۔

اگرچہ یہ اس زمانہ کا عام دستور تھا کہ ارباب ثروت و دولت اساتذہ، طلبہ کے کفیل ہوتے تھے ان میں جو بھی درس تدریس کا کام کرتا تھا اپنی اپنی حیثیت کے مطابق علاوہ پڑھانے کے طلبہ کی خدمت طعاماً و نقداً اپنی اپنی استطاعت کی حد تک کیا کرتا تھا لیکن ملا علاء الدین کا دسترخوان ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں غیر معمولی وسیع تھا۔ ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ:۔

از جملہ ملایان در ہند بعد از پیر محمد خان[1] چوں

ہندوستان کے مولویوں میں پیر محمد خاں کے بعد

---

[1] افسوس ہے کہ پیر محمد اور ملا نور محمد ترخان کے تفصیلی حالات نہ مل سکے ملا عبدالقادر کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر یعنی ملا پیر محمد شیروانی الاصل تھے ابتدا میں بیرم خاں کے متوسلوں میں تھے۔ بعد کو ناصر الملک کا خطاب شاہی دربار سے ملا۔ نربدا میں ڈوب کر مر گئے۔ دینی حالت انکی کچھ اچھی نہ تھی۔ ملا نور محمد کے متعلق بھی اتنا لکھا ہے کہ "جامع اقسام علوم حکمت و کلام بود" ہمایوں کے مقبرہ کے آخر میں متولی تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ۱۲۔

او (ملا علاء الدین) وملا نور محمد خان ہیچ کس — ان کی اور ملا نور محمد کی طرح کوئی اور شخص

دل گیر بہذل و کرم و نثار و ایثار ضرب المثل — داد و دہش اور سخاوت میں ضرب المثل (زبان

زد نشدہ — زدِ خاص و عام) نہ ہوئے۔

مولانا بحر العلوم کی کمک کے لیے شرط

بانی مدرسہ نظامیہ ملا نظام الدین فرنگی محل رحمۃ اللہ علیہ کے خلف رشید مولانا عبد العلی المخاطب بہ بحر العلوم کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"منشی صدر الدین بہاری ویرا برائے — منشی صدر الدین بہاری نے اپنے مدرسہ میں

تدریس مدرسہ خود کہ در بہار[له] بنا کردہ بود — درس دینے کے لیے ان کو کافی رقم بھیج کر

خرچ معتد بہ فرستادہ طلبید" — طلب کیا۔

جس وقت مولانا کو طلب کیا گیا ہے اس وقت سخت پریشانی میں مبتلا تھے۔ منشی صدر الدین نے چار سو ماہوار تنخواہ آپ کی اور آپ کے ایک فرنگی محلی عزیز مولوی آذہار الحق کی سو مقرر کی تھی لیکن مولانا نے لکھ بھیجا کہ میرے ساتھ طلبہ بھی ہوں گے جن کی تعداد سو سے کم نہ ہوگی۔ اگر ان کے قیام و طعام کا نظم کر سکتے ہو تو میں آسکتا ہوں۔ "اغصان اربعہ" جو فرنگی محل کے علماء کی تاریخ ہے، اس میں لکھا ہے کہ منشی صدر الدین نے جب تک باضابطہ معاہدہ کی شکل میں ان طلبہ کے مصارف کی ذمہ داری اپنے سر نہ لی مولانا اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں، حالانکہ ان دنوں سخت معاشی دشواریوں میں مبتلا تھے۔

مولانا سجاد صاحب کا تعلق شاگردوں سے

اساتذہ اور تلامذہ کے درمیان تعلقات کی یہ نوعیت روایات موروثی کی شکل میں منتقل ہوتی ہوئی اس وقت تک آئی تھی، آخری آدمی جس کا حال اس باب میں مجھے معلوم ہوا وہ حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد

له یہ عبارت میں نے تذکرۂ علماء ہند سے نقل کی ہے لیکن مولانا ابو الحسنات ندوی مرحوم نے اپنی کتاب ہندوستان کے اسلامی مدارس میں بجائے بہار کے بردوان لکھا ہے۔ واللہ اعلم کیا واقعہ ہے۔ میں نے خود واقعہ کی تحقیق نہیں کی ہے ممکن ہے کہ بردوان کو بہار کے قرب کی وجہ سے بہار میں داخل کر لیا گیا ہو، ورنہ اب اس وقت تو وہ صوبہ بنگال کے مغربی حصہ کا ایک ضلع ہے۔

نائب امیر شریعت بہار مرحوم تھے۔ ایک زمانے تک ان کا قیام الٰہ آباد کے مدرسہ سبحانیہ میں رہا۔ بعض واقعات پیش آئے کہ الٰہ آباد سے منتقل ہو کر آپ اپنے وطن صوبۂ بہار چلے آئے اور گیا کو مستقر قرار دیا۔ طلبہ کا بھی ایک بڑا مجمع آپ کے ساتھ مدرسہ سبحانیہ چھوڑ کر گیا پہنچ گیا۔ بے سروسامانی کے حال میں آئے تھے۔ کوئی انتظام معقول شروع میں نہ ہو سکا مولانا عبدالصمد رحمانی جو ان ہی طالب العلموں میں تھے ان کی سوانح عمری میں اپنی عینی شہادت یہ نقل کرتے ہیں۔

یہاں (گیا) پہنچکر سب سے اہم مسئلہ طعام کا تھا جس کا حل یہ کیا گیا کہ جس کے پاس جو کچھ تھا وہ سب ایک جگہ جمع کر دیا گیا اور اسی سے قوت لایموت کا یہ انتظام کیا گیا کہ اکثر کھچڑی اور کبھی صرف خشکہ پکا لیا جاتا تھا۔ اس کو سرخ مرچ کے بھرتے کے ساتھ جو آگ پر بھون لی جاتی تھی اور اس میں نمک ملا لیا جاتا تھا۔ مولانا ایک دسترخوان پر بلا تکلف طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر وہی کھانا کھا لیتے تھے اور مولانا کی پیشانی پر کبھی شکن بھی نہیں پڑتی تھی۔ (حیات سجاد)

حالانکہ ذاتی طور پر مولانا کی ایسی گئی گذری حالت نہ تھی۔ جائداد و زمین کے مالک تھے۔ اپنی ذات کی حد تک چاہتے تو خواہ مخواہ اس قسم کے کھانے پر اپنے آپ کو مجبور نہ پاتے لیکن اتنی حیثیت بھی نہ تھی کہ روزانہ طلبہ کے اتنے بڑے مجمع کو اپنی جیب سے کھلا سکتے ہوں۔ محض طلبہ کی خاطر سے جب تک یہ حال رہا سب کے ساتھ مولانا کی بھی یہی غذا رہی[1]

[1] طلبہ اور اساتذہ میں کس قسم کے انبساطی تعلقات تھے اس کی ایک مثال وہ بات بھی ہو سکتی ہے جو ملا عبدالنبی احمد نگری نے خود اپنے متعلق لکھا ہے کہ میرا دستور تھا "درایام تعطیل با طلبائے یک دل و یک رو بجہت شکار ماہی دراں باغ اتفاق سیر و تفرج می شد ملخصاً آں باغ سے اشارہ احمد نظام شاہ بحری کے ایک باغ کی طرف ہے جس کا نام فیض بخش تھا۔ باغ کے بیچ میں ایک ساگر بنایا گیا تھا اور اسی ساگر کے بیچوں بیچ میں عمارت پختہ دو منزلہ بادشاہ نے بنوائی تھی۔ چاروں طرف پانی اور بیچ میں اس (باقی ص۲۳ پر

مولانا سید محمود اصغر کی طالب علمی

اب ایک طرف اساتذہ کے ان عجیب و غریب تعلقات کو پیش نظر رکھیے جو اپنے تلامذہ اور شاگردوں کے ساتھ رکھتے تھے اور دوسری طرف اس بے پناہ جذبۂ شوق و جستجو کو سامنے رکھیے جو نسلاً بعد نسلٍ بطور موروثی روایات کے اسلامی خاندانوں میں طلب علم کے متعلق منتقل ہوتا چلا آتا تھا کہ آج ان قصوں کو افسانے سے شاید زیادہ وقعت نہ دی جائے لیکن کیا کیجیے کہ واقعات یہی تھے۔ مولانا غلام علی آزاد نے بعض واقعات اس سلسلے میں نقل کیے ہیں مثلاً مولانا سید محمود اصغر کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

بہ ارادۂ تحصیل علم قنوج رفت و نزد علماء آنجا کتب درسی گذرانید و کمال استعداد بہم رساند۔	طلب علم کی خاطر قنوج پہنچے۔ یہاں علماء سے درسی کتابیں پڑھیں اور بہت اچھی استعداد حاصل کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ۲۲) شاہی قصر کا ہونا جو دلکشی پیدا کر سکتا ہے ظاہر ہے۔ لاتعداد قیمتی اسکالرشپ میں طلبہ کے ساتھ شکار بھی کے لیے کرتے تھے۔ اسی قسم کی ایک نظیر استاذ السلطان نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کی سوانح عمری میں درج ہے۔ لکھا ہے کہ مولانا کو مدرسۂ نظامیہ (جو ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا خدا کے فضل سے اب تک موجود ہے) اسی مدرسہ نظامیہ کے طلبہ سے بہت محبت تھی۔ چنانچہ سال میں دو تین مرتبہ تمام طلبہ کو کسی باغ یا تفریح گاہ میں لے جاتے۔ دو تین روز قیام فرماتے وہاں ان سے تقریریں، مناظرے، بیت بازی کے مقابلے کراتے۔ طلبہ جب اس سے تھک جاتے تو تھوڑی دیر ان کو کھیلنے کی اجازت دیتے۔ ص۵۹

یہاں اس امر کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ طلبہ کے ساتھ مولانا مرحوم کے انبساطی تعلقات کی یہ داستان اس زمانہ کی ہے جب مولانا مرحوم نواب فضیلت جنگ کے خطاب شاہی کے ساتھ حکومت آصفیہ کے وزیر مذہب یعنی صدر المہام امور مذہبی تھے۔ بلکہ اپنے ذاتی اثر و اقتدار کے لحاظ سے تو کہا جا سکتا ہے کہ وزیر اعظم وقت سے بھی ان کا درجہ بلند و ارفع تھا۔ لیکن عز و جاہ کے ان مدارج عالیہ پر پہنچ جانے کے بعد بھی علم کی جو عظمت قلب مبارک میں تھی اس نے طلبۂ علم سے زندگی بھر ان کو باندھے رکھا تھا کہ ان ہی طالب العلموں کے درمیان مدرسۂ نظامیہ ہی کے صحن میں مدفون ہیں۔ طاب ثراہ ۱۲

مگر کس طریقے سے، مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ "مسافت ما بین بلگرام و قنوج پنج کروہ است" کروہ ڈیڑھ میل کے قریب ہوتا ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ بلگرام اور قنوج میں بہ مشکل دس میل کا فاصلہ ہوگا۔ لیکن کوئی باور کر سکتا ہے کہ اس قرب مسافت کے باوجود مولانا محمود اصغر تے قنوج میں طالب العلمی کے یہ دن کس طریقے سے گذارے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں:-

در ایام تحصیل با وجود قرب مسافت میل به وطن نہ کرد۔

طالب العلمی کے زمانہ میں قرب مسافت کے باوجود کبھی گھر کا رخ نہیں کیا۔

خدا ہی جانتا ہے کہ تحصیل کی یہ مدت کتنے زمانے میں پوری ہوئی۔ سال دو سال تو قلیل نہ ہوگی مگر دھن کے پکوں کے عزم کی پختگی ملاحظہ فرمایئے کہ جب

تصحیح نسخۂ ظاہر و باطن بکمال رساند آں گاہ بہ جانب وطن عطف عناں نمودند۔

جب علوم ظاہری و باطنی دونوں سے پورے طور پر آسودہ ہوگئے تو وطن واپس ہوئے

مولانا آزاد بلگرامی کا علم سے عشق

اور دو دلبر دل کو جلانے دیجیے۔ خود مولانا آزاد کے عشق علم کی وہ داستان کیا کچھ کم عجیب ہے کہ میں نے مختلف موقعوں پر ظاہر کیا ہے کہ مولانا ایک امیر گھرانے کے آدمی تھے، ان کے نانا میر عبد الجلیل بلگرامی عالمگیری امرار میں تھے مختلف جلیل مناصب کا تعلق ان سے فرخ سیر کے زمانے تک رہا۔ مولانا آزاد نے علاوہ مولوی طفیل محمد صاحب کے خود اپنے نانا مرحوم سے بھی پڑھا تھا۔ خود فرماتے ہیں:-

لغت و حدیث و سیر نبوی در خدمت قدسی منزلت جدنا و استاذنا علامہ مرحوم مرقوم لبسند رسانیدم۔

علوم لغت و حدیث اور سیرت نبوی حاد امرحوم کی خدمت میں حاصل کیے۔

اور بھی مختلف لوگوں سے مختلف علوم و فنون کے سیکھنے سکھانے کے مواقع حالانکہ ہندوستان ہی میں میسر آچکے تھے۔ عمر بھی چھتیس سال کی ہو چکی تھی۔ بہ ظاہر جیسا کہ اس زمانے کا دستور تھا، غیر متاہل رہنا مشکل تھا، مگر ایک "جنون" تھا جس کی آگ اندر اندر سلگتی رہتی تھی۔ آخر ایک دن

جیسا کہ خود ہی لکھتے ہیں :۔

پیادہ پا تنہا از بلگرام رخت سفر بستم	بلگرام سے تن تنہا پیدل روانہ ہوا

کیسی تنہائی ؟

احبار و اقربا را طورے غافل ساختم کہ اگر	دوستوں اور گھر والوں کو کانوں کان خبر
ایں ہا سراغ می یافتند سد راہِ مقصود می	نہ ہونے دی۔ کیونکہ اگر یہ سب سراغ پالیتے
شدند،	تو پھر راہ مقصود میں روڑا بن جاتے اور روک دیتے۔

یہ تنہا کس لیے نکلے تھے۔ حدیث کا شوق تھا' حجاز جانا چاہتے تھے۔ اندیشہ تھا کہ لوگوں پر اس قصد کو اگر ظاہر کروں گا تو مانع ہوں گے چپ چاپ یکہ و تنہا وہی شخص آج تک جو ایک میل بھی کبھی پیدل نہ چلا تھا' گھر سے نکل پڑا۔ گھر میں لوگوں کو خیال گزرا کہ شاید قریب کے کسی گاؤں میں کسی سے ملنے جلنے چلے گئے ہیں۔ لیکن جب تین دن گذر گئے اور کسی طرف سے کوئی خبر نہ ملی تب لوگ چونکے :

اہل بیت ایں فقیر بعد سہ روز آگاہ شدند	فقیر کے گھر والوں کو تین دن بعد خبر ہوئی اور
و انگشت تحیر بدنداں گزیدند"	سب حیرت زدہ رہ گئے

مگر تین دن کے نکلے ہوئے مسافر کو پکڑنا آسان نہ تھا خصوصًا۔

راہے کہ غیر متعارف بود پیش گرفتم	اجنبی راستہ میں نے اختیار کیا تھا۔

عساکر آصفیہ میں

بلگرام اودھ کا قصبہ ہے' اور جو ایک میل بھی کبھی پیادہ پا نہ چلا تھا، جاننے ہو وہ وارد ی کرتا ہوا کہاں دم لیتا ہے۔ مالوہ میں ایک مشہور قصبہ سرونج[1] بھوپال کے پاس ہے، یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ راہ میں کیا گذری اور تو کچھ نہیں لکھا ہے' البتہ قلم سے اتنا نکل گیا ہے۔

قدم کہ جز بہ پیادہ گردی آشنا نہ بود	پاؤں پیدل چلنے کے عادی نہ تھے آبلوں نے
آبلہا بارا خوشۂ تاک ساخت	پاؤں کو انگور کا خوشہ بنا دیا تھا۔

پاؤں کیا تھا آبلوں سے انگور کا خوشہ بن گیا تھا اور انہی دانوں میں وہ کیف و مستی بھری ہوئی

---

[1] سرونج بھوپال سے ۵۰ میل شمال میں اور گوالیار سے ۱۵۰ میل دو جنوب میں واقع ہے اس لیے قربت بھوپال سے ہے

ہوئی تھی جو مولانا کو آگے بڑھائے لیے چلی جاتی تھی۔ سرونج میں خبر ملی کہ بانیٔ سلطنت آصفیہ حضرت آصف جاہ کی بارگاہ فلک پناہ دکن جارہی ہے۔ قریب ہی میں کہیں فروکش ہے۔ مولانا آزاد کسی طرح گرتے پڑتے عساکر آصفیہ تک پہنچ کر فوجیوں میں گھل مل گئے۔ پیشانی سے شرافت و نجابت، علم و تقویٰ کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں، آصف جاہی فوج کا ایک امیر آپ پر مہربان ہوگیا، اور مولانا کو اس نے اپنا مہمان بنا لیا۔ ایک مستقل خیمہ اور سفر کے لیے ایک رتھ کا نظم مولانا کے لیے اس امیر نے کر دیا۔ اب عساکر آصفی کے ساتھ منزل بمنزل کوچ کرتے ہوئے بھوپال پہنچے۔ بھوپال میں آصف جاہی فوجوں کی مڈبھیڑ مرہٹوں سے ہوگئی۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ لکھتے ہیں:۔

تمام رمضان در سواد بھوپال آتش	پورا رمضان بھوپال کے مضافات میں
حرب اشتعال داشت و زلزلۂ ساعت	لڑائی کی آگ بھڑکتی رہی اور قیامت
قائم بود "	کا زلزلہ قائم رہا۔

مولانا بلگرامی میدان کارزار میں

کیا زمانہ تھا، امیر خاندان کے صاحبزادے ہیں۔ ساری عمر لکھنے پڑھنے میں گذاری ہے۔ لیکن اچانک میدان جنگ میں گھر جاتے ہیں پھر کیا وہ صرف تماش بینوں میں تھے؟ ایک نظم میں اپنے اس حال کو بیان کیا ہے:۔

فوجِ اسلام و کفر صف آراست ۔۔۔ طرفہ شورے قیامتے برپاست
کرۂ آتشین توپ و تفنگ ۔۔۔ کرۂ نار ساخت عرصۂ جنگ

اور جس کے ہاتھ میں اب تک قلم تھا وہی،

من ہم آں روز در صف اسلام ۔۔۔ با یکے ذوالفقارِ خون آشام
قدمِ پُر دلانہ افشردم ۔۔۔ حملہ ہا بر مخالفاں بردم

مرہٹوں کو ہزیمت ہوئی۔ آصف جاہی فوج آگے بڑھی، غالباً اسی امیر نے جس کے آپ مہمان تھے آپ کو ایک دن آصف جاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

با وصف موزونیٔ طبع مدت العمر زبان	شاعر ہونے کے باوجود زندگی بھر رئیسوں

بمدح امراء و اغنیا نکشودیم — اور مالداروں کی تعریف میں زبان نہیں کھولی

لیکن آج ضرورت پیش آگئی تھی جس مقصد کو سامنے رکھ کر گھر سے نکلے تھے دیکھا کہ اس میں کامیابی کی یہی صورت ہے۔ یہ رباعی فارسی میں لکھ کر آصف جاہ کی خدمت میں پیش کی ؎

اے حامیٔ دیں، محیط جود احساں — حق داد ترا خطاب آصف شایاں

او تحفت بدرگاہ سلیماں آورد — تو آل نبی را بہ در کعبہ رساں

مولانا بلگرامی مدینۃ النبی میں

حضرت آصف جاہ خود موزوں طبیعت رکھتے تھے۔ رباعی پسند آئی اور فرمان ہوگیا کہ حجاز کی طرف روانگی کا سامان مولانا کے لیے کر دیا جائے یوں خدا نے ان کو سورت پہنچایا۔ سورت میں جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ اور مکہ کے بعد مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ حج و زیارت کے سوا ان پاک شہروں کے علماء سے استفادہ کا جو شوق تھا وہ پورا ہوا، مدینہ میں مولانا کا جو مشغلہ تھا ان الفاظ میں اس کا اظہار فرماتے ہیں :-

شبہا مابین بیت و منبر والا (روضۃ الجنۃ) نشستم و مطالعہ صحیح بخاری می پرداختم

رات میں آنحضرتؐ کے منبر اور گھر کے درمیان (جس کو روضۃ الجنۃ کہا گیا ہے) بیٹھ کر صحیح بخاری کے مطالعہ میں منہمک رہتا۔

بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا، خود ہی ان الفاظ میں اس کو بیان کیا ہے :-

من فدائے جلوۂ احمدی و صید لبتہ فتراک محمدی در صغر سن خوابے دیدم کہ در مسجد مکہ معظمہ زادہا اللہ تعظیماً حاضرم و جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم در محرابے از مسجد قائم اند۔ فقیر شرف ملازمت اقدس دریافتم حضرت صلی اللہ علیہ وسلم التفات فرمانان نمودند لب بہ تبسم شیریں کردہ حرفہا پرسیدہ

نور محمدی پر جان نچھاور کرنے والے خاکسار نے بچپن میں خواب دیکھا تھا کہ خاکسار مسجد حرام مکہ مکرمہ میں حاضر ہے اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک محراب میں کھڑے ہیں۔ خاکسار خدمت اقدس میں حاضر ہوا، آپ نے توجہ خاص فرمائی اور مسکرا کر پوچھا

آج کسی کے سامنے بیٹھ کر صحیح بخاری کے ذریعے سے وہی "لب تبسم شیریں کردہ حرفہا پر سید ند" کی تعبیر پوری کر رہے تھے۔ مولانا حیات سندھی جو اس زمانے میں مدینۂ منورہ کے سرخیل حلقہ محدثین تھے، ان سے

صحیح بخاری را... سند کردم و اجازت صحاح	صحیح بخاری کی سند لی اور صحاح ستہ اور
ستہ و سائر مرویات مولانا بر گرفتم"	دباقی مرویات کی مولانا سے اجازت حاصل کی

زیادہ وقت مدینہ میں گزار کر جب حج کا موسم قریب آگیا تو مکہ معظمہ پہنچے۔ مناسک حج سے فارغ ہوئے اور شیخ الحرم علامہ عبدالوہاب طنطاوی سے جیسا کہ فرماتے ہیں۔

فوائد فن حدیث در گرفتم	فن حدیث کے فوائد حاصل کیے

ایک سندھی عالم کا حال

اور یہ کوئی ایک مثال ہے علم کے دیوانوں کو فتنہ و فساد کے ان ہی دنوں میں اس ملک سے اس ملک میں اس علاقہ سے اس علاقہ کی طرف سرگرداں دیکھنا چاہتے ہوں تو ان بزرگوں کے حالات اٹھا کر پڑھیے۔ کتنوں کے تذکرے مختلف حیثیتوں سے خود اسی مضمون میں گذر چکے ہیں۔ کتاب منبع الانساب کے حوالہ سے صاحب نزہۃ الخواطر نے ایک سندھی عالم شیخ علی بن محمد جھونسوی کی سراسیمگیوں کا عجب حال نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ پیدا ہوئے بھکر (سندھ) میں، وہی ذوق علم بھکر سے ملتان لے گیا، ملتان میں شیخ شمس الدین الحسینی العریضی اور مولانا ابو الفتح رکن الدین کی صحبتوں میں ایک مدت گذاری، لیکن دل کو قرار نہ تھا۔ ملتان سے بھی اٹھے اور۔

سافر الی بہار و لازم الشیخ منھاج	بہار کا سفر اختیار کیا اور شیخ منہاج الدین
الدین الحسن البہاری اثنتی عشرۃ سنۃ	حسن بہاری کی خدمت میں بارہ سال مقیم رہے

شیخ منہاج حسن نے ان کو پہلے

ارسل الی شیخوپورہ فلبث ھھنا سنتین ثم ارسل	شیخپورہ[1] بھیجا جہاں وہ دو سال رہے شیخپورہ

---

[1] واللہ اعلم اس شیخپورہ سے کون سا شیخپورہ مراد ہے۔ صوبۂ بہار میں ایک بہار نامی قصبہ بھی ہے جو اسلامی عہد میں بہار کا عاصمہ (پایہ تخت) تھا، اور اب ایک معمولی سب ڈویژن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اھ (باقی اگلے صفحہ پر)

الی پرونگ (الہ آباد) نسکن بعد وفاۃ والدہ حیث یلتقی الجون والگنگ تقریباً من قریۃ ہربونگ پور فاسلم علی یدہ خلق کثیر (ص ۹۲)

سے پراگ (الہ آباد) بھیجے گئے۔ جمنا گنگا کے سنگم کے پاس جنگل میں ایک گاؤں ہربونگ پور کے پاس قیام کیا، بکثرت لوگ آپ کے ذریعہ مسلمان ہوئے

علم اور دین کے وارثوں کو دیکھ رہے ہیں' زمان و مکان دونوں کے فاصلے گویا ان کی نگاہوں میں صفر کا درجہ رکھتے تھے' جہاں جی چاہا چلے گئے' جب تک جی چاہا ٹھہرے رہے۔ آخر وقت تک روایات کا اثر خاندانوں میں باقی تھا۔

مولانا محمد احسن گیلانی کی طالب العلمی

خود فقیر کے جد امجد مولانا محمد احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ جن کے مدرسہ کا تذکرہ مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم کی کتاب سے گذر چکا ہے' حالانکہ یہ اس زمانہ کے آدمی ہیں جب برٹش راج کا تسلط ملک میں قائم ہو چکا ہے۔ مولانا کے والد میر شجاعت علی مرحوم انگریزی پولس میں سرکل انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ بزرگوں سے خاکسار نے سنا ہے کہ میر شجاعت علی کی بڑی آرزو تھی کہ ان کے بچوں میں کوئی ایک عالم ہوتا، مگر خدا کی شان جب تک زندہ رہے یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ مولانا محمد احسن کی شادی ہو چکی تھی' بلکہ ایک لڑکا بھی ہو چکا تھا جو فقیر کے بڑے چچا مرحوم تھے۔ اس عمر اور ان حالات میں تحصیل علم کا سودا سر پر سوار ہوا' بیوی بچے گھر بار سب کو ایک دفعہ سلام کر کے گیلانی سے روانہ ہوئے اور کامل چودہ سال کے بعد اس وقت واپس ہوئے جب بیٹا جوان ہو چکا تھا۔ چودہ سال کی یہ مدت روپوشی میں نہیں گذری' خط و کتابت اور آدمی تک وطن سے ان کے پاس آتا جاتا رہتا تھا لیکن اس عرصہ میں خود ایک دفعہ بھی گھر نہ گئے' مختلف علوم کے اہل کمال جس جس شہر میں تھے ان کی خدمتوں میں

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷) بہار سے دس کوس کے فاصلہ پر بسمت مشرق شیخپورہ نامی ایک اور قصبہ آباد ہے' جس کے اطراف میں زیدی سادات کے بارہ گاؤں وندھیاچل کے سلسلے کی ایک پہاڑی کے نیچے مسلسل ایک دوسرے سے ملے جلے آباد ہیں اور یہ شیخپورہ انہی گاؤں کا مرکزی قصبہ ہے۔ ایک بزرگ شیخ شعیبؒ کا وہاں مزار ہے' کہتے ہیں کہ یہ قصبہ انہی کے نام کی طرف منسوب ہے' شیخ شعیب آٹھویں صدی کے اکابر میں ہیں' مناقب الاصفیاء آپ کی مشہور کتاب ہے۔

میں پہنچے۔ علوم رسمیہ کی کتابیں زیادہ تر بنارس کے ایک عالم مولانا واجد علی صدر اعلیٰ سرکار انگریزی سے پڑھیں۔ ریاضی، ہیئت، حساب، مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی سے اور حدیث کی سند حضرت مولانا عالم علی نگینوی تلمیذ حضرت شاہ اسحٰق دہلوی رحمۃ اللہ علیہما سے حاصل کی۔ اسی زمانے میں درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ مختلف مسائل پر رسائل تصنیف کیے جن میں وجود رابطی اور مثناۃ بالتکریر والا رسالہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ شرح سلم بحر العلوم پر معرکۃ الآرا حاشیہ لکھا۔ اقلیدس کا مقالہ اولیٰ عربی جو عام مدارس کے نصاب میں شریک ہے، پہلی دفعہ تصحیح اشکال اور تحشیہ کے ساتھ آپ ہی نے لکھنؤ سے شائع کرایا۔ اسی نسخہ کی نقل آج تک مطابع میں چھپ رہا ہے۔ اور بھی بیسیوں کام اس عرصہ میں کرتے رہے۔ جب کامل اطمینان ہو گیا تب گھر لوٹے اور بجائے علم فروشی کے علم پاشی اور معارف بخشی میں ساری زندگی اُسی برگد کے درخت کے نیچے گذار دی جس کا ذکر گزر چکا ہے۔

میں نے اس قصہ کو اس لیے نقل نہیں کیا ہے کہ اس سے اپنے کسی خاندانی امتیاز کا اظہار مقصود ہے، کیونکہ اس زمانے کے لحاظ سے اس واقعہ میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ پرانے علمی گھرانوں میں بزرگوں کے متعلق آپ کو ہند کے طول و عرض میں اس قسم کی داستانوں کا ایک سلسلہ مل سکتا ہے۔ افسوس کہ اب اس کی یاد مٹتی جاتی ہے۔ کاش! جمع کرنے والے ان ولولہ انگیز نمونوں کو پچھلوں کے سامنے پیش کر دیتے۔ شاید اپنے اگلوں کے ان حالات سے ان پر اپنی حقیقت واضح ہو۔

قدیم نظام تعلیم میں ناغہ نہیں ہوتا

اور اس وقت تو غرض یہ تھی کہ قدیم نظام تعلیم کی وہ عجیب و غریب خصوصیت یعنی بالکلیہ درس کا یہ نظام حاضری اور حاضری کے رجسٹروں سے ہمیشہ بے نیاز رہا لیکن اس پر بھی یہ واقعہ تھا کہ ۵ ، فیصدی نہیں، تین چار فیصدی غیر حاضری یا ناغہ بھی ناممکن تھا[1]۔ خود خاکسار کو مولانا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کی درسگاہ

[1] فوائد الفواد میں سلطان جی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے اس ناغہ کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات نقل کی ہے حضرت اپنے استاد شمس الملک مستوفی الممالک جن کا ذکر مختلف حیثیتوں سے گزر چکا ہے ان کے درسی خصوصیات کا تذکرہ فرماتے ہوئے یہ بھی بیان کرتے تھے کہ جو اُن سے پڑھنا چاہتا اس سے منجملہ دیگر (باقی صفحہ ۳۱)

کا تجربہ ہے، سات آٹھ سال کے اس عرصہ میں بجز کسی شدید ارضی وسماوی آفت یا حادثہ کے میں نہیں جانتا کہ کسی درس میں ایک دن کے لیے کبھی کوئی غیر حاضر رہا ہو۔ بعض بعض اسباق ٹھیک مئی اور جون کے مہینوں میں بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوتے تھے۔ گرمی اور تپش راجپوتانہ کی تھی، بعض[1] طلبہ کی قیام گاہیں کافی فاصلہ پر تھیں، لیکن وقت پر میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی نہ آیا ہو۔

شیخ عبدالحق دہلوی کی حاضری اسباق میں | شیخ محدث نے خود اپنا حال لکھا ہے کہ:

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) معاہدوں کے ایک معاہدہ اس کا بھی لیتے تھے کہ "ناغہ" نہ کریں گے۔ حضرت سلطان جی فرماتے ہیں کہ اتفاقاً کسی وجہ سے کسی دن کوئی طالب العلم درس میں حاضر نہ ہو سکا، تو شمس الملک کا قاعدہ تھا کہ اس سے کہتے "چہ کردہ ایم کہ نمی آئی" یعنی میں نے آپ کا کیا گناہ کیا تھا جو تشریف نہ لائے، خود اپنے متعلق بھی فرماتے کہ "اگر مرا ناغہ شدے یا بعد از دیر رفتے در خاطر گذشتے مارا ہم چیزے خواہد گفت"۔ بس یہی خیال کہ استاد پوچھیں گے ناغہ سے طالب العلموں کو روکتا تھا، آج بھی بدیر آنے والے طلبہ سے عصری جماعات میں باز پرس کی جاتی ہے۔ لیکن کس انداز میں "پندرہ منٹ ہو چکے کلاس سے باہر ہو جاؤ" ایک طرف باز پرس کا یہ حال ہے اور دوسری طرف سنیے، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ان کے استاذ باز پرس بھی کرتے تو کن الفاظ میں، فرماتے ہیں "ایں گفتے" یعنی یہ شعر پڑھتے ؎ آخر کم از آنکہ گاہ گاہے ؛ آئی و بما کنی نگاہے (فوائد الفواد ص ۹۸)

شاگرد کی گردن شرم سے جھک جاتی۔ محبت کے اسی برتاؤ کا یہ اثر تھا کہ جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ سلطان جی اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد "چشم پُر آب کرد" کہاں اساتذہ و تلامذہ کے یہ تعلقات مودت و لطفِ ادا کہاں مدرسہ کو پولیس کا محکمہ بنا دینا، اساتذہ گویا تھانیداروں کا گروہ ہے اور تلامذہ مجرموں کی جماعت۔ وشتان بینہما!

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ان ہی بعض میں کچھ دنوں سے ایک دیوانہ بھی شریک تھا۔ اللہ اللہ راجپوتانہ کی وہ لو اور بارہ کے بعد قیام گاہ کی واپسی، خس خانہ و برفاب کی تلامذہ تاریک حجرے میں ایک موٹے لحاف کے اندر گھس کر کی جاتی تھی، پسینہ سے گو سارا جسم شرابور ہو جاتا تھا۔ لیکن لو کی شدت سے بچنے کے لیے تاریک حجرہ اور لحاف اس وقت ایک بہترین پناہ گاہ تھے۔ ۱۲

باوجود غلبہ بردوت ہوائے زمستاں وشدت	جاڑے کی ہلا ڈالنے والی ٹھنڈی ہوا اور
حرارت تابستاں دو بار بمدرسہ دہلی کہ شاید	گرمی کی جھلسا دینے والی شدتِ گرمی کے
از منزل ما دو میل داشتہ میل می کردم"	باوجود دن میں دو مرتبہ دہلی مدرسہ میں حاضر
	ہوتا، حالانکہ میری قیام گاہ سے دو میل کا فاصلہ تھا۔

مدرسہ دو میل ہے، گرمی ہو یا سردی دن میں دو دفعہ آ رہے ہیں، جا رہے ہیں، صرف اسی قدر نہیں بلکہ :-

مدتے بیش تر از صبح بمدرسہ می رسیدیم	ایک عرصہ تک ایسا ہوا کہ صبح سے پہلے مدرسہ
و در سایۂ چراغ جزو می کشیدیم	پہنچ جاتا اور چراغ کی روشنی میں ایک جزو
(اخبار الاخیار ص۳۱۳)	لکھ ڈالتا

رات رہتے اندھیرے منہ گھر سے نکل جاتے اور مدرسہ پہنچکر چراغ کی روشنی میں ایک ایک جز لکھ ڈالتے، گویا رات کافی باقی رہتی ہو گی۔ دو میل چلنا اور پھر ایک جزء کا چراغ ہی کی روشنی میں نقل کرنا معمولی قلیل وقت میں ممکن نہیں۔

ادھر طلبہ میں علم کی طلب کا یہ بے پناہ شوق اور دوسری طرف اساتذہ کا ان کے ساتھ تعلق کچھ اس نوعیت کا ہو جاتا تھا کہ ان کی معمولی ناراضگی کے خیال کو بھی طلبہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جانتے تھے کہ اساتذہ کے لیے سب سے زیادہ گراں بات طالب العلم کا وقت پر نہ آنا تھا جس سے اس کا استغناء ثابت ہوتا تھا، اور کوئی استاد اپنے شاگرد کے متعلق اس رویہ کو برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ اس سے پڑھنا بھی چاہتا ہے اور طریقۂ عمل سے یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اپنے استاد کا وہ اس علم میں چنداں محتاج نہیں ہے۔

بہرحال اب اسباب کچھ ہی ہوں، موروثی روایات کا اثر ہو، یا کوئی بات ہو، واقعہ یہی تھا کہ حاضری کے رجسٹروں کے فقدان کے باوجود طالب العلم کا سبق سے غیر حاضر ہونا اس زمانہ میں اس وقت تک ناممکن تھا جب تک کہ قدرت ہی نے غیر حاضری پر اسے مجبور نہ کر دیا ہو۔ بلکہ بسا اوقات

ان بزرگوں کے شوق بے پروانے قدرتی موانع کی بھی پروا نہ کی۔

قاری عبدالرحمٰن کی پابندی کا عالم

محدث پانی پتی قاری عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری میں یہ واقعہ درج ہے کہ جن دنوں قاری صاحب شاہ اسحٰق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھتے تھے، ایک دن موسلا دھار بارش کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور قاری صاحب قیام گاہ کی دوری کی وجہ سے وقت پر نہ پہنچ سکے جو طلبہ حاضر تھے انہوں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ اس بارش میں قاری صاحب کا اتنے طویل۔ طویل فاصلہ سے آنا ناممکن ہے۔ اس لیے سبق شروع کرا دیا جائے۔ شاہ صاحب نے فرمایا" ابھی ٹھہرو، وہ ضرور آئیں گے۔" یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ اس برستے ہوئے پانی میں دیکھا جاتا ہے کہ پائنچے چڑھائے اور کتاب ایک گھڑے میں بحفاظت بند کیے قاری صاحب آ رہے ہیں۔ شاہ صاحب نے طلبہ کو مخاطب کر کے فرمایا لو دیکھو میں نے کیا کہا تھا، وہ قاری صاحب آ گئے، آؤ اب سبق پڑھو۔" (تذکرہ رحمانیہ ص ۴۱)

بہرحال تعلیم میں اس کی وجہ سے جو تسلسل باقی رہتا تھا، نیز بجز جمعہ[1] اور غالباً رمضان کے ایک مہینہ کے سوا درس چونکہ سال بھر تک مسلسل جاری رہتا تھا اور اساتذہ کی کثرت کی وجہ سے جماعت کی پابندیوں سے لوگ آزاد تھے، دوسروں کی وجہ سے آہستہ چلنے پر چوں کہ کوئی مجبور نہ تھا، کچھ تو قدیم طریقہ تعلیم کی ان خصوصیات اور سب سے بڑی وجہ یعنی وہی بات کہ تعلیم کا مقصد معلومات کی گردآوری نہیں بلکہ ان معلوم (جو آدمی نہیں جانتا) اس کے علم (جانتے) اس کو:

[1] بعض بعض علمی خانوادوں میں علاوہ جمعہ کے منگل کے دن بھی درس نہ ہوتا تھا، ہمارے خیرآبادی خاندان میں بھی یہی بستور تھا، منگل کا دن صرف امالتذکے۔ تصنیف و تالیف کا تھا اور طلبہ کے لیے کتابوں کی نقل کا۔ محدث پانی پتی قاری عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بھی ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ منگل کے روز طلبہ کو سبق نہیں پڑھایا کرتے تھے، قاری صاحب چوں کہ لفظاً و معناً ولی اللہی خاندان کے اتباع میں مشہور تھے اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ یہ طریقہ انھوں نے شاہ صاحب کے خاندان ہی سے حاصل کیا تھا۔ ۱۲

کی صلاحیتوں کو ابھارنا، سارا زور اسی پر خرچ کیا جاتا تھا۔

کم عمری میں فراغت

ان ساری باتوں کا نتیجہ وہی تھا کہ عموماً لوگ بہت تھوڑی عمر میں سند فراغ حاصل کر لیتے تھے، اتنی تھوڑی عمر کہ آج اگر اس کا تذکرہ کیا جائے تو شاید افسانے سے زیادہ اسے وقعت نہ دی جائے۔

ایسی ایسی ہستیاں جن کی عظمت و جلالت کے آوازے سے آج تک علم کا ایوان گونج رہا ہے علم کے مختلف کنگروں پر اُن کے جھنڈے لہرا رہے ہیں، ان بزرگوں کی سوانح عمریاں اٹھا کر پڑھیے، حیرت ہوتی ہے کہ آج جس عمر میں لوگ میٹرک بھی پاس نہیں کر سکتے اسی عمر میں یہ حضرات فارغ التحصیل عالم قرار پا چکے تھے، فیضی جیسا ہمہ داں

امروز نہ شاعر و حکیم — دانندۂ حادث و قدیم

کا نعرہ لگانے والا

ایں کالبدم زخاک ہندست ولیک — در ہر بن مو ہزار یونان دارم،

لیکن "ہزار یونان جس کے ہر بن مو" میں پوشیدہ تھا، سنتے ہیں:-

فنون را نزد پدر در چہاردہ سالگی باتجام رسانید (ماثر اکرام ص ۱۹۸) — تمام فنون چودہ سال کی عمر میں والد بزرگوار سے پڑھ کر ختم کیا۔

مولانا فضل حق خیر آبادی کی فراغت

مولانا فضل حق خیر آبادی صاحب "ہدیہ سعیدیہ" شاگرد اپنے والد ماجد مولانا فضل امام کے شاگرد ہیں، حدیث شاہ عبد القادر دہلوی سے پڑھی اور تیرہ سال کی عمر میں فراغت حاصل کر لی۔

پدر خود مولوی انیس امام ست حدیث از مولانا عبد القادر دہلوی اخذ کردہ ...... و فراغ علمی بعمر سیزدہ سالگی حاصل نمودہ (تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۶۴)

یہ وہی مولانا فضل حق خیر آبادی ہیں جو افق المبین کا سبق شطرنج کھیلتے ہوئے پڑھایا کرتے تھے، علوم ریعبہ خصوصاً معقولات اور حدیث یہ سارا قصہ کل تیرہ سال کی عمر میں ختم ہو گیا۔

فراغت مولانا عبدالحئی فرنگی محلی

مولانا عبدالحئی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ اپنی خود نوشت سوانح میں لکھتے ہیں:۔

لما وصلت الی الخمس سنین اشتغلت بحفظ القرآن المجید وحصلت فی اثنائہ بعض الکتب الفارسیہ وتعلمت الخط وفرغت من الحفظ حین کان عمری عشر سنین ومن بدء السنۃ الحادیۃ عشر شرعت فی تحصیل العلوم ففرغت من الکتب الدرسیۃ فی الفنون الرسمیۃ الصرف والنحو والمعانی والبیان والمنطق والحکمۃ والطب والفقہ واصول الفقہ وتحصیل الکلام والحدیث والتفسیر وغیر ذلک حین کان عمری سبع عشرۃ سنۃ (ص - ۲ (۱))

جب عمر کے پانچویں سال میں میں پہنچا، تب حفظ قرآن میں مشغول ہوا، حفظ کے زمانہ میں بعض فارسی کتابیں پڑھتا رہا اور خط نویسی بھی، جب دس سال کی عمر ہوئی تو حفظ قرآن سے فارغ ہوگیا اور گیارہویں سال سے تحصیل علوم میں مشغول ہوا، رسمی فنون کی درسی کتابوں یعنی نحو، صرف، معانی، بیان، منطق، حکمت، فلسفہ، طب، فقہ و اصول فقہ، علم کلام، حدیث، تفسیر وغیرہ علوم سے سترہویں سال کی عمر میں فارغ ہوگیا۔

سترہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کی مدت بھی داخل ہے، بلکہ اسی میں بقول مولانا:۔

مع ذلک وقعت فی اثناء التحصیل وقفات واقعۃ فی اوان التکمیل۔

اس میں بعض وقفے بھی تحصیل علوم میں پیش آئے اور تکمیل کے اس زمانہ میں بعض کاوشیں بھی ہوئیں۔

میں نے قصداً مولانا کی عبارت اسی لیے نقل کی تاکہ معلوم ہو کہ اس قلیل مدت میں ”ان لوگوں کو کیا پڑھایا جاتا تھا“ اور یہ چیزیں تو وہ ہیں جو اپنے والد سے انھوں نے پڑھی تھیں ان کے سواجب لکھنؤ آنا ہوتا تھا تو مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ سے جیسا کہ خود لکھتے ہیں:

قرأت علیہ فی ثمان ثمانین شرح الجغمینی مع مواضع من حواشی البرجندی والامام الدین الریاضی ورسالۃ الاصطرلاب للطوسی وقدراً کثیراً من

۱۲۸۸ھ میں مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی سے شرح چغمینی برجندی اور امام الدین ریاضی کے حواشی کے ساتھ میں نے پڑھی اور طوسی کے

شرح التذکرہ للسید بشرحہا للخفری وشرحہا للبرجندی، وزیج الغ بیگ مع شرح البرجندی ورسائل اکرو دا لتسطیح وغیر ذلک	اسطرلاب کا رسالہ، تذکرہ کی شرح کا بھی ایک حصہ حضری و برجندی کی شرح کے ساتھ الغ بیگ کی زیج برجندی کی شرح کے ساتھ اکرو کا رسالہ اور تسطیح کا رسالہ یہ ساری کتابیں بھی مولانا سے پڑھیں

ستّرہ سال کی عمر اور اس میں علوم و فنون کے ان ہفت خوانوں کو طے کرنا، اور کس طرح طے کرنا کہ ان ہی علوم کو پڑھانے بیٹھے تو ملک کے کناروں تک اپنے جلیل تلامذہ کی ایک فوج پھیلا دی، خود مولانا مرحوم کی پوری عمر کیا ہوئی، چالیس کے قریب میں انتقال ہوگیا، لیکن اس عرصے میں ستّر سے اوپر چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں، جن میں بعض کافی ضخیم ہیں، بعض ہندوستان کے سوا مصر میں بھی طبع ہوئیں، اس وقت تک بیسیوں کتابیں نظامی نصاب میں آپ ہی کی تحشیہ کی داخل ہیں، اسی کے ساتھ فتاویٰ کے مجلدات ہیں، علم کی یہ پختگی اور اس کے حصول میں وقت کی یہ نوعیت کیسی عجیب بات ہے۔

شاہ ولی اللہ کی فراغت خود حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا کیا حال ہے، انفاس میں رقمطراز ہیں:۔

بالجملہ از فنون متعارفہ بحسب رسم این دیار، در پانزدہم فراغ حاصل شد، ص ۱۹۴	حاصل یہ کہ مروجہ فنون سے اس ملک کے دستور کے مطابق پندرہ سال کی عمر میں فراغت حاصل ہوگئی۔

صاحب شمس بازغہ علامہ محمود جونپوری کے ترجمہ میں مولانا آزاد فرماتے ہیں:

نزد استاذ الملک شیخ محمد افضل جونپوری تلمذ نمود و در عرض ہفتدہ سالگی فاتحہ فراغ خواند، ص ۲۰۲	استاد الملک شیخ محمد افضل جون پوری کی شاگردی اختیار کی اور ستّرہ سال کی عمر میں فارغ تحصیل ہوگئے۔

بحر العلوم کی فراغت حضرت مولانا عبد العلی بحر العلوم کے متعلق بھی صاحب حدائق حنفیہ نے لکھا ہے:

سترہ سال کی عمر میں فارغ تحصیل ہو کر فائق اقران اور سرآمد فاضل و اماثل ہو گئے۔ ص ۷، ۴۶

قاضی ثناء اللہ پانی پتی

اور کس کس کا نام گناؤں، حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ اسی کتاب حدائق الحنفیہ میں ہندوستان کے مشہور فاضل جلیل قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جو عوام میں اپنی کتاب "مالابد منہ" کی وجہ سے مشہور ہیں لیکن اہل علم قاضی صاحب کی علمی بلند پائگی کو ان کی تفسیر مظہری سے پہچانتے ہیں جس کا شاید میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے، قاضی صاحب کے متعلق اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

اٹھارہ سال کی عمر میں تمام علوم ظاہری سے فراغت پا کر علم طریقت کا شیخ محمد عابد سے اخذ کیا۔ ص ۴۶۵۔

اور صرف یہی نہیں اٹھارہ سال کی اسی مدت طالب العلمی میں ایک طرف تو قاضی صاحب نے تمام علوم ظاہری سے فراغت حاصل کی اور دوسری طرف حیرت انگیز بات یہ ہے کہ

ایام تحصیل علم میں علاوہ کتب تحصیلیہ کے ساڑھے تین سو کتابیں مطالعہ کیں ص ۴۶۶

کس قسم کی کتابیں ان کے مطالعہ سے گذری ہوں گی، اس کا اندازہ ان کے اس خاص علمی رجحان سے ہو سکتا ہے جو ان کی کتابوں میں پایا جاتا ہے[1]، خصوصاً ہم جب اس پر غور کرتے ہیں کہ ان کی تعلیمی زندگی زیادہ تر شاہ ولی اللہ جیسے بلند علمی مذاق

---

[1] قاضی صاحب کی جو وسعت نظر علم حدیث و رفقہ و اصول فقہ و تصوف میں حاصل تھی حقیقت یہ ہے کہ ان کی تفسیر کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس جامعیت کے علماء ہندوستان میں کم ہی گذرے ہیں اور ہندوستان ہی نہیں اگر مبالغہ خیال کیا جائے تو قاضی صاحب کو بیرون ہند کے اسلامی ممالک کے علماء کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ ان کو بیہقی وقت بلا وجہ نہیں کہتے تھے حضرت مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ سے قاضی صاحب نے اگرچہ ارشاد اپنے پیر شیخ محمد عابد کے حکم سے حاصل کیا تھا لیکن خود مرزا صاحب قاضی صاحب کو علم الہدیٰ کے نام سے موسوم کرتے تھے تفسیر کے سوا قاضی صاحب نے ایک بڑی معرکۃ الآرا مبسوط کتاب فقہ میں لکھی ہے جو فقہ جامع کی ایک بہترین استدلالی کتاب ہے اس میں یہ باب ہیں الخ (باقی اگلے صفحہ پر)

رکھنے والے استاد کی شاگردی میں گذری۔

خلاصہ یہ ہے کہ علم کی جس شاخ کے اہل کمال کو آپ اس ملک میں پائیں گے، فراغت کی عمر یہی تیرہ چودہ سال سے بیس بائیس سال کی عمر سے زیادہ نظر نہ آئے گی، مولانا غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں تقریباً سو ڈیڑھ سو سے اوپر علماء کا تذکرہ درج کیا ہے، اوسط عمر تحصیل کی قریب قریب یہی ہے۔

موجودہ دور میں فراغت

آج ہندوستان میں عصری جامعات جن لوگوں کو گریجویٹ بنا بنا کر نکال رہی ہیں یوں کہنے کو تو ان طیلساتیوں کو سب ہی کچھ سکھایا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، ہر علم کی نمک چشی کے ساتھ زیادہ زور انگریزی دانی اور حساب و کتاب پر دیا جاتا ہے، لیکن اس پر بھی حال یہ ہے کہ ایک طرف اگر کذب بیانی کو اسکولی اور کالجی عمر کے اندراج میں جائز نہ ٹھہرالیا جاتا[1] اور اسی کے ساتھ خضاب آہنی کی چلتی ہوئی ترکیب پردہ دار نہ بن جاتی تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ بی۔اے اور ایم اے کی ڈگریاں لینے والے طلبہ کتنی لمبی لمبی ڈاڑھیوں کو لے کر تعلیم گاہوں سے باہر نکلتے۔

(بقیہ صفحہ (۳۷) کے مسائل دلائل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں! اسی کتاب سے الگ کر کے آپ نے ماخذ الاقوی کے نام سے ایک اور کتاب لکھی جس میں آپ نے ان مسائل کو جمع کیا ہے جو دلیل کے لحاظ سے آپ کے نزدیک قوی تر تھے۔ افسوس کہ ملک کی ناقدریوں نے اب تک ان کتابوں کی اشاعت کا موقع بھی بہم نہ پہنچایا۔ تفسیر مظہری متعدد بار چھپنی شروع ہوئی لیکن آج تک مکمل نہ ہو سکی حکومت آصفیہ سے ایک صاحب نے روپیہ بھی وصول کر لیا لیکن تفسیر چھاپ کر نہ دی۔ (۱) الحمد للہ کہ ندوۃ المصنفین دہلی نے تفسیر مظہری اس کا ترجمہ ۱۲ جلدوں میں شائع کر دیا

[1] حکومت نے یہ قانون بنا کر کہ سولہ سال کی عمر سے پہلے کوئی میٹرک پاس نہیں کر سکتا تھا اور جو بیس سال کی عمر کے بعد کسی کو سرکاری ملازمت میں نہیں لیا جا سکتا۔ اس عجیب و غریب قانون نے لوگوں کو جھوٹ بولنے اور بلوانے پر آج مجبور کر دیا ہے حالانکہ ان عجیب و غریب قیود کا مطلب آج (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پڑھنے میں عمر کی قید نہ تھی

بہرحال ہم جس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں تحصیل علم کی اوسط مدت جو تھی وہ آپ دیکھ چکے لیکن نتیجے کے لحاظ سے اسی مختصر مدت تعلیم میں ہندوستان کو شاہ ولی اللہؒ قاضی ثناء اللہؒ مولانا عبدالحیؒ ملا محمودؒ ملا فیضیؒ مولانا بحرالعلوم و مولانا فضل حق وغیرہم جیسی لازوال شہرتوں کی مالک ہستیاں مسلسل مل رہی تھیں۔

لیکن باوجود اس کے اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تعلیم کی اس زمانہ میں بھی کوئی مدت مقرر کردی گئی تھی جس کے دل میں جس وقت بھی علم کا ولولہ سر اٹھاتا آزاد تھا جس استاد کے پاس چاہتا تھا حاضر ہو جاتا تھا، عمر کی زیادتی کبھی حصول علم کی راہ میں مانع نہ آئی، خود مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم (جد امجد فقیر) کا قصہ گذر چکا کہ متاہل ہونے کے بعد گھر سے پڑھنے کے لیے نکلے اور پڑھ ہی کر واپس ہوئے۔ مولانا آزاد نے میر درگاہی کے تذکرہ میں ان ہی کا بیان نقل کیا ہے۔

"بعد از آنکہ پابند تاہل شدیم بہ کسب علم ترغیب نمودند"

شادی ہو چکنے پر کسب علم کا شوق دلایا۔

اشارہ میر عبدالجلیل آزاد مرحوم کے نانا کی طرف ہے کہ انھوں نے کسب علم

تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہے۔ ایک لڑکے میں اگر میٹرک پاس کرنے کی صلاحیت سولہ سال سے پہلے پیدا ہو گئی ہے تو آپ اس کو زبردستی اس امتحان میں کامیاب ہونے سے کیوں روک رہے ہیں۔ ممکن ہے یورپ کے سرد ملک میں لوگ دیر میں ہوش و حواس سنبھالتے ہوں۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ آپ کو بتارہی ہے کہ میٹرک تو علم کا ابتدائی دروازہ ہے یہاں تیرہ چودہ سال کی عمر میں لوگ فارغ التحصیل ہو کر فیضی اور بحرالعلوم بنتے تھے۔ یہی حال ملازمت کا ہے۔ کارکردگی کی صلاحیت جس میں پائی جاتی ہو وہ ملازمت کا مستحق ہو سکتا ہے خواہ اس کی عمر کچھ بھی ہو آج بھی یہی ہو رہا ہے لیکن جھوٹ کے پردے میں حقیقت کو چھپا کر بلا وجہ ایک اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہونے پر لوگوں کو مجبور کرنا اس زمانہ کا عجیب مذاق ہے۔

کی طرف متوجہ کیا، اسی سے پہلے یہ فقرہ ہے۔

"باعث تحصیل علم علامہ میر عبد الجلیل شدند — تحصیل علم کا ذریعہ علامہ میر عبد الجلیل ہوئے

بڑی عمر میں تحصیل علم

چاہا جائے تو اس کے نظائر و امثال بھی پیش کیے جا سکتے ہیں خصوصاً پڑھنے پڑھانے کے بعد کسی جدید زبان یا علم کے سیکھنے کی ضرورت اگر کسی کو پیش آگئی ہے تو پیرانہ سری بھی اس ضرورت کی تکمیل میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتی تھی، مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کے متعلق لکھتے ہیں کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عبرانی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا تذکرہ علماء ہند میں ہے:

"بشوق آموختن زبان عبرانی بہ کلکتہ رفتہ در آنجا سالے چند باقامت گشتہ از احبار (علماء) زبان عبرانی بہ نحو الوجوہ آموخت (ص ۱۵۲) — عبرانی زبان سیکھنے کے شوق میں کلکتہ تشریف لے گئے، اور کئی سال رہ کر علماء یہود سے عبرانی زبان سیکھی اور اچھی استعداد پیدا کی۔

جبرو (عبرانی) زبان میں مولانا کو جو دستگاہ حاصل تھی اس کا اندازہ ان کی کتاب "بشریٰ" اور اس رسالہ سے ہو سکتا ہے، جو حضرت ہاجرہ ام اسماعیل علیہما السلام کے متعلق آپ نے عبرانی حوالوں سے مرتب فرمایا تھا، سر سید احمد خاں نے اپنی مشہور کتاب "خطبات احمدیہ" کا جزو بنا کر اسے شائع کیا ہے۔

ؔ مختلف زبانوں کے سیکھنے کا مسلمانوں میں جو مذاق تھا اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر نے درر کامنہ میں آٹھویں صدی کے ایک بغدادی عالم زین الدین العابر کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ تاتاری نومسلم بادشاہ غازان خاں جب آپ کے مدرسہ میں آیا اور آپ سے ملا تو بالغ فی الدعاء (یعنی اس نومسلم بادشاہ کو شیخ نے بہت دعائیں دیں) یہ دعائیں کن کن زبانوں میں کی گئیں؟ حافظ لکھتے ہیں بالمغلی ثم بالترکی ثم بالفارسی ——— ثم بالرومی ثم بالعربی۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان پانچ زبانوں پر ان کو قدرت تھی، ہفت زبان کا لفظ مسلمانوں میں مروج بھی تھا دیکھو ج ۲ ص ۲!

غیر ملکی زبان اور علامہ تفضل حسین خاں

علامہ تفضل حسین خاں کا ذکر پہلے کہیں گذرا ہے، یہ بھی ان ہی لوگوں میں ہیں جنھوں نے تحصیل علوم رسمیہ کے بعد

"انگریزی ورومی... آں رالاتینی نیز گویند... یونانی رانیکو گفتے وخواندے ونوشتے"
(نجوم السمار ص ۳۲۴)

انگریزی اور رومی زبان سیکھی جسے لاطینی بھی کہتے ہیں، یونانی خوب اچھی بولتے اور پڑھتے،

قاضی غلام مخدوم

چڑیا کوٹ ہی کے ایک اور بزرگ قاضی غلام مخدوم چریا کوٹی ہیں، صاحب تذکرہ علماء ہند نے ان کے متعلق لکھا ہے۔

"بعد تکمیل علوم متداولہ شوق تعلم زبان سنسکرت در دلش پدید آمد تا اینکہ در تحصیل زبان مذکور حظے وافی برگرفت وبمقام بنارس کہ معدن ہمو زبان مرقوم است میان ماہران ایں فن امتیازے کافی یافت ص۱۵۱"

علوم متداولہ کی تکمیل کے بعد سنسکرت کا شوق پیدا ہوا اور اچھی مہارت پیدا کی، بنارس جو اس زبان کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے یہاں ماہران سنسکرت میں امتیازی مقام حاصل کیا؛

مولوی نصرت علی خاں

مولوی نصرت علیخاں دہلوی تخلص قیصر کے متعلق بھی اسی کتاب میں ہے۔

"علوم رسمی باستعداد حاصل نمود ماہر زبان فارسی وعربی وترکی وانگریزی وہندی ست" (ص۱۳۱)

مروجہ علوم میں استعداد بہم پہنچائی چنانچہ فارسی، عربی، ترکی، انگریزی اور ہندی پانچ زبانوں کے ماہر ہیں۔

غیر ملکی زبان کی تحصیل

ان ہی مولوی نصرت علی کے والد مولوی ناصر الدین جو عیسائیوں کے ساتھ اپنے زمانہ میں جو کہ سب سے زیادہ مناظرہ کرنے والے تھے، اس لیے لوگوں میں امام فن مناظرہ کے لقب سے مشہور تھے کنیت ابو المنصور تھی، ان کے متعلق بھی لکھا ہے "۔

"اکتساب علوم از والد ماجد وجد امجد خود نمودہ"

اپنے والد ماجد اور دادا بزرگوار سے علم حاصل کیا۔

جب عیسائیوں سے مناظرہ کی مہم سامنے آئی تو "

توریت وانجیل یونانی وعبرانی تفسیر کے ساتھ	توریات وانجیل با تفسیر عبرانی ویونانی از
علماء اہل کتاب سے پڑھیں	علماء اہل کتاب خواندہ ص ۲۳۲

غیر ملکی زبان اور مولوی نجف علی

مولوی نجف علی جھجر کے رہنے والے نواب ٹونک محمد علی خاں کے دربار کے مولوی تھے لکھا ہے

کہ " پنجاہ رسائل بالسنہ خمسہ کہ دری وپاژندی وعربی وفارسی دارد وعبارت از آنست" (تذکرہ علماء ہند۔ ص ۲۳۶) جس کا یہی مطلب ہے کہ عربی، فارسی اردو کے سوا دری اور پاژندی زبانوں کو بھی انھوں نے تحصیلِ علم کے بعد کسی پارسی عالم سے سیکھا تھا، حالانکہ خود عربی زبان میں ان کو اتنی قدرت حاصل تھی کہ

مقامات حریری کی شرح عربی زبان میں	" شرح مقامات حریری بہ زبان عربی بہ
اس طرح کی کہ کہیں نقطہ والا حرف نہیں لائے	صنعت اہمال تصنیف کرد"

پوری حریری کی شرح غیر منقوط الفاظ میں کرنا آسان نہیں ہے۔ ان کے متعلق یہ بھی بیان کیا ہے کہ پارسیوں کی مذہبی کتاب "دساتیر" کی ایک شرح "دیمزا" نامی پاژندی زبان میں اور "زمان سنرنگ" دری زبان میں لکھی تھی۔

حضرت نانوتوی کا عزم برائے تحصیل انگریزی

اس سلسلہ کی ایک دلچسپ بات وہ ہے جسے براہ راست اس خیر نے مولانا حافظ محمد احمد مرحوم سابق مہتمم دار العلوم دیوبند سے سنی تھی۔ اپنے والد مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم کے متعلق یہ قصہ بیان کرتے تھے کہ آخری حج میں جب جا رہے تھے تو کپتان جہاز نے جو غالباً کوئی اٹالین (اٹلی کا باشندہ) تھا، عام مسلمانوں کے اس رجحان کو جسے مولانا کے ساتھ عموماً وہ دیکھ رہا تھا یہ دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ حجاج میں کوئی انگریزی جاننے والے مسلمان بھی تھے، انھوں نے کپتان سے مولانا کے حالات بیان کیے، اس نے

ملنے کی خواہش ظاہر کی، وہاں کیا تھا مولانا بخوشی کپتان سے ملے کپتان نے اجازت چاہی کہ کیا مذہبی مسائل پر گفتگو کر سکتا ہوں، مولانا نے اُسے بھی منظور فرمالیا۔ وہی انگریزی خواں صاحب ترجمان بنے کپتان پوچھتا تھا اور مولانا جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد مولانا کے خیالات کو سن کر وہ کچھ مبہوت سا ہو گیا اور مولانا کے ساتھ اس کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ قریب تھا کہ اسلام کا اعلان کر دے، اس نے شاید وعدہ بھی کیا کہ وہ ہندوستان حضرت سے ملنے کے لیے حاضر ہوگا۔ اس واقعہ کا مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ پر اتنا اثر پڑا کہ آپ نے جہاز ہی پر عزم فرمالیا کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھوں گا، کیوں کہ مولانا کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جتنا اثر کپتان پر براہ راست گفتگو سے پڑ سکتا تھا، ترجمان کے ذریعہ وہ بات نہیں حاصل ہو رہی ہے لیکن افسوس ہے کہ اجل مسمّٰی نے واپس ہونے کے بعد فرصت نہ دی۔ کاش! یہ صورت پیش آجاتی تو دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک کا رنگ یقیناً کچھ اور ہوتا، لوگوں کو اکابر دیوبند کے خیالات سے صحیح واقفیت نہیں ہے، ورنہ جن تنگ نظریوں کا الزام ان کی طرف عائد کیا جا رہا ہے ان سے ان کے بزرگوں کی ذات بری تھی۔

حضرت تھانویؒ کا قول حضرت مولانا قاسم کے نقطۂ نظر کو تو آپ سن چکے، جماعت دیوبند کی آج سب سے بڑی سربرآوردہ ہستی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی حکیم الامت مدظلہ العالی کی ہے، النور میں آپ کے ملفوظات طیبہ شائع ہوتے رہتے ہیں ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ کی اشاعت میں حضرت والا کا ایک بیان گرامی یہ بھی درج ہے:۔

"ہم تو جیسا بخاری کے مطالعہ میں اجر سمجھتے ہیں، ویسا ہی امور عامہ کے مطالعہ میں بھی ویسا ہی اجر سمجھتے ہیں"

لہ صد حیف کہ شریعت و طریقت کا یہ آفتاب درخشاں ۱۹-۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب میں غروب ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

خیال کرنے کی بات ہے، کہاں بخاری اور کہاں معقولات کی کتاب امورِ عامہ میر زاہد کی لیکن حکیم الامتہ کا خیال یہی ہے اس کے بعد اپنے اس خیال کی توجیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا "کیوں کہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے ہے اور اس کا بھی" یعنی وہی اِنَّمَا الْاَعْمَالُ والی بات ہے، جامع ملفوظ نے اس ملفوظ کو درج کرنے کے بعد یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ "یہ بات بڑی قوت سے فرمائی"۔

کیا دیوبند کے جن اکابر کا یہ نقطۂ نظر ہو، اگر بجائے امورِ عامہ اور صدرا اور شمس بازغہ کے تمہیدی اغراض کے لیے جدید علوم و فنون کی کتابیں پڑھائی جائیں یا انگریزی سکھائی جائے تو اسی قاعدہ کی بنیاد پر کہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے اختیار کیا جائے، ان علوم اور انگریزی زبان یا اسی قسم کی کسی عصری زبان کا سیکھنا اسی طرح باعثِ اجر نہ ہوگا، جیسے بخاری کا پڑھنا باعثِ اجر ہے، بلکہ اس زمانہ میں علومِ جدیدہ یا مغربی زبانوں کو سیکھ کر چوں کہ اسلام کی خدمت کا موقع امورِ عامہ کے پڑھنے سے زیادہ مل سکتا ہے، اس لیے یقیناً اس کا اجر اس سے زیادہ ہوگا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز اور دیگر زبان

اور واقعہ یہ ہے کہ "استاذ اساتذۃ الہند مسند الدیار الہندیہ فی الحدیث خصوصاً جماعت دیوبندیہ کے پیشوائے اعظم حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جب ان کے ملفوظاتِ طیبہ میں خود ان ہی کی زبانی یہ روایت درج کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبری (عبرو) زبان کا جاننے والا کوئی فاضل شاہ صاحب کے زمانہ میں دلی آگیا تھا، حالاں کہ عمر بھی کافی ہو چکی تھی اور خود مرجع انام بنے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود حضرت ارشاد فرماتے ہیں کہ:

فاضلے از اکابر علماء آمدہ از و تحقیق توریت بلسانِ عبری کردم" ملفوظاتِ عزیزیہ (ص ۲)	ایک بڑے فاضل عالم آگئے تو ان سے توریت کی تحقیق عبرانی زبان میں کی،

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے براہِ راست عبرانی زبان ہی میں توراۃ اس فاضل سے پڑھی تھی، جامع ملفوظ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ:

"چنانچہ چند آیات اور (توریت) مع ترجمہ ارشاد فرمودند" ۲۷	چنانچہ توریت کی چند آیتیں آپ نے پڑھ کر ترجمہ کیا۔"

اس آیت کو بھی عربی خط میں جامع نے نقل کیا ہے لیکن کتاب اس قدر غلط چھپی ہے کہ امید نہیں الفاظ صحیح ادا ہوئے ہوں۔

بہر حال اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے عبری زبان سیکھی تھی، پھر جن کے پیشواؤں نے عبری سیکھی تھی اگر ان ہی کے پس رووں نے انگریزی سیکھنے کا عزم بالجزم حج سے واپسی کے بعد باوجود معمر ہونے کے اگر کر لیا ہو، تو کیا تعجب ہے، واقعات تو یہ ہیں لیکن اب ان کو کیا کہیے جنہوں نے ان ہی مولویوں کی طرف انگریزی زبان کے سیکھنے کی حرمت کے فتوے کو اس طرح منسوب کیا کہ گویا یہ کوئی واقعہ ہے۔

پہلے زمانہ میں محنت

خیر ایک ضمنی بات کا تذکرہ چھڑ گیا۔ میں اسلامی عہد کے اس دستور کا ذکر کر رہا تھا کہ عمر کی کوئی قید تحصیل علم کے لیے نہ تھی ابوالفضل جیسے سر پھرے آدمی کے متعلق ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ شیخ حسن علی موصلی جو شاہ فتح اللہ کے شاگرد تھے ان سے"

"چند گاہ شیخ ابوالفضل نیز خفیہ از و تعلیم فن ریاضی وطبعی و سائر اقسامِ حکمت گرفت و دقائق غوامض علوم ساز و کسب کرد" (ص ۱۳۶ ج ۳)	شیخ ابوالفضل نے ان سے خفیہ طور سے فن ریاضی وطبعی اور دوسرے معقولی علوم حاصل کیے اور ان کی باریکیاں معلوم کیں۔

خفیہ غالباً اس لیے پڑھائی ہوتی ہو گی کہ اکبر کو تو ابوالفضل نے یہ باور کرایا تھا کہ ان کے والد جامع معقول و منقول نے سب کچھ گھول کر اس کو پلا دیا ہے ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ اور ریاضی میں یا تو خود ملا مبارک زیادہ مہارت نہیں رکھتے تھے یا ابو الفضل کو ان سے پڑھنے کا موقع نہ ملا تھا خود ملا عبد القادر نے اپنے متعلق بھی لکھا ہے کہ شاہ فتح اللہ شیرازی کے بھتیجے میر تقی سے۔

نقیر پارہ از بست باب اصطرلاب پیش او گزرانید (ص ۲۹۳ ج ۳)	خاکسار نے ایک حصہ بست باب اصطرلاب کا ان سے پڑھا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اطلبوا العلم من المھد الی اللحد پر مسلمانوں کا عمل زبانی حد تک نہیں تھا، اور جب قوموں کے اقبال و عروج کا زمانہ ہوتا ہے تو ان میں یہی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے خود ان انگریزوں کا کیا حال تھا جو شروع شروع ہندوستان آئے، ان میں کتنے تھے جو عربی و فارسی سنسکرت ہندوستان کے مولویوں اور پنڈتوں سے سیکھتے تھے۔

واقعہ زین العابدین بہاری

خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں پڑھ لکھ لینے یا فارغ التحصیل ہونے کے بعد یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اب کچھ نہیں سیکھا جا سکتا، جو کچھ پڑھنا تھا پڑھ چکے بلکہ ایک طبقہ ہمیشہ ایسے لوگوں کا نظر آتا ہے، جس نے نہ ضرورت کے وقت نہ عمر کا خیال کیا، اور نہ وقت کا، دھن بندھی اور کام میں لگ گئے، حیدر آباد میں ایک اہل حدیث مولوی زین العابدین[1] نامی رہتے تھے۔ وطن آرہ شاہ آباد (بہار) تھا، اسکول میں عربی کے معلم تھے اپنا قصہ خود مجھ سے بیان فرماتے تھے کہ علوم عربیہ کی تکمیل کے بعد طب پڑھ کر چھپرہ میں میں نے مطب شروع کیا، کسی مریض کے پاس گیا ہوا تھا، ایک ڈاکٹر بھی اس عرصہ میں

[1] پندرہ سولہ سال ہوئے وظیفہ حسن خدمت لے کر آرہ اپنے وطن گئے اور چند سال بعد انتقال کر گئے عجب مزاج کے آدمی تھے جو دھن بندھ گئی کر گذرتے تھے خط پاکیزہ تھا کئی کئی جلدوں کی کتابیں نقل کر کے کتب خانہ آصفیہ میں داخل کیں تہذیب التہذیب ابن حجر کی بارہ جلدیں ان مولانا کے ہاتھ کی کتب خانہ میں موجود ہے

بلایا گیا، مجھے دیکھ کر میرے منہ پر اس نے تیمارداروں سے کہا کہ اس نے مرض کی کیا تشخیص کی ہے، جو میری تشخیص تھی میں نے بیان کی جس پر وہ ہنسا اور میری واقفیت کا اس نے مضحکہ اڑایا، مجھے اس کی یہ حرکت اتنی ناگوار گذری کہ مریض کے گھر سے مطب آیا، اسی وقت مطب کو بند کر کے میں نے کلکتہ کا ٹکٹ لیا، وہاں انگریزی شروع کی، انٹرنس پاس کیا، مقصود یہ تھا کہ اس کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے اس ڈاکٹر کو جواب دوں گا، اب یہ محفوظ نہ رہا کہ ڈاکٹری بھی انھوں نے پڑھی یا نہیں، لیکن اسی جھونک میں انٹرنس تک انگریزی تو پڑھ ڈالی۔

بڑی عمر میں حفظِ قرآن کا شوق سب سے عجیب چیز جو ہندوستانی علماء کے بلند ہمتیوں کے سلسلہ میں مجھے نظر آتی ہے وہ قرآن مجید کے حفظ کے ساتھ ان کا تعلق ہے، میرا مطلب ہے کہ جن لوگوں کو بچپن میں قرآن کے یاد کرنے کا موقع نہ مل سکا، اور آخر عمر میں خیال آیا کہ قرآن یاد کرنا چاہیئے ایک نہیں آپ کو بیسیوں مثالیں اس کی ملیں گی کہ کمر کس کر بیٹھ گئے، اور حافظ بن کر اٹھے، مولانا آزاد نے میر محب اللہ بلگرامی کے ترجمہ میں لکھا ہے:۔

"در عنفوان جوانی ذوق حفظ کلام ربانی	جوانی کے آغاز میں حفظ قرآن پاک کا ذوق ہوا تو
بہم رسانید بر بالاخانہ خود نشستہ در عرصہ	بالاخانہ پر بیٹھ کر چھ ماہ میں پورا قرآن
شش ماہ قرآن را یاد گرد" (ص ۱۲۸)	یاد کر ڈالا۔

مشہور مدرس و محشی مولانا معین الدین کڑوی کے متعلق تذکرہ علماء ہند میں لکھا ہے:

"باواسط عمر خود باوجود کثرت درس حفظ	عمر کے درمیانی حصہ میں اسباق کی کثرت کے باوجود
قرآن مجید کردہ" (ص ۲۲۹)	قرآن پاک حفظ کر لیا۔

انبیٹھی زادہ ھ کے ایک بزرگ شیخ احمد[۱] فیاض تھے، ملا عبد القادر نے لکھا ہے

---

[۱] مولانا احمد کی فیاض بھی ہندوستان کے ان علماء میں ہیں جن کے متعلق ملا صاحب (باقی اگلے صفحہ پر)

کہ:-

• بسیار ضعیف و مُسن شدہ چنانچہ قوت رفتن و گشتن نداشت۔ — بہت کمزور اور سن رسیدہ ہو چکے تھے اس طرح کہ چلنا پھرنا مشکل تھا۔

اسی حال میں

آں کبیر سن بر بستر بیماری صعب افتاد و قرآن مجید را دریک سال یادگرفت (ص ۸۳) — یہ بوڑھا سخت بیماری میں بستر سے لگ گیا اور ایک سال میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔

وہی مولانا فضل حق خیرآبادی جنھیں شطرنج کھیلتے ہوئے مولوی رحمان علی نے دیکھا تھا، جب شاہ دھومن دہلوی سے مرید ہو کر تائب ہوئے تو ان کے تذکرہ میں لکھا ہے:-

قرآن مجید در چہار ماہ یاد گرفت ص ۱۶۴ — قرآن مجید چار مہینے میں یاد کر ڈالا۔

اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ لاہور کے مولوی روح اللہ صاحب جو "در صرف و نحو و منطق و معانی و حدیث و تفسیر دانی نظیر نہ داشت" جب مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو "

بسی روز ماہ رمضان شریف قرآن مجید حفظ کرد" صد ۹۶ — رمضان شریف کے تیس دن میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔

انتہا اس ذوق کی ہے کہ اورنگ جہاں بانی پر جلوہ افروز ہونے کے بعد عالمگیرؒ نے قرآن مجید خود حفظ کیا اور اپنی چہیتی شاہزادی زیب النساء کو بھی قرآن مجید زبانی یاد کروایا۔

یہ رواج ہندوستان میں اتنا چلا ہوا نظر آتا ہے کہ صرف اسی پر ایک مستقل مقالہ لکھنے والے چاہیں تو تیار کر سکتے ہیں، ہمارے عہد میں بھی جامعہ عثمانیہ کے سابق پروفیسر مولانا عبدالحی مرحوم نبیرۂ مولانا احمد علی سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ جو شاہزادگان آصفی کے استاد بھی تھے، بچاس سال کی عمر کے بعد حفظ قرآن میں مشغول

(بقیہ صفحہ ۴۷ کا) نے لکھا ہے "تفسیر و حدیث و سیر و تاریخ خوب می دانست و اکثر کتب متداولہ را از بر داشت"

ہوئے، اور تراویح سنا کر بلکہ دوسرے سال تراویح پڑھتے ہوئے طاعون میں مبتلا ہو کر مولانا نے درجۂ شہادت حاصل کیا، حضرت مولانا تھانوی مدظلہ العالی سے ارادت و خلافت کا تعلق رکھتے تھے، حضرت الاستاذ مولانا مولانا شبیر احمد عثمانی (صدر مہتمم دار العلوم دیوبند) نے بھی قریب قریب پورا قرآن حال ہی میں یاد فرمایا، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے بھی سن کہولت ہی میں قرآن کو محفوظ فرمایا ہے، جیل خانوں کی زندگی میں حضرت والا کا سب سے بڑا مشغلہ یہی اشتغال بالقرآن رہتا ہے اور پورے وثوق کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا، لیکن اپنے اکابر اساتذہ سے ہی غالباً یہ بات میرے کان میں پہنچی ہے کہ بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن اس وقت یاد کیا، جب حج کے ارادہ سے آپ جہاز پر سوار ہوئے۔ مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ جہاز ہی پر رمضان کا چاند دیکھا گیا تراویح کا مطالبہ ان لوگوں کی طرف سے ہوا جو اسی جہاز میں مولانا کے ہمسفر تھے، اتفاقاً ان میں کوئی حافظ نہ تھا، آخر مولانا ہی تیار ہو گئے روزانہ ایک پارہ یاد کر کے رات کو تراویح میں سنایا کرتے تھے[1] اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، حدائق حنفیہ میں مولوی غلام محی الدین بگوی جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے ان کے متعلق یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے والد نے تراویح سننے کی ان سے خواہش کی انھوں نے کہا کہ روزانہ ایک پارہ کا دور سن لیں تو سنا سکتا ہوں، آخر یہی ہوا کہ روز ایک پارہ کا دور جو صرف چاشت کے وقت کرتے تھے اور رات کو وہی پارہ سنا دیتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عمر بڑھنے کے بعد قرآن کو یاد کرنے کا دستور ایسا معلوم ہوتا ہے

[1] بعد کو تذکرۂ رحمانیہ یعنی قاری عبدالرحمن محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری میں بحمد اللہ یہ الفاظ بھی مل گئے "ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم حج بیت اللہ کو تشریف لے جا رہے تھے جہاز میں ماہ رمضان المبارک آگیا مولانا ممدوح نے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دیا، دن میں بمقدار تراویح یاد کر کے رات کو سنا دیتے تھے" ص ۱۳۴

کہ ہندوستان میں شروع سے جاری رہا ہے، اور سچ پوچھیے تو حفظ قرآن کے مسئلہ میں شاید سنت یہی عمل قرار پا سکتا ہے، آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر ہے کہ چالیس کے بعد ہی قرآن یاد فرمایا۔ صحابہ میں بھی جو لوگ حافظ تھے کھلی ہوئی بات یہی ہے کہ اس کا موقع معمر ہونے کے بعد ہی ان کو ملا۔

بچوں کا حفظ قرآن

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی ہندوستانی مسلمانوں کا حفظِ قرآن کے ساتھ جو تعلق رہا ہے اور اسی جذبہ کے زیر اثر بچپن میں قرآن یاد کرانے کا جو ذوق و شوق ہندی مسلمانوں کے ہر طبقہ میں پایا جاتا ہے، اس کے لیے تو کسی تاریخی شہادت کی بھی حاجت نہیں، شاید ہی مسلمانوں کی کوئی معقول آبادی ہو گی جس میں آپ کو ایک دو آدمی پورے قرآن کے حافظ نہ مل جائیں پنجاب سے بنگال تک اور نیپال کی ترائی سے راس کماری تک جہاں کہیں مسلمان آباد ہیں، انشاء اللہ آپ کو یہ کیفیت نظر آئے گی، امیر و غریب، متوسط حال، ہر طبقہ میں یہ حال عام ہے۔ دلی جب مسلمانوں کی دلی تھی اس وقت اس کا کیا حال ہو گا اس کا اندازہ حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے ہو سکتا ہے ان کے ملفوظات میں ہے:

شبے در جامع مسجد شمار کردہ بودم سی و پنج (۳۵) جا تراویح مع الجماعت حفاظ می خواندند (ص ۲۲)	ایک رات میں نے جامع مسجد پہنچ کر شمار کیا تو دیکھا پینتیس جگہ حفاظ با جماعت تراویح پڑھ رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب لال قلعہ کے باہر مسلمانوں کے بادشاہ کی بادشاہی باقی نہ تھی۔

قرآن اور نواب چھتاری

خود اسی زمانہ میں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے صدر اعظم عالی جناب نواب سر حافظ احمد سعید خاں بالقابہ حفظِ قرآن کی دولت سرمدی سے سرفراز ہیں، التزاماً ہر سال تراویح بھی سناتے ہیں۔ انتہ

یہ ہے کہ جن دنوں آپ برطانوی حکومت کی طرف سے صوبجات متحدہ کے گورنر (حاکم اعلیٰ) تھے اس زمانہ میں بھی گورنر ہاؤس (دارالحکومت) میں تراویح کے سلسلے کو آپ نے برابر جاری رکھا، صرف یہی نہیں کہ سلطنت آصفیہ کے باب حکومت کے آپ صدر رہیں بلکہ بحمداللہ چھتاری کی ریاست کے کابر اً عن کابر آباً عن جد آپ کا خاندان والی چلا آرہا ہے اور اس وقت اس ریاست کے مالک آپ ہی ہیں!

نواب ٹونک اور حفظ قرآن

اسی طرح ریاست ٹونک کے فرمانروائے حال نواب سعادت علی خاں اور ان کے پدر بزرگوار حافظ ابراہیم علیخاں خلیل مرحوم کو بھی حفظ قرآن کا شرف حاصل تھا۔

شاہزادہ خلیل کا حفظ قرآن

اس فہرست کو اپنی معلومات کے لحاظ سے اگر بڑھاؤں تو غالباً چند اوراق نذر کرنے پڑیں گے، وہی تاریخی مثال کم کیا ہے کہ سلطان محمود بیگڑہ جیسا باجبروت وجلال بادشاہ جو گجرات، کاٹھیاواڑ، کوکن، خاندیش اور دکن کے ایک بڑے علاقہ کا مطلق العنان بادشاہ تھا، تاریخ گجرات میں اسی بادشاہ کے متعلق یہ واقعہ درج ہے کہ:

> ایک روز رمضان میں حافظ قرآن کی بہت تعریف ہو رہی تھی خود محمود بیگڑہ سلطان گجرات کہنے لگا افسوس ہماری اولاد میں کوئی حافظ ہوتا تو ہم کو بھی جنت ملتی۔ شاہزادہ خلیل نے سنا، یہ صاحب علم تھا، دل میں چوٹ لگی، اسی روز سے خفیہ طور پر حفظ شروع کیا آئندہ سال پہلی رمضان کو باپ سے کہا حکم ہو تو میں نماز تراویح میں تمام قرآن مجید سناؤں سلطان بہت خوش ہوا اور معقول انعام دیا۔ (مرآۃ محمدی ص ۹۱)

ہندوستان کے نظام تعلیم کے متعلق جن اساسی امور کا تذکرہ مقصود تھا تقریباً وہ ختم ہو چکے ہیں لیکن چند ضمنی امور اور ایک اہم باب اس سلسلہ میں باقی ہے۔ اب میں اس کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں، انشاءاللہ اسی سے وہ راز بھی منکشف

ہوگا کہ ہندی مسلمانوں کا قرآن سے غیر معمولی والہانہ تعلق کیوں پیدا ہوگیا' کن تاریخی عوامل و مؤثرات کے تحت یہ چیزیں ہم میں پیدا ہوئیں۔

علم کے ایک خطرناک پہلو کا قرآنی علاج

بات یہ ہے کہ عام حیوانات کے مقابلہ میں "الانسان" ایک تعلیمی حقیقت ہے یعنی جن چیزوں کے علم سے خالی اور جاہل ہوکر پیدا ہوتا ہے تعلیم کے ذریعہ سے ان کے جاننے کی صلاحیت آدمی ہی میں ہے میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کی پہلی نازل شدہ آیتوں میں قرأت (خواندن) تعلیم بالقلم (نوشتن) کا ذکر کرنے کے بعد

عَلَّمَ الانسان مالم یعلم — سکھائی انسان کو وہ باتیں جنھیں وہ نہیں جانتا

کی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' لیکن اسی کے بعد ارشاد ہے:۔

کَلَّآ اِنَّ الانسان لیطغیٰ — خبردار! بلاشبہ انسان سرکش ہوجاتا ہے۔

"الانسان تعلیمی حقیقت ہے" پھر ایک تنبیہی کلمہ "کَلَّآ" کے بعد فرمانا کہ "الانسان سرکش ہوجاتا ہے" ظاہر ہے کہ محض کوئی اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ جو مشاہدہ ہے اسی کا اظہار ہے یعنی جانی ہوئی چیزوں کے جاننے کی جوں جوں آدمی میں صلاحیت بڑھتی جاتی ہے دیکھا جاتا ہے کہ اسی نسبت سے اس میں طغیان اور سرکشی کی لہریں بھی اٹھنے لگتی ہیں، وساوس و شکوک' تنقید و اعتراض یہ قصے ظاہر ہے کہ جاہلوں اور کند دماغوں میں نہیں پیدا ہوتے' بلکہ یہ سارے عوارض علم کے ہیں' شاید یہ مبالغہ نہ ہو کہ دماغوں پر جتنا اچھا اثر جس تعلیم سے زیادہ پڑتا ہے اسی قدر اس تعلیم سے سرکشی اور طغیان کی تولید بھی زیادہ ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ علم کا بھی وہ خطرناک پہلو ہے کہ اس پہلو کی جانب سے معمولی غفلت ہمیشہ خطرناک نتائج کو پیدا کرتی رہی ہے' تعلیم اور ایجوکیشن کے خلاف بعض دلوں میں جو مخالفت پائی جاتی ہے [illegible] سل علم کے ان ہی

طغیانی نتائج پر ان کی مخالفت مبنی ہے خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔

بہر حال مسلمانوں کو پہلی نازل شدہ سورت میں تعلیم کے اس خطرناک پہلو پر بھی متنبہ کر دیا گیا تھا' مجھے اس وقت دوسرے ممالک سے بحث نہیں لیکن ہندوستان کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ جس زمانہ سے اس ملک میں اسلامی تعلیم کا نظام قائم کیا گیا اسی زمانہ سے آخر وقت تک جب تک زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیمی شعبہ بھی مسلمانوں کا برباد نہ ہوا تھا' یہ قرآنی نکتہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہا۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ دماغی تربیت و اصلاح کے ساتھ ساتھ لزومی طور پر قلبی اصلاح کی طرف توجہ تعلیم کی ایک ناگزیر ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ ساتویں صدی سے بارہویں صدی کی اس طویل مدت میں آپ مشکل ہی سے کسی ایسے عالم کی نشاندہی کر سکتے ہیں جس نے مدرسہ سے نکلنے کے بعد یا مدرسی زندگی کے ساتھ ساتھ کسی خانقاہ سے تعلق نہ پیدا کیا ہو' خود قرآن میں اس علم کے اس طغیانی پہلو پر چونکانے کے بعد۔

اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی (اس لیے آدمی سرکش ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز پاتا ہے۔)

کے الفاظ سے اس سبب کو ظاہر کیا گیا تھا' جس کی وجہ سے اہل علم میں یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے' گویا پڑھ لکھ لینے کے بعد آدمی یہ باور کرنے لگتا ہے کہ اب میں خود سوچ سکتا ہوں' دوسروں سے مشورہ لینے کی مجھ کو کوئی حاجت نہیں' حق و باطل میں امتیاز میرا دماغ خود پیدا کر سکتا ہے' علم کا یہی استغنار انسانیت کی موت ہے' الغرض مرض (طغیان) سبب مرض استغنار کے بعد

اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی (علاج اس کی طغیانی کا یہ ہے کہ تیرے رب کی طرف واپسی ہو۔)

کو اس طغیان کا واحد علاج بتایا گیا ہے' اسی قرآنی حکم کی تعمیل کی یہ شکل تھی کہ چکے

پاس ان کا رب تھا ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا' اپنی صحبت اپنی تربیت میں رکھ کر رجوع کرنے والے کو بھی اس کے رب کی طرف وہ پھیر دیتے تھے' اسی کا اصطلاحی نام پیری مریدی یا بیعت وصحبت تھا' قرآن کے بینات بتا رہے تھے کہ خدا کی طرف رجوع کرنے کی شکل اس ہبوطی زندگی میں بنی آدم کے لیے یہی ہے کہ خدا والوں کی طرف پلٹا جائے۔

فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون — اور میرے راہنماؤں کی جس نے پیروی کی نہ اس کو اندیشہ ہے اور نہ وہ کڑھے گا۔

کی وصیت اس وقت بھی کی گئی تھی جب آدم کو اس ہبوطی زندگی گذارنے کے لیے بھیجا گیا تھا' اور یہی اس وقت بھی کہا گیا' جب آخری پیغام لانے والے نے پیغام سناتے ہوئے کہا۔

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی — اگر تم اللہ کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو

اور قیامت تک کے لیے یہ منادی کر دی گئی:

واتبع سبیل من اناب الی — اور پیچھے پیچھے چلو ان لوگوں کی راہ پر جو میری طرف جھک پڑے ہیں

دل کی تربیت

جس زمانہ میں جس کی انابت رب کی طرف زیادہ ہوگی' اسی حد تک وہی اس کا زیادہ مستحق سمجھا جائے گا کہ لوگ اس کی راہ پر چلیں' اسی کا رنگ' اسی کا ڈھنگ اختیار کریں' ہمارے تعلیمی نظام کا آخری اختتامی جزو یہی چیز تھی' مدرسوں میں دماغوں کو بنایا جاتا تھا اور خانقاہوں میں دلوں کو سلجھایا جاتا تھا اور تب جا کر وہ نتائج پیدا ہوتے تھے جن کی لفظی تعبیریں جو آج کتابوں میں پائی جاتی ہیں' کچھ شاعرانہ رسمی باتوں سے زیادہ نگاہوں میں نہیں' جنہیں مثلاً ہندی علماء کے عام تذکروں میں مولانا آزاد ہی کے قلم سے بے ساختہ اس قسم کے الفاظ نکلتے جاتے ہیں:

خدا دوست' منہاہ شمس' دل بریاں' دیدہ گریاں — خدا سے تعلق' دنیا سے بیزاری' جلے دل

زبانے لطیف، بیانے شیریں باوضع لطافت
ونزاکت باتمکین ووقار ورزانت ظرافت
طبع، تقدس ذات، جلائل صفات، یگانۂ روزگار
ہموارہ بیاد سلطان حقیقی وغیرہ وغیرہ۔

انکسار آنکھیں، پاکیزہ زبان، شیریں بیان، صاف
ستھری وضع، متانت وسنجیدگی، خوش طبعی، پاکیزہ
ذاتی، عمدہ اوصاف وصفات، یکتائے زمانہ،
اللہ تعالیٰ کی یاد میں منہمک رہتے۔

جس تذکرہ کو اٹھا کر دیکھیے، عموماً ان میں کچھ اسی قسم کے ترشے ترشائے ڈھلے ڈھلائے فقرے آپ کو ملتے چلے جائیں گے، پڑھنے والے ان الفاظ کو پڑھتے ہیں، چونکہ اب آنکھوں کے سامنے سے وہ تماشا غائب ہو چکا ہے، اس لیے مجبور ہیں کہ پرانے زمانہ کی انشار کا اسے ایک اسلوب خاص قرار دے کر آگے نکل جائیں۔

مگر میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ دماغ کے ساتھ جب کبھی "دل" کی تربیت کا سامان کسی نظام تعلیم میں کیا گیا ہے، تو مذکورۂ بالا الفاظ کے سوا ان کے نتائج کے اظہار کی کوئی دوسری صورت ہی نہیں ہے بلکہ اصل حقیقت جیسی کہ چاہیے پھر بھی سامنے نہیں آتی۔

بہر حال انابت الی اللہ اور ہر طرف سے ٹوٹ کر خدا ہی کے قدموں میں جھک جانے والوں کا اصطلاحی نام "صوفیہ"[1] اور ان کے علمی وعملی نظام کا نام "تصوّف" تھا دستور تھا کہ رسمی علوم سے فارغ ہونے کے بعد لوگ اسلام کے اسی طبقہ کی طرف

[1] اس قسم کی فضول بے معنی بحثیں کہ "صوفی" کا مادۂ اشتقاق کیا ہے؟ وہ مادہ عربی ہے کہ یونانی میرے نزدیک غیر ضروری ہیں؛ الفاظ کچھ ہی ہوں نظر معنی اور مصداق پر رکھنی چاہیے۔ مسلمانوں نے تو روزہ اور نماز جیسی عبادتوں کا ترجمہ عجمی الفاظ میں کر لیا ہے کیا یہ دلیل ہوگی کہ یہ عبادتیں ایران سے حاصل کی گئی ہیں؟ کیوں کہ یہ الفاظ عربی نہیں ہیں علمار رسوم کو عموماً "ملّا" یا "مُلّا" مختلف اسلامی ملکوں میں کہا جاتا ہے اس لفظ کی اصل کیا ہے؟ کیا بودھ مذہب کے مذہبی پیشواؤں کو جو لامہ کہتے تھے اس کی یہ معکوس شکل ہے؟ بالفرض اگر یہ ہو بھی تو کیا ہمارے علمار کے علوم بدھ مذہب کی کتابوں سے ماخوذ سمجھے جائیں گے؟

متوجہ ہوتے تھے، اور اپنی اپنی مناسبتوں کے لحاظ سے ان بزرگوں میں سے کسی کو نمونہ بنا کر ان کی صحبت اور ان کی نگرانی میں زندگی گذارتے تھے علمی شکوک اور ذہنی شبہات کے غبار سے دماغ جو بھر جاتے تھے اس کی شستہ وشو ان ہی ہستیوں کی رفاقت اور تبعیت میں میسر آتی تھی یقین و ایمان کی برفانی سلوں سے جن کے سینے معمور تھے وہ اپنی خنکیوں کو دوسروں تک منتقل کرتے تھے کردار کی استواری سیرت کا استحکام، دین کا وقار اور جلال خود بخود ان مثالی نمونوں کو دیکھ کر لوگوں میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق پیدا ہو جاتا تھا اور اس وقت ملت کی صحیح رہنمائی کا استحقاق اہل علم کو حاصل ہوتا تھا۔

ہندی تصوّف اور ہندوستانی صوفیاء

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج اس ملک میں تصوف اور صوفیار کی نمائندگی جو طبقہ کر رہا ہے ان کو دیکھ کر اسلاف کے متعلق رائے قائم کرنے والوں کو اگر کچھ مغالطہ ہو تو یہ مغالطہ بے بنیاد نہیں ہے۔ لیکن جو حالات سے واقف ہیں ان کے نزدیک یہ اسی قسم کا مغالطہ ہے جیسے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھ کر کوئی حقیقی اسلام یا پیغمبر اسلام علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کرامؓ کے متعلق غلط فیصلہ کر بیٹھے۔ مگر کیا کیجئے کہ آج یہی کیا جا رہا ہے، اسی کا نام ریسرچ اور تحقیقات رکھا گیا ہے خصوصاً تصوف اور صوفیا کے ساتھ تحقیقاتی بازی گروں کے ذہنی بازیچوں کا عجب حال ہے۔ صوفیا اور تصوف کی اہمیت کو گھٹانے کا جو فیصلہ کر چکے ہیں وہ اپنے اس طے شدہ فیصلہ کی تائید میں ایسی باتیں جمع کرتے ہیں جن سے ثابت ہو جائے کہ ہندو جوگیوں اور فلسفہ ویدانت کے زیر اثر ایک خاص قسم کی راہبانہ زندگی بعض مسلمانوں نے جو اختیار کی اسی کا نام

تصوف ہے ورنہ اسلام کو اس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔
میں یہ نہیں کہتا اگرچہ اس کا بھی کوئی ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے کہ جس طرح مسلمانوں نے اس ملک میں آکر ہندی بھاشا میں شاعری کی، بعضوں نے سنسکرت سیکھی بعضوں نے یہاں کی موسیقی اور موسیقی کے لوازم سیکھے اسی طرح یہ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں نے ہندوؤں کے یوگا کو بھی سیکھا ہو، جس کی یوں تو بہت کچھ تعریف کی جاتی ہے، کہا جاتا ہے کہ ان طریقوں کے اختیار کرنے سے انسان میں غیر معمولی روحانی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور یہ ہوتا ہے، اور وہ ہوتا ہے لیکن اگر پھلوں کو دیکھ کر درخت کے پہچاننے کی کوشش کی جائے تو ہم مذہبی اور ذہنی حیثیت سے تو ہندوستان کے اس یوگا یا جوگا گیان دھیان اور خدا جانے کیا کیا، کا نتیجہ یہی دیکھتے ہیں کہ ننانوے فی صدی مخلوق اس ملک کی انتہائی مشرکانہ اوہام میں مبتلا ہے، اوپر، نیچے، اندر، باہر اس ملک کے عوام ہی کیا، اکثر و بیشتر خواص کے نزدیک بھی سارا ہندوستان اور اس کی فضا صرف بھوتوں اور پریتوں سے بھری ہوئی ہے، ٹوٹکے، فال، بدشگونی، جنتر، منتر، جوتش ان ہی چیزوں پر یہاں کے عام باشندوں کی زندگی کا دارومدار ہے توحید خالص کا وہ نظریہ جس کا انتساب ویدانت والوں کی طرف کیا جاتا ہے، اس کا کوئی اثر اس ملک کے رہنے والوں پر نظر نہیں آتا، پھر وہ کیا خاک روحانیت ہوئی، جو لوگوں کو درختوں اور پتھروں، سانپوں، بچھوؤں کے آگے جھکنے سے نہ روک سکی، روحانی طاقت کا سب سے بڑا استعمال اگر ہوسکتا تھا، تو ان ہی بے بنیاد اوہام کی صفائی ہوسکتا تھا اس میں جس حد تک یہ ملک ناکام ہے سو ظاہر ہے، یہ نہ ہوسکتا تھا۔ تو جن روحانی قوتوں کی لن ترانیاں ان کے مداحوں کی طرف سے سننے میں آتی ہیں کاش! اس کا یہی اثر ہوتا کہ اپنی ان روحانی قوتوں سے باہر سے آنے والی مادی قوتوں ہی کا مقابلہ کیا جاتا، سو اس کا حال بھی بتایا ہے کہ باوجود رشیوں، منیوں، گیانیوں اور

دھیانیوں کے یہ مسکین ملک ہمیشہ بیرونی قوموں کی چراگاہ کا کام دیتا رہا۔ مسلمانوں سے پہلے بھی مسلمانوں کے زمانہ میں بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت نکل جانے کے بعد بھی اسی حال میں اب تک گرفتار ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ان مجاہدات و ریاضات کا آخر کیا حاصل ہوا۔ اگر مداریوں کے چند تماشوں کے دکھانے کی قدرت ان سے پیدا ہو جاتی ہے تو پھر بیچارے مداریوں اور نٹوں کو کیوں ذلیل سمجھا جاتا ہے؟

بہر حال مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ اس قسم کے اعمال و اشغال ہندوؤں اور ان کے جوگیوں میں ضرور پائے جاتے ہیں جن سے کچھ نادرہ نمائیوں کی قدرت آدمی میں پیدا ہو جائے۔

مسلمان صوفیار کے جوگیوں سے اختلاط کا افسانہ

لیکن میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ ہندوستان کے اسلامی صوفیار کی طرف جو یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ انھوں نے جوگیوں سے چیزیں سیکھی تھیں آخر اس کی بنیاد کیا ہے؟ ہمارے بزرگوں کے حالات، سوانح عمریاں موجود ہیں کم از کم صوفیائے ہند کے مشاہیر اکابر کی زندگی تو سب کے سامنے ہے کیا کوئی ایک دو فقرے ہی نکال کر بتا سکتا ہے جن سے اس دعوے کے کسی پہلو پر کوئی روشنی پڑ سکتی ہے، ہندوستانی صوفیوں میں سب سے زیادہ مقبول و ہر دلعزیز طبقہ اصحابِ چشت کا ہے؛ چشتی سلسلہ کے بزرگوں میں خواجہ بزرگ اجمیریؒ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ شیخ فرید الحق والدین شکر گنجؒ، سلطان المشائخ حضرت نظام الاولیاءؒ وغیرہم حضرات ہیں، ان میں سے بتایا جائے کہ کس بزرگ کو جوگیوں کی صحبت حاصل ہوئی ہے۔

اور بزرگوں کی تو کوئی معتبر کتاب نہیں پائی جاتی ہے لیکن فوائد الفواد کے متعلق تو کوئی شک نہیں کر سکتا کہ حضرت سلطان المشائخ کے ملفوظات اور ان

کی نظر سے گذری ہوئی کتاب ہے' افسوس ہے کہ لوگ اس زمانہ میں اس قسم کی کتابیں پڑھتے نہیں یا پڑھتے ہیں تو سوچتے نہیں' ورنہ اسی کتاب سے لوگوں کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ ان بزرگوں کا ہندوستان کے جوگیوں سے کس قسم کا تعلق تھا' اور اس طبقہ کا ذکر وہ کن الفاظ میں فرماتے تھے۔

ایک جوگی کا چیلنج

جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ سلطان المشائخ ایک دن شیخ صفی الدین گازرونی کا ذکر فرمار ہے تھے کہ ان کی خدمت میں ایک جوگی آیا اور بڑے بڑے دعوے کرنے لگا' شیخ گازرونی کو مخاطب کرکے بولا' بیا قدم بنما' آؤ اپنا مقام یا اپنی کرامت دکھاؤ' شیخ گازرونی نے جواب میں فرمایا کہ" دعویٰ تو می کنی تو قدم بنما' جوگی قدم نمائی کا اظہار" اڑ میں بر ہوا بر آمد" سے کرنے لگا یعنی زمین سے معلق ہو کر ہوا میں ٹھہرنے لگا' اور چند منٹ کے بعد زمین پر اتر کر شیخ گازرونی سے بھی اسی تماشے کا مطالبہ کرنے لگا' اب یہی مقام سوچنے کا ہے' اگر اسلامی صوفیا کو بھی اسی قسم کی کوئی مشق ہوتی تو ظاہر ہے کہ وہ بھی بازوؤں کو پھڑ پھڑا کر ہوا میں اڑنے لگتے' لیکن شیخ گازرونی نے اس تماشے کو دیکھ کر کیا کیا؟ سلطان المشائخ فرماتے ہیں'

"شیخ صفی الدین گازرونی روئے سوئے آسماں کرد وگفت خداوندا! بیگانہ را ایں قدم دادہ مرا ہم ایں معنی کرامت کن"	شیخ صفی الدین گازرونی نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور التجا کی' پروردگار عالم! تو نے اپنے بیگانوں کو یہ چیزیں دے رکھی ہیں' مجھے بھی اس طرح کی کرامت عطا کر' کہ میں تو تیرا ایک بے نوا بندہ ہوں۔

لیجئے عین وقت پر اب ان کو کرامت کی تلاش ہوتی ہے' اپنے مالک سے التجا کرتے ہیں کہ ہم نے تو یہ ورزشیں کبھی کی نہیں' اب ایک بیگانہ آپ سے ناآشنا برسر جدل آمادہ

ہے، آپ ہی اپنے بندے کی مدد کیجئے۔ بہرحال کہا جاتا ہے کہ شیخ کو بھی حق تعالیٰ نے قوتِ طیران عطا فرمائی، اور ایسی قوت کہ جوگی بھی دیکھ کر حیران ہو گیا، کیوں کہ جوگی کو لے دے کر بس اتنی ہی مشق تھی کہ سیدھے ہوا میں جائے اور پھر اسی خط مستقیم پر واپس آجائے، ادھر ادھر نہیں جا سکتا تھا، لیکن شیخ گازرونی کا طیران مشق کا نتیجہ تو تھا نہیں وہ تو۔

انا لننصر رسلنا والذین امنو فی الحیوٰۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد (مومن)	ہم قطعاً مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا والی زندگی میں اور جب گواہ پیش ہوں گے۔

کے وعدے کا ایفاء اپنے اس مالک سے چاہتے تھے جس پر وہ ایمان لائے تھے اور اس کی نصرت جس بندہ کو حاصل ہو جائے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا، ہوا یہ کہ:

بعد ازاں شیخ (گازرونی) از جائے برآمد جانب قبلہ طیران نمود از آنجا بجانب شمال شد، باز طرفِ جنوب، باز بہ مقام خود بنشست (ص ۵۰ فوائد الفواد)	اس کے بعد شیخ گازرونی اپنی جگہ سے اٹھے اور قبلہ کی طرف اڑنا شروع کیا پھر ادھر سے اتر کی جانب اڑے پھر دکھن سمت میں اور اس کے بعد اپنی جگہ آکر بیٹھ گئے۔

یہ الگ بحث ہے کہ ایمان والوں کے ساتھ اس "الحیوٰۃ الدنیا" میں حق تعالیٰ کی نصرت کا ظہور اس شکل میں ہو سکتا ہے یا نہیں، اس سے قطع نظر کیجئے بلکہ یہ دیکھئے کہ اس قصّہ کے بیان کرنے والے کے متعلق کیا ادنیٰ شبہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جوگیانہ کرتبوں سے واقف تھا، یا اس کی نگاہ میں ان جوگیانہ اعمال وافعال کی کچھ وقعت تھی، ایک سیدھا سادا مسلمان ان جوگیانہ اعمال کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا خیال رکھ سکتا ہے جو اس قصّہ میں ظاہر کیا گیا ہے، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ جن ہندی صوفیوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ جوگیوں سے انھوں نے لوگا

اور جوگا کا فن سیکھا تھا' وہ کون لوگ ہیں' سلطان المشائخ کا شمار اگر ہندی صوفیوں میں نہیں ہے تو کن کا ہے۔

جوگیوں میں صوفیوں کا احترام

کس قدر بات الٹی بیان کی جاتی ہے' جہاں تک کتابوں سے معلوم ہوتا ہے' واقعہ یہ ہے کہ خود ان اسلامی بزرگوں کے روحانی تقدس وجلال کو دیکھ کر پہلے بھی اور اب بھی جوگیوں میں سے بعض لوگ اسلامی بزرگوں کی خدمت میں "درشن ہی" کی نیت سے سہی مگر آمدورفت رکھتے تھے' اور بسا اوقات اپنے دوسرے دیوتاؤں میں اس بزرگ کو بھی دیوتا بنا کر شریک کر لیتے تھے یہ اس قوم کی پرانی عادت ہے' ہندوؤں میں جو لوگ "انگریزی قومیت" کے زہریلے اثر سے پاک ہیں' وہ اسلامی بزرگوں کا اب بھی احترام کرتے ہیں' حضرت سلطان المشائخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کبیر بابا شکر گنج کی خدمت میں جب وہ تشریف رکھتے تھے تو کبھی کبھی بابا صاحب کی مجلس میں مدتے جوگی" بھی وہی" درشن" یا تبرک حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے' سلطان جی نے حضرت کے دربار کی یہ خصوصیت بیان کی ہے۔

بخدمت شیخ الاسلام فریدالدینؒ از ہر جنس درویش وغیرآں ہر سیدہ" (فوائد ص ۵۱)	شیخ الاسلام فریدالدینؒ کی خدمت میں ہر طرح کے فقیر وجوگی پہونچتے۔

جوگیوں سے باتیں

سلطان المشائخ کی جوانی کا زمانہ تھا' کبھی کبھی ان جوگیوں سے آپ باتیں بھی کر لیا کرتے تھے لیکن کس قسم کی باتیں ایک دو نمونے ان کے بھی سن لیجئے! اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جن بزرگوں کا نام "ہندوستانی صوفیاء" ستہان کا تعلق ان بیچارے جوگیوں سے کیا تھا' سلطان المشائخ نے یہ فرماتے ہوئے کہ:

۱۔ اس کا ذکر آپ نے آزاد قلندروں کے سلسلہ میں کیا ہے کہ حضرت زکریا ملتانی کے یہاں اس قسم کے بے قید فقیروں کو راہ نہیں ملتی مگر بابا فرید کے یہاں سب ہی طرح کے فقراء وغیرہم آتے جوگی وغیرہ مراد ہیں آتے رہتے تھے

"وقتے بخدمت شیخ الاسلام فریدالدین قدس اللہ سرہ العزیز انجا جوگیے حاضر بود" — ایک دن میں شیخ الاسلام فریدالدین قدس سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک جوگی پہونچا،

حضرت فرماتے ہیں کہ شیخ کبیر کی مجلس میں اس کا ذکر چھڑا کہ بعض بچے فطرۃً نالائق اور ناہموار، بے ذوق پیدا ہوتے ہیں، اس پر جوگی نے اپنے جوگیانہ علم کا اظہار کیا کہ اس کی وجہ یہ ہے:

"مردمان وقتِ مباشرت نمی دانند" — لوگ ہمبستری کا وقت نہیں جانتے،

اور اس کے بعد کہنے لگا کہ دراصل بعض مہینے تیس دن کے ہوتے ہیں اور بعض مہینے انتیس دن کے۔

"وہر روز را خاصیتے ست مثلاً اگر روز اول مباشرت کنند فرزند چنیں آید اگر روز دوم کنند چنیں باشد، الغرض ہر روز را حکم بیان می کرد" — اور ہر دن کی ایک خاصیت ہوتی ہے اگر پہلے دن ہمبستری کریں تو ایسا بچہ ہوگا اور دوسرے دن کریں تو ایسا ہوگا مختصر یہ کہ ہر دن کی خاصیت بیان کی۔

سلطان المشائخ کی جوانی کا زمانہ تھا جوگی کی یہ عجیب بات انھیں پسند آئی اور آپ نے جوگی کی بتائی ہوئی تاریخوں اور ہر تاریخ کی جو خاصیت اس نے بیان کی تھی اس کو دہرا کر جوگی سے پوچھا کہ تم نے یہی بتایا تھا؟ حضرت بابا صاحب جوگی اور سلطان المشائخ کی باتیں سن رہے تھے۔ جب دیکھا کہ سلطان المشائخ ان تاریخوں کو یاد کرنا چاہتے ہیں تو بولے:

"تو ازیں چیزہا چہ می پرسی ترا ہرگز کار نخواہد آمد" (ص ۲۴۶) — آپ ان میں سے کیا دریافت فرماتے ہیں، یہ چیز ہرگز آپ کے کام نہیں آئے گی۔

ایک کشفی اشارہ تھا کہ آپ کی زندگی مجردانہ گذرے گی، سو گذری۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ ان جوگیوں سے اس زمانہ میں جو باتیں ہوتی بھی تھیں تو اسی قسم کی۔

ایک اور واقعہ

ایک اور قصہ اسی فوائد الفواد میں سلطان المشائخ ہی کی زبانی مروی ہے، نصیر نامی ایک طالب العلم کا قصہ آپ نے بیان کیا کہ وہ حضرت بابا کی خدمت میں بیعت کے بعد سر کے بال بڑھا رہا تھا، گویا کاکل بنانے کا ارادہ تھا۔ اتفاق سے ایک جوگی پھر بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ:

"آں متعلم (نصیر) ازاں جوگی پرسیدن گرفت | اس نصیر متعلم نے جوگی سے پوچھنا شروع
کہ موئے سر از چہ دراز شود" | کیا کہ سر کے بال کس چیز سے لمبے ہوتے ہیں۔

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ مجھے اس طالب العلم کی یہ حرکت سخت ناگوار گذری، گویا اس ذریعہ سے بال بڑھا کر وہ زور پھیلانا چاہتا تھا، میں نے اس قصہ کو اس لیے نقل کیا تاکہ معلوم ہو کہ اس زمانہ میں مسلمان اگر ان جوگیوں سے پوچھتے بھی تھے تو اسی قسم کی باتیں کہ سر کے بال کن دواؤں سے بڑھتے ہیں، ہمبستری کی اچھی تاریخیں جن میں اچھے بچے پیدا ہو سکتے ہوں کیا ہیں، اور خدا جانے ان باتوں کا بھی علم ان جوگیوں کو ہوتا ہے یا نہیں۔ لیکن بہرحال وہ اپنے آپ کو وہ ان ہی چیزوں کا جاننے والا پہلے بھی مشہور کرتے تھے اور اب بھی سنیاسی جوگی وغیرہ کا یہی کام ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ ان جوگیوں سے اگر کسی بزرگ نے کوئی بات پوچھی بھی ہے تو اس کا ذکر بھی کرتے تھے۔ اب آپ ہی خیال کیجئے کہ فوائد الفواد جو متوسط تقطیع پر ڈھائی سو صفحات کی کتاب ہے، اور اس میں تقریباً آپ کی سیکڑوں مجلسوں کی پوری گفتگو من وعن درج ہے، بہ مشکل ان سارے ملفوظات میں بھی چند مقامات ہیں جہاں جوگی کا ذکر آیا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان میں سے کسی گفتگو کا تعلق بھی ان امور سے ہے جن کا اتہام ان بزرگوں کے سر اس زمانہ میں تھوپا جا رہا ہے

ایک جوگی سے گفتگو

صرف ایک مقام اور ہے جس میں اجودھن ہی کا ایک اور واقعہ

جوگی کے متعلق حضرت سلطان المشائخ نے بیان فرمایا ہے اور وہ یہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

من وقتے بخدمت شیخ کبیر در اجودھن	میں ایک دفعہ اجودھن میں شیخ کبیر کی خدمت
بودم جوگیے بود بیامد"	میں حاضر ہوا ایک جوگی حاضر ہوا

اور اس سے میرے اس دعویٰ کی توثیق ہو رہی ہے کہ خود یہ جوگی ان بزرگوں کی خدمت میں کبھی کبھی استفادہ کے لیے آیا کرتے تھے۔[1]

بہرحال حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ:

من ازو پرسیدم کہ شما کدام راہ ی	میں نے اس سے پوچھا تم کیا راستہ اختیار
اصل کار درمیان شما چیست؟	کرتے ہو؟ تمہارے یہاں اصل کام کیا ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ سوال کا لہجہ کیا وہی نہیں ہے جو آج بھی جب کبھی ملنے جلنے والے پوجاری ہندو یا سادھو سے کسی مسلمان کی ادھر ادھر ریل پر یا کسی مقام پر ملاقات ہو جاتی ہے تو عموماً تفنن طبع کے لیے پوچھا جاتا ہے کہ بھئی! تم لوگ کیا کرتے ہو جوگی نے جو جواب دیا، سلطان المشائخ نے اسے بھی فرمایا ہے۔

او (جوگی) گفت در علم ما ہمچنیں آمدہ است	اس جوگی نے کہا کہ ہماری معلومات یہ ہیں کہ
کہ در نفس آدمی دو عالم است یکے عالم علوی	نفس انسانی کے اندر دو عالم ہیں ایک عالم
و دوم عالم سفلی از تارک (چندیا) تا ناف	علوی دوسرا سفلی سر کی کھوپڑی سے لے کر
عالم علوی ست، بز از ناف تا قدم عالم	ناف تک تو عالم علوی ہے اور ناف کے نیچے سے
سفلی است"	لے کر قدم تک عالم سفلی،

[1] اسلامی صوفیۂ ہند کے پاس جوگیوں کی آمد و رفت استفادہ کے لیے ہوتی تھی۔ چاہا جائے تو اس کے متعلق ایک الگ مضمون تیار کیا جا سکتا ہے بلحوظ طوالت میں نے اس حصہ کو نظر انداز کر دیا ورنہ دلچسپ باتیں سننے میں آتیں کم از کم ثمرۃ الفوائد نامی کتاب جو حضرت شاہ بھیک قدس سرہ کے حالات میں ہے مطالعہ کیجیے بیسیوں واقعات اس سلسلہ میں آپ کو ملیں گے۔

یہ انسانی نفس کی تقسیم ہوئی، آگے اس نے کہا کہ:۔

سبیل کار آن است کہ در عالم علوی ہمہ صدق، وفا واخلاق خوب وحسن معاملہ باشد و در عالم سفلی نگہداشت وپاکی وپارسائی	حاصل یہ ہے کہ عالم علوی والا حصہ تمام کا تمام صدق وصفا، مکارم اخلاق اور حسن معاملہ سے متعلق ہے اور عالم سفلی کا پاکی اور پارسائی سے۔

مطلب جوگی کا یہ تھا کہ ناف کے اوپر جتنے اعضاء ہیں۔ مثلاً دل ہے، آنکھیں ہیں، زبان ہے، دماغ ہے، کان ہیں، زیادہ تر اخلاقی اعمال کا ان ہی سے تعلق ہے، اور ناف کے نیچے جو اعضاء ہیں، عفت وپارسائی، پاکی وغیرہ کا ان ہی سے تعلق ہے، ایک اچھی تقسیم تھی جو جوگی نے بیان کی سلطان المشائخ فرماتے ہیں۔

"مرا این سخن او خوش آمد"	مجھے اس کی بات بھلی معلوم ہوئی،

آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جن بزرگوں کا سارا سرمایہ جوگ ہی سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے کیا وہ اس ندرت کے ساتھ جوگی کی ایک اچھی شاعری کا داد کے ساتھ تذکرہ کر سکتے ہیں۔

ایک برہمن کا جواب

کبھی مسلمانوں کو عبرت دلانے کے لیے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ان جوگیوں، سادھوؤں وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ سلطان المشائخ ہی سے فوائد الفواد میں منقول ہے، امیر حسن علا فرماتے ہیں کہ کسی زمانہ میں ان کی تنخواہ (مواجب) جس کی وجہ انھوں نے نہیں لکھی ہے رک گئی تھی۔ توقف موجب دلتنگی بودئ[1] مجلس مبارک میں حاضر ہوا، کسی بزرگ کے حوالے سے حضرت نے یہ قصہ بیان کیا کہ کسی شہر میں "برہمنے بود مال بسیار داشت[2]" شہر کا والی کسی وجہ سے برہمن سے بگڑ گیا اور جو کچھ اس کے پاس تھا سب کی ضبطی ہو گئی، غریب برہمن دانے دانے کو محتاج ہو گیا، ایک دن جا رہا تھا، راستہ میں کسی دوست سے ملاقات ہوئی اس نے حال پوچھا۔ برہمن نے کہا "نیکو وخوش می گذرد" یعنی خوب گذر رہی ہے، دوست نے کہا ہر چیز تو

[1] تنخواہ کے رک جانے کی وجہ سے پریشان تھی [2] ایک برہمن تھا جو بہت مال و دولت رکھتا تھا

تمہاری چھن گئی' خوشی ترا از کجاست[1]' جواب میں برہمن نے یہ فقرہ کہا "زنار من با من ست" میرا جنیو تو میرے ساتھ ہے' امیر حسن کہتے ہیں کہ اس فقرہ نے میرے دل کو ہلکا کر دیا خیال یہی ہوا کہ :-

از توقف مواجب دنایافت اسباب دنیا	تنخواہ کے رک جانے اور دنیا کے اسباب نہ ملنے کی
ہیچ غم نمی باید خورد اگر ہمہ جہان برود	وجہ سے غمزدہ نہ ہونا چاہیے' اگر ساری دنیا لٹ
کے نیست محبت حق می باید کہ برقرار باشد	جائے کوئی خطرہ نہیں ہے اللہ تعالی کی محبت چاہیے
بندہ تقریب آں تقریر ہمیں تصور کرد	اور اسے برقرار رہنا چاہیے۔ بندہ نے اس
(ص ۵۶)	تقریر سے یہی اثر لیا'

ایک سادھو کا قصہ عبرت دلانے کے لیے اسی قسم کے ایک واقعہ کا ذکر مخدوم الملک شاہ شرف الدین یحیٰی منیری کے ملفوظات میں بھی ہے حضرت فرماتے ہیں کہ ایک تارک الدنیا سادھو" درراجگیر رسیدہ بود" راجگیر اس مقام کا نام ہے جہاں حضرت والا ریاضت و مجاہدہ میں ایک مدت تک مشغول رہے تھے۔ چند پہاڑیاں ہیں جن سے گرم اور سرد چشمے نا یادگار زمانہ سے ابلتے رہتے ہیں' ایک گرم چشمہ اس وقت تک مخدوم کنڈ کے نام سے حضرت والا کی طرف منسوب ہے موجودہ قصبہ بہار سے بجانب مغرب جنوب راجگیر کی یہ پہاڑیاں ہیں' بہر حال حضرت یہ فرماتے ہیں کہ سادھو" :-

بتے از سنگ تراشیدہ از دست چپ گرفتہ	سادھو پتھر کا ایک بت بائیں ہاتھ میں
استادہ ناخنہا چناں بزرگ شدہ گرگرد برگرد	لیے کھڑا تھا اس کے ناخن بڑھ کر مڑ مڑ
دست پیچیدہ'	گئے تھے!

الغرض اس بت کو مٹھی میں دبائے یہ جوگی سالہا سال سے یوں ہی کھڑا ہوا تھا:-

" ستنجا پائی کرد"	استنجا اپنے پاؤں پر کیا کرتا تھا"

---

(۱) تجھے خوشی کہاں سے ہے؟

ناگاہ ایک دن مٹھی کھل گئی، بت گر گیا حضرت کا چشم دید واقعہ ہے کہ سادھو بہ نشست کھڑا تھا بیٹھ گیا و آغاز کرد کہ:۔

"من چندیں سال ترا پیش نظر می دارم	اتنے سال سے میں تم کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا اور
و از عشق و محبت تو ہمہ را ترک دادہ ام	تیرے عشق و محبت میں سب کو چھوڑ رکھا تھا اب اگر تمہیں
اکنوں اگر تو مرا دوست داشتی از من	مجھ سے دوستی ہے تو مجھ سے جدائی اختیار نہ کرنا
جدائی شدی پس ہر گاہ مرا دوست نمی	چاہیے تھی پس جس وقت تم نے میری دوستی ختم کردی
داری مرا زیستن نہ شاید در حال کارد	پھر مجھے جینا نہیں چاہیے پھر فوراً ایک چھری
لبستد ہمانجا حلق خود را بہ برید"	لی اور وہیں اپنا حلق کاٹ ڈالا۔

اور مر گیا مخدوم نے اس قصہ کو بیان کر کے فرمایا"

ہندوے در محبت سنگ پر کالہ ایں چنیں	ایک ہندو ایک معمولی پتھر کے لیے ایسا کر سکتا
می کند مومن در دین حق اگر ایں چنیں کند	ہے تو اگر مسلمان دین حق کے لیے ایسا کرے
چہ عجب" (ص ۷۵، معدن المعانی)	تو حیرت کی کیا بات ہے،'

خلاصہ یہ ہے کہ ان جوگیوں کا ذکر جن کی مجلسوں میں اس حیثیت سے آتا ہو خیال کرنے کی بات ہے کہ ان ہی کے مسلک و مشرب کے کیا وہی لوگ پیرو ہو سکتے ہیں؟

غلط پروپیگنڈا واقعہ تو یہ ہے کہ بول چال کی عام زبانوں کے سوا جس کا مرکز ابو الفضل آئین اکبری میں[1] دلی کو بتاتا ہے صوفیاء ہند کے اساطین

---

[1] ابو الفضل نے آئین اکبری میں ہندوستان کی زبانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بڑی اچھی تقسیم پیش کی ہے اس نے لکھا ہے کہ اس ملک کے لوگ "بلغراداں زباں می سرایند لیکن ان زبانوں" میں جو اختلافات ہیں ان کی نوعیت دو قسم کی ہے اختلافات کی ایک شکل تو وہ ہے کہ باوجود اختلاف کے یہ اختلاف باہمی افہام و تفہیم میں مانع نہیں ہوتا یعنی ہر ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں "آں اختلاف کہ از فہمیدگی یک دیگر باز دارد از شمارہ بیرون" اور واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے اختلافات ہوا اگر [illegible] کیا جائے تو [illegible] اور ان [illegible]
(باقی [illegible])

و اکابر کو عموماً ہندوؤں کی کسی علمی زبان سے بھی واقفیت نہ تھی' ان پر یہ کتنا بڑا ظلم توڑا گیا ہے کہ ان کی ساری زندگی کو ہندوستان کے تصوف کا عکس قرار دیا جاتا ہے' میں تو اب تک بھی نہ سمجھ سکا کہ ہمارے بزرگوں کی طرف یہ بات جو منسوب کی جاتی ہے کہ انھوں نے ہندوؤں سے تصوف کا فن سیکھا تھا آخر اس کے ثبوت میں لوگ کہتے کیا ہیں؟ یا یوں ہی کسی نے ایک بات اڑادی' اور بے سمجھے لوگوں نے اسے دوہرانا شروع کیا' آخر کوئی بات تو مشترک پیدا کی جاتی' اتنا بھی یہ لوگ نہیں سوچتے کہ اُس زمانہ میں مسلمان اس ملک کے حاکم تھے' عام طور پر حاکم قوموں میں اپنی رفعت و بلندی کا جو شعور رہتا ہے وہ محکوم قوموں کی چیزوں کی طرف متوجہ ہونے کب دیتا ہے' کسی چیز کی کس مپرسی کے لیے ہر زمانہ میں یہ بات کافی سمجھی گئی ہے کہ اس کا تعلق محکوم قوم سے ہے' آج خود ہم مسلمانوں کا کیا حال ہے

رہاتی صفر، ۷کا) آتا ہے کہ ہر بارہ سال پر زبانوں میں اس قسم کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے' لیکن باوجود اس اختلاف کے جب باہم ایک دوسرے کی سمجھ لیتے ہیں تو ایک ہی زبان سمجھی جائے گی. دوسری قسم وہ ہے کہ اختلاف کی وجہ سے ان مختلف زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتے' اسی کا نام اس نے "آنچہ نیارند دریافتن" رکھا ہے' اختلاف کی آخری قسم کو پیش نظر رکھ کر اکبر کے زمانہ میں ہندوستان کی مختلف بولیوں کی تقسیم ان کے مختلف مرکزوں کے اعتبار سے مابی الفاظ کرتا ہے۔

دلی، بنگالہ، ملتان، مارواڑ، گجرات، تلنگانہ، مرہٹہ، کرناٹک، سندھ، افغانستان شال (کہ میان سندھ و کابل و قندہار است)، بلوچستان، کشمیر۔

جن زبانوں میں اس قسم کا اختلاف ہے کہ ان کے بولنے والے ایک دوسرے کی نہیں سمجھ سکتے' ابوالفضل کے حساب سے عہد اکبری میں ان کی تیرہ قسمیں تھیں جن میں بارہ قسمیں ایک طرف اور دلی کی زبان ایک طرف' جس کا حاصل یہ ہوا کہ ان بارہ علاقوں کے سوا سارے ہندوستان کی زبان اسی زمانہ سے ایک تھی' مقامی اختلافات سے اس زبان کی وحدت متاثر نہیں ہوتی تھی' آج کل اس کو ہم اردو کہتے ہیں جس کی صحیح تعبیر "از فہمیدگی یک دگر باز ندارد" ابوالفضل نے جو کی ہے بالکل صحیح ہے۔[۱۲]

ہماری حکومیت ہماری پوری زندگی کی تحقیر وتوہین کے لیے کافی ہے دوسروں میں نہیں خود اپنوں میں جب مسلمانوں کی وضع قطع شکل وصورت آج جس نگاہ سے دیکھی جارہی ہے اسی سے اندازہ کیجئے کہ اس زمانہ میں ہندوؤں کی کن کن چیزوں کی مسلمانوں کی نظروں میں کیا قیمت ہوگی۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر مسلمان صوفیہ نے سب کچھ ہندو سادھوؤں اور سنیاسیوں سے اخذ کیا تھا تو آخر جب اکبر نے اپنا رحجان ہندو مذہب کی جانب ظاہر کیا تو اس کی مخالفت میں سب سے پیش پیش وہی لوگ کیوں تھے جن کا تعلق مسلمانوں میں طبقہ صوفیہ سے تھا۔

مُلا عبدالقادر رہوں یا حضرت شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی یہی لوگ تو اکبری دین کی مخالفت کے علمبرداروں میں ہیں، ظاہر ہے کہ دونوں ہی صوفی المشرب ہیں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تو خیر کچھ کہا بھی کہا جا سکتا ہے، ملا عبدالقادر کی تو پوری زندگی صوفیوں کی ہے، وہی مسلک ہے وہی مشرب ہے جو ہندوستانی صوفی رکھتے تھے، لیکن اکبر کی مخالفت میں ان سے زیادہ بدنام کون ہے۔ اگر وہی خیال سچ ہوتا جیسے آج پھیلایا جارہا ہے تو ہندی صوفیوں کے تو دل کی بات تھی جسے اکبر بزور حکومت انجام دینا چاہتا تھا۔

ہندوستان کے خواجگان چشت کا تصوف

بہرحال اب تک تو اس بے بنیاد بے بنیاد ہوا بات کی تردید میں میں نے چند سلبی اور منفی قرائن کا ذکر کیا ہے، دراصل جس کا ذکر مقصود تھا، اب اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ یوں تو رفتہ رفتہ ان چھ سات صدیوں میں جب سے ہندوستان باضابطہ دارالاسلام بنایا گیا، مختلف زمانوں میں اسلامی تصوف کے مختلف سلاسل اور طرق

کے اولیاء اللہ اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس سرزمین کو سرفراز فرماتے رہے، اور اب تو یہ واقعہ ہے کہ مشہور خانوادوں میں شاید ہی اب کوئی خانوادہ باقی ہوگا جس میں منسلک ہونے والے لوگ اس ملک میں نہ پائے جاتے ہوں، خصوصاً قادریہ اور نقشبندیہ اور اس کے بعد سہروردیہ سلسلوں نے اس ملک میں خاصی مقبولیت حاصل کی۔

لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ پہلا قدم مبارک جس بزرگ کا ایک خاص شانِ آن بان سے اس ملک میں آیا وہ حضرت خواجہ بزرگ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات با برکات ہے، آج ہی نہیں اسی صدی میں یہ اشعار تقریباً ہندی مسلمانوں کے گھر گھر میں پڑھے جاتے تھے۔

آنجا کہ بود نعرۂ فریاد مشرکاں	اکنوں خروش نعرۂ اللہ اکبر است
جہاں مشرکوں کی دہائی کی آواز تھی	اب وہاں اللہ اکبر کی آواز کی گونج ہے

سمجھا جاتا تھا کہ یہ خواجہ بزرگ کے قدموں ہی کی برکت کا نتیجہ ہے۔

بس میں اب بتانا چاہتا ہوں کہ صوفیہ کے جس طریقہ کا نام طریقۂ چشتیہ ہے اور جس کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ جیسے نقشبندیہ کا مرکز بخارا اور ترکستان شاذلیہ کا مغرب اور تیونس، سہروردیہ کا بغداد، بدویہ کا مصر ہے اسی طرح چشتیہ طریقہ کو کچھ ہندوستان کے ساتھ خصوصیت ہے[1]۔

سلسلۂ چشتیت اور مسئلۂ سماع اس زمانہ میں چشتی اور چشتیت کے مفہوم کو کچھ گانے بجانے، چنگ و نے، دف و چغانہ کے ساتھ کچھ اس طرح

---

[1] میں نے قادریہ کا ذکر اس سلسلہ میں قصداً اس لیے نہیں کیا کہ جہاں تک میرا خیال ہے، طریقۂ قادریہ کو کسی اسلامی ملک سے کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے بلکہ جہاں جہاں اسلام ہے قادریہ طریقہ بھی وہاں اس کے ساتھ پہنچا ہے یہ حضرت سیدنا شیخ جیلی رضی اللہ عنہ کی جلالت قدر کا اثر ہے کہ وہ سارے اسلامی ممالک پر حاوی ہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ قدمی علیٰ رقبۃ کل ولی کا شاید یہی مطلب ہو۔ ۱۳۔

لازم کر دیا گیا ہے کہ لفظ چشتی کے بولتے کے ساتھ ہی گویا مخاطب کا ذہن رقص و سرود کے ان ہی سامانوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ کہ سماع کا تعلق چشتی طریقہ سے کیا ہے اس کا ذکر تو انشاء اللہ آخر میں کروں گا۔ لیکن اس زمانہ میں تحقیق و مطالعہ کے بغیر کسی معمولی مناسبت کو واسطہ بنا کر جو نتائج پیدا کیے جاتے ہیں حتیٰ کہ استدلال کے اسی طرز جدید کا نتیجہ ہے کہ انسان اور بندروں میں صوری مشابہت جو پائی جاتی ہے محض اسی مشابہت کو واسطہ بنا کر مسئلہ ارتقاء پر لائبریریاں تیار کر دی گئی ہیں' یہ عہد جدید کا خاص لطیفہ ہے۔

تصوف کو جوگیت قرار دینے والے تو خیر وہ لوگ تھے جنہیں صوفیاء اور تصوف سے ہمدردی نہیں ہے لیکن اس غریب تصوف کے غمگساروں نے بھی غمگساری کا جو فرض ادا کیا ہے اس کی ایک مثال وہی توجیہ ہو سکتی ہے جو طریقۂ چشتیہ' میں گانے بجانے کے رواج کو پاکر اس زمانہ میں بکثرت مختلف الفاظ میں مختلف دائروں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے' یعنی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان ایک خاص قسم کا ملک تھا۔ یہاں کے عام باشندوں میں موسیقی سرود و نغمہ وغیرہ کا شدید میلان پایا جاتا تھا' باشندگانِ ملک میں رقاصی اور نغمہ نوازی کے اسی میلان کو دیکھ کر بزرگانِ چشت نے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے یہ مناسب خیال کیا کہ ان کے اس مذاق سے نفع اٹھایا جائے' اور یوں چشتی طریقہ میں اسی مصلحت سے گانے بجانے کو مروج کیا گیا' نادان دوستوں کی ذہانت کی داد دینی چاہیے اور اس سے بھی زیادہ اس ہمت کی کہ بنیاد ہو یا نہ ہو لیکن دماغ میں جو خیال آگیا اس کے آگے بڑھانے میں ان لوگوں کو کوئی جھجک نہیں ہوتی۔

کچھ نہیں تو کم از کم ایک ہی واقعہ سہی ان لوگوں کو کہیں ایسا مل جاتا کہ ایک ہندو محض صوفیوں کی محفل کے گانے سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا تو کہا جا سکتا تھا کہ اس

زمانہ میں اس قسم کی جزئیات سے کلیات بنانے کا جب عام رواج ہی ہے تو کیا مضائقہ ہے کہ ایک جزئی واقعہ سے کلی توجیہ پیدا کرلی گئی، مگر میں جانتا ہوں اس سلسلہ میں ان کے پاس ایک واقعہ بھی تو نہیں ہے۔ اب اسے میں صرف شاعری نہ سمجھوں تو اور کیا سمجھوں، اور شاعری میں بھی بہرحال تشبیہ اور استعارہ کی وجہ شبہ ہوتی ہے، یہاں تو وہ بھی نہیں۔

یورپ اور ناچ گانا

میں نہیں سمجھتا کہ یہ گانے بجانے کو ہندوستان کی فطرت کے ساتھ آخر کس بنیاد پر مخصوص سمجھا جارہا ہے، دنیا کی کون سی قوم، کون سا ملک ہے جہاں کے لوگوں میں اس کا ذوق نہیں، ہم تو سنتے ہیں کہ عرب کا اونٹ بھی گانے سے متاثر ہوتا اور تال و سُر پہچانتا ہے، پھر کتا ہے آپ جنگلی جزیروں میں چلے جائیے بش مینوں اور صحرائیوں کو پائیے گا کہ ٹھیک اسی طریقہ سے جیسے ہندوستان کے عوام گلے میں ڈھول ڈالے ناچتے، گاتے، بجاتے، اچھلتے پھاندتے پھرتے ہیں، بجنسہٖ اسی شکل اسی صورت میں وہ بھی گاتے بجاتے اچھلتے پھاندتے ہیں۔ پھر اس ملک کی اس مسئلہ میں کوئی خاص خصوصیت کیا ہے، سمجھ میں نہ آیا، یورپ با ایں ہمہ دعوئے تہذیب و شائستگی اب بھی ناچتا ہے، گاتا ہے، بجاتا ہے، بلکہ ہندوستان نے تو شاید گانے بجانے کے آلات کے ایجاد کرنے میں وہ کمالات کبھی نہیں دکھائے ہیں، جو یورپ آج ہی نہیں ہمیشہ سے دکھلا رہا ہے، آپ تاریخوں کو اٹھا کر پڑھیے تو نظر آئے گا کہ شروع شروع میں یورپ کے باشندے جو اس ملک میں آئے ہیں تو نچنیے بھینیے اور تماشا گروں کی ہی حیثیت سے آئے ہیں، تاجروں اور سوداگروں کا بھیس تو انھوں نے بعد کو بدلا ہے، ابتدا میں ان کی طرف توجہ ہندی بادشاہوں کو ان کے خاص خاص باجوں ہی کی وجہ سے ہوئی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ مجدد الف ثانی والے مقالے میں بعض چیزیں اس سلسلہ میں میں نے نقل بھی کی ہیں، رہا

فنی حیثیت سے میوزک کا علم ہندوؤں میں ضرور تھا لیکن اس سے پہلے مسلمانوں میں یہ چیز یونانیوں کی راہ سے آچکی تھی اور عباسی خلافت ہی کے زمانہ سے اس فن میں مسلمانوں کے عیاش امیروں نے اتنی سرپرستی کی تھی کہ اس میں بھی کوئی خاص فضیلت اس ملک کو باقی نہ رہی تھی اور ہو بھی تو اس کا تعلق خواص سے تھا۔ اور یہاں تو کہا جاتا ہے کہ گلے میں ڈھول ڈال کر عام طور پر جو ہندوستان میں عوام ادھر ادھر ناچتے بجاتے پھرتے ہیں، ان کو مائل کرنا مقصود تھا۔

گانوں سے تبلیغ نہیں ہوتی

واقعہ یہ ہے کہ "تبلیغ اسلام" کا مسئلہ نہ اتنا آسان تھا اور نہ ہے کہ صرف چند غزلوں کے الاپنے سے اس میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہو، اور نہ ہندو اتنے بے وقوف تھے کہ وہ صرف گانے پر شیفتہ ہو کر اپنے آبائی دین اور دھرم کو چھوڑ دیتے، گانا بجانا تو بڑی چیز ہے، آپ جن بزرگوں کو متہم فرما رہے ہیں کہ انھوں نے تبلیغ اسلام کی راہ یہ نکالی تھی اس کی تائید میں تو کوئی چیز آپ پیش نہیں کر سکتے لیکن میں آپ کی خدمت میں تجربہ کی وہ بات پیش کرتا ہوں جو ہندو قوم کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد "طریقۂ چشتیہ" کے رکن اعظم حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا تھا فوائد الفواد میں ہے، ایک غلام جو مسلمان تھا وہ حضرت کی مجلس مبارک میں حاضر ہوا اور :-

"یک ہندوے در برابر خود آورد وگفت	اپنے برابر ایک ہندو کو لا کر بٹھایا اور
کہ ایں برادر من است	کہا یہ میرا بھائی ہے۔

جب دونوں بیٹھ گئے تو جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ :-

خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر ازاں غلام پرسید کہ	غلام سے خواجہ نے پوچھا کہ یہ تیرا بھائی کچھ
ایں برادر تو ہیچ میلے بہ مسلمانی دارد	اسلام کی طرف انسیت بھی رکھتا ہے،

جواب میں اس مسلمان غلام نے عرض کیا کہ :-

ادرا تحت انعام بجہت ایں معنی آوردہ ام	اس کو اسی مقصد سے یہاں لایا ہوں کہ آں مخدوم

تا بہ برکت نظر مخدوم مسلمان شود — کی نظر کی برکت سے اسلام کی دولت سے مالا مال ہو سکے

اس مسلمان غلام سے یہ سننا تھا کہ جامع ملفوظات کہتے ہیں :۔

خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر چشم پر آب کرد — حضرت والا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

کیا خیال آیا ' ظاہر ہے کہ اس غریب ہندو بیچارے کے انجام کا خیال آیا اور اسی کے ساتھ اپنی بے بسی کا ' جس کا اظہار حضرت ہی ان الفاظ میں فرماتے ہیں :۔

۔ فرمود کہ ایں قوم را چنداں بگفت کسے — یعنی صرف باتوں سے کوئی چاہے کہ ہندو قوم

دل نہ گرود ؟ — کے دل کو ان کے دھرم سے پھیر دے ' یہ مشکل ہے۔

یہ تھی پتہ کی وہ بات جو وہی کہہ سکتا ہے جسے اس راہ کا کچھ تجربہ ہو ' اور کچھ دن اس مسئلہ کو اس نے سوچا ہو ' واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے عوام اپنے خواص کے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے ہیں ' ہر انقلابی اقدام میں ان کی نظر ان ہی لوگوں پر رہتی ہے جن کے ہاتھ میں اس ملک کی باگ ہے ' میری مراد برہمنوں سے ہے ' اور برہمنوں کا حال یہ ہے کہ ان کو کوئی گا بجا کر کیا مسلمان کر سکتا ہے ' ان کا تو کسی کی تقریر اور تحریر سے بھی متاثر ہونا آسان نہیں ہے۔ آپ ان کے سامنے مذہب کو جس حد تک بھی فلسفہ بنا کر پیش کیجئے ' وہ آپ کے سامنے اس سے زیادہ فلسفیانہ گفتگو شروع کر دیں گے۔ اس قسم کی مذہبی اور دینی تقریروں کی اس ملک میں کیا کمی ہے ' ان برہمنوں کو ہزار ہا ہزار سال اطمینان کے ساتھ روٹی کھانے کا موقع ملا ہے ' ان پر نہ حکومتوں کے بدلنے کا اثر پڑتا تھا نہ سلطنتوں کے ' کیوں کہ ایک راجہ کو مار کر دوسرا راجہ اگر گدی پر بیٹھتا تھا تو برہمن کی خدمت اس پر اسی طرح واجب ہوتی تھی جتنی پہلے پر۔

مذہب کو فلسفہ بنانے کا کام

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مذہب کو فلسفہ بنانے کا کام ہندوستان میں بڑے اطمینان سے انجام دیا گیا ہے ' اپنشد جیسے دیکھ دیکھ کر آج یورپ بھی حیران ہے ' وہ کیا ہے ؟ کیا واقعی خالص کوئی فلسفہ ہے ؟ یقیناً وہ

مذہب سے جسے فلسفہ بنایا گیا ہے، وہ منہ لن ترانیاں ہیں اور دور کی کوڑیوں کے لانے
کی کوشش کی گئی ہے کہ آج ہندو فلسفہ کی کتابوں سے ہر اس فلسفہ کا طلسم کھڑا کیا جا
سکتا ہے جو یونانیوں نے بلکہ آج میٹافزکس (مابعد الطبیعیات) کے مسائل میں یورپ نے پیدا
کیا ہے۔ اسی طرح اگر آپ مذہب کو قصہ کہانی کی شکل میں جس میں خوارق اور عجائب کا
ذکر ہو اگر ان کے سامنے پیش کریں گے تو وہ آپ کے آگے اس سے بھی عجیب تر چیزوں کو
اپنے پرانوں اور مہابھارت، رامائن وغیرہ سے اخذ کر کے رکھ دیں گے[1]۔ اور عام طور پر غلط
طریقہ سے مذہب کی تبلیغ کی جب کوشش کی گئی ہے تو عموماً یہی دو راہیں اختیار کی جاتی ہیں
مذہب کو فلسفہ بنایا جاتا ہے یا مذہب کو خیالی انسانوں، محیر العقول خوارق اور عجیب طرازیوں
سے بھر کر پیش کیا جاتا ہے، ہندوؤں کا حال یہ ہے کہ ان میدانوں میں وہ آگے بڑھے ہوئے
ہیں بلکہ اس ملک کے عام باشندے برہمنوں کے جن پنجوں میں ہزارہا سال سے گرفتار ہیں
اس کی وجہ بھی یہ ہے یہی دو حربے ہیں جن میں اپنشد اسے تو سوچنے والے ارباب فکر کو
گھیر لیا جاتا ہے، ان کے سامنے وہ آسمان وزمین کی باتیں سنائی جاتی ہیں کہ بہرحال انھیں
اپنی عقلی پرواز کی درماندگی کا اقرار کرنا پڑتا ہے، اور پرانوں کے عجیب وغریب قصوں کا
پھندا عوام کے گلوں میں پڑا ہوا ہے، بڑے سے بڑا معجزہ بڑی سے بڑی کرامت جو سوچی جا
سکتی ہے وہ آپ کو ان کی کتابوں کے ورق ورق پر ملیں گی۔ بھلا عامیوں کا جو گروہ اس
کو سنے ہوئے ہے اس پر واقعی معجزات اور کرامات کا کیا اثر پڑ سکتا ہے، آپ تو واقعہ بیان

[1] کچھ نہیں تو مہابھارت ہی پڑھیے، جا بجا کسی درخت کا اچانک آدمی ہو جانا، آدمی کا درخت ہو جانا، لڑکیوں
کا جوان اجودوں کا لڑکوں کی صورت اختیار کرنا، لکڑی کا تلوار کی صورت، تلوار کا لکڑی بن جانا، غرض
ہر ناممکن کو ممکن ہی نہیں بلکہ قدم قدم میں واقعہ کی شکل اختیار کرتے ہوئے آپ اس کتاب میں پائیں گے
اس کے ماسوا دیگر قصص وحکایات کا تقریباً ایک ایسا ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے جس میں مذہبی رنگ
کی شرکت ہے اور اس کو واقعیت کا درجہ مل چکا ہے۔

کریں گے، اور وہاں یہ کیا گیا ہے کہ جس قسم کے مستحیلات دنا ممکنات عقل سوچ سکتی ہے سب ہی کے متعلق لکھ دیا گیا ہے کہ ہمارے یہاں واقع ہو چکا ہے. خیال کرنے کی بات ہے کہ جس قوم کی نفسیاتی حالت یہ ہو اس کے متعلق یہ کتنی پھسپھسی بوی بات ہو گی کہ بہشتی نقرار گا بجا کر ان کو مسلمان کرنا چاہتے تھے یا اس ذریعہ سے ان کو مسلمان کرنے میں وہ کامیاب ہوئے، مگر یہ تو آپ فرماتے ہیں، یعنی جنہوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ اس ملک کے غریب ہندوؤں کے متعلق ہم پر کوئی فریضہ عائد ہوتا ہے بھی یا نہیں۔

ہمارا فریضہ اور نسلِ انسانی کی گمراہی

جس کا سینہ نسلِ آدم کی اتنی بڑی تعداد کی گمراہیوں کو دیکھ کر شق ہوا جاتا تھا آپ نے دیکھا کہ ذکر کے ساتھ ہی وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا، اور اس قوم کے متعلق جو صحیح تشخیص ہو سکتی تھی اس کا اظہار ان مختصر الفاظ میں کیا گیا، یعنی صرف باتوں سے ان کو مسلمان کرنا آسان نہیں ہے، باتوں کی تو ان کے یہاں بھی کوئی کمی نہیں ہے، اور ہر طرح کی باتوں کی، یہ تو اس قوم کے متعلق منفی رائے ہوئی، رہی یہ بات کہ پھر اسلام سے روشناس کرانے کی آج کوئی تدبیر ہندوؤں کے لیے ہے بھی، یا نہیں، سلطان المشائخؒ نے اس کے بعد اس کا بھی جواب دیا ہے، اسی کے بعد ارشاد ہے:

اما اگر صحبت سالحے بیابد امید باشد کہ بہ برکت صحبت او مسلمان شود (ص ۱۸۲)	لیکن اگر کسی نیک اور صالح مسلمان کی صحبت نصیب ہو جائے تو امید ہے کہ ان کی صحبت کی برکت سے وہ مسلمان ہو جائے۔

مقصد مبارک یہ ہے کہ بات کی حد تک تو ان کے یہاں کوئی خلا نہیں ہے، تو اس میں باہر سے کسی چیز کے بھرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ البتہ ایک چیز کی ان کے یہاں کمی ہے، یعنی باوجود سب کچھ ہونے کے چونکہ ہندوؤں کے پاس دین کا جو سرمایہ بھی ہے اس کی انتہا یقین پر نہیں ہوتی کیوں کہ یقین، ایسا یقین جس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہ ہو، اس کا

ہوگا ذریعہ ان کے پاس نہیں ہے پرانوں میں عجیب عجیب قصے ضرور ہیں، الف لیلہ سے بھی عجیب تر قصے، لیکن عوام کا خیال کچھ ہی ہو، ان کے خواص تو جانتے ہیں کہ مختلف زمانوں میں برہمنوں نے یہ قصے خود ہی گڑھ لیے ہیں، اور یہی حال اپنشدوں کا ہے کہ وہ فلسفہ ہے اور فلسفہ جو صرف مطمئن دماغوں کے مالیخولیا کا نام ہے، اس میں اور یقین میں تو آگ اور پانی کا تعلق ہے۔ وہ دوسروں میں ضرور یقین پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن خود یقین سے خالی ہوتا ہے اس لیے کہ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے بے دیکھے کہتا ہے، بے جانے کہتا ہے، آنکھیں بند کیے باتوں سے باتیں پیدا کرتا جاتا ہے، خیالات کی تعبیر کی بھی قوت اگر کسی میں اس خیالی پرداز کے ساتھ ہوئی بس یہی بنا بنایا فلسفہ ہے، ظاہر ہے کہ کہیں ان خیالی باتوں سے آدمی اپنے اندر کسی قطعی اور یقینی پہلو کا لازوال اذعان اور نہ ٹلنے والا اٹل اعتقاد پیدا کر سکتا ہے، دوسروں کے سامنے ممکن ہے اپنے الفاظ سے یہی باور کرانے کی کوشش کی لیکن اس کی مثال ٹھیک اس اندھے کی ہوگی جس کی آنکھ آفتاب کو نہیں دیکھ رہی ہے لیکن یوں ہی ایک خیال قائم کر کے کہ آفتاب نکل چکا ہوگا اعلان شروع کر دے کہ آفتاب کے نکلنے کا مجھے قطعی یقین ہے ممکن ہے کہ آفتاب واقع میں نکلا ہوا ہو بھی لیکن اندھا تو صرف ایک خیالی بات کہہ رہا ہے، اور جس کیفیت کی تعبیر وہ قطعی یقین سے کر رہا ہے وہ واقع میں قطعی یقین نہیں ہے۔

حقیقی روشنی سے ہندوؤں کی محرومی

یہی حال ہندوؤں کا ہے ان کے پاس فلسفہ بھی ہے اور ان کے پاس خوارق و نوادر کے قصوں کا عظیم الشان ذخیرہ بھی، لیکن جس سے یقین کی واقعی اور حقیقی روشنی آدمی کے دل میں پیدا ہوتی ہے، اس ذریعہ سے وہ محروم ہیں اور جب تک خود اپنے مسلّمات پر آدمی کو کامل یقین نہ ہو اس کی زندگی ان مسلّمات کے رنگ کو جیسا کہ چاہیے محسوس نہیں کرتی، اسی لیے مذہبی مسلّمات کا جو نتیجہ ہے یعنی "صلاح و تقویٰ" حقیقی معنوں میں یہ ان میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا، لمبی چوڑی باتوں کے باوجود فلسفیانہ عقائد رکھنے والوں کی

خانگی زندگی کا جب جائزہ آپ لیں گے، اس کو ان کے عقائد کے مطابق بہت کم پائیں گے۔

ہندوستان کے مذہبی پیشواؤں کا اصلاح وتقویٰ کے لحاظ سے کیا حال ہے اس کا تجربہ بہ نسبت دوسروں کے خود ان کی قوم کے لوگوں کو زیادہ ہوسکتا ہے، کچھ نہیں تو ان کے گھر کے بھیدی خود پنڈت دیانند جی سرسوتی مہاراج ہیں، آپ ان کی کتاب ستیارتھ پرکاش ہی اٹھا کر پڑھ لیجئے، برہمنوں کی اندرونی زندگی کی ناگفتہ بہ مفصل رپورٹ اسی میں آپ کو مل سکتی ہے اور یقین کی محرومی کا قصہ کچھ بیچارے برہمنوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں، آج دنیا میں جتنی بھی مذہبی قومیں ہیں مثلاً یہودی نصرانی بودھسٹ پارسی وغیرہ، سب ہی کا یہی حال ہے، جس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہستی کا یہ معمہ ایک راز ہے جس پر پردہ پڑا ہوا ہے، ایسا پردہ؟

کہ کس نکشود ونکشاید بحکمت ایں معمہ را

عقل کے ناخن اس گرہ کے کھولنے میں نہ پہلے کامیاب ہوئے نہ اب کامیاب ہیں نہ آئندہ ہو سکتے ہیں ایک گرہ کھلتی ہے کہ معًا گشت راز دگر آں راز گر افشامی کردمے[1] دے کر صرف ایک ہی صورت ہے کہ خود معمہ بنانے والا اپنی مہربانی سے اس "اٹھائے نہ بنے والے" پردہ کو اٹھا دے، اپنی پہیلی خود ہی سمجھا دے کہ اسی کے فیصلہ کے ساتھ خود ہم میں ہر شخص کے آغاز وانجام کا مسئلہ اٹکا ہوا ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ زمین کے کرہ پر جب سے انسانیت کی نمائش ہوئی ہے خالق کردگار کی طرف سے اس مہربانی کا ظہور بھی ان لوگوں

---

[1] اس زمانہ میں یوروپ والوں نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن میٹافزکس (فلسفہ مابعد الطبیعات) یا حقیقت کون کے مسائل مبدا و معاد کے متعلق اگناسٹک (ارتیابیت) کے فلسفہ کو انھوں نے خوب منقح کر کے رکھ دیا ہے گو تشکیک دنیا کے پرانے فلسفی نظریات میں ایک قدیم نظریہ ہے لیکن سنجیدگی کے ساتھ پہلے اس پر اتنی توجہ کبھی نہیں کی گئی تھی تشکیک دراصل انسانی جہل کا تحقق ہے، یہی یہیں اس علم کی راہ درست کرتا ہے جس سے معمہ کائنات حل ہو جاتا ہے۔

کے ذریعہ سے ہوتا رہا ہے، جنہیں خدا اپنا علم دیتا ہے۔ اور خدا کے اسی عطا کئے ہوئے جواب کو وہ عام انسانوں میں تقسیم کرتے ہیں، دنیا کی ساری قومیں اس کی شاہد ہیں کہ اس ذریعہ سے ان کے پاس بھی جواب آیا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ خدا کا بتایا ہوا جواب مختلف اسباب و وجوہ کے زیر اثر اپنی خالص حالت میں باقی نہیں ہے، اس تریاق میں زہر شریک ہو چکا ہے، انسانوں نے مختلف زمانوں میں اپنے مختلف خیالات کی اس میں آمیزش کی ہے، ایسی آمیزش، کہ ایک کو دوسرے سے اب جدا کرنا انسانی قوت کی حد پرواز سے خارج ہے[لہ]۔

حقیقی اطمینان صرف مسلمانوں کے پاس ہے

بس گو خدا کا بانٹا ہوا علم جیسے ہر زمانہ میں ہر قوم کو بخشا گیا تھا کسی نہ کسی صورت سے سب کے پاس موجود ہے، لیکن یقین کی جو کیفیت اس علم سے پیدا ہو سکتی تھی اس کی جس چیز میں حقیقی ضمانت پوشیدہ ہے اس کے فقدان نے یعنی بیرونی آمیزشوں نے اس تاثیر کو باطل کر دیا ہے، آدمی لاکھ ان کے ساتھ اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہے گا لیکن مطمئن نہیں ہو سکتا، ہو سکتا ہے کہ اپنی اس بے اطمینانی کا اسے شعور بھی نہ ہو لیکن یقین اور قطعیت سے جو اثر پیدا ہو سکتا ہے اس کی آفرینش اور تولید ہو ہی نہیں سکتی اور یہی ایک واحد چیز ہے، جو صرف مسلمانوں کے پاس ہے، جسے دوست ہی نہیں دشمن بھی جانتے ہیں۔

اخلاقی نظام سے کوئی محروم نہیں

ورنہ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں ایسا کون سا مذہب ہے جس کے پاس کوئی اخلاقی نظام نامہ نہیں ہے۔ کس مذہب میں جھوٹ، چوری، زنا،

لہ تفصیل کے لیے تو دنیا کے تمام مذاہب کی آسمانی کتابوں کی تحقیقی تاریخ کے مطالعہ کی ضرورت ہے، خاکسار نے اپنی کتاب النبی الخاتم کے شروع میں کچھ اشارے اس طرف کیے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس مطالعہ کے بغیر "ذلک الکتٰب لا ریب فیہ" کے قرآنی دعووں کی قیمت آدمی پر واضح ہی نہیں ہو سکتی کہ یہ عالم کی ساری لائبریریوں کے مقابلہ میں کھلا ہوا چیلنج ہے ۱۲۔

دغابازی، فریب کی اجازت دی گئی ہے اور راست بازی، دیانت، امانت، پارسائی، پاک دامنی کو حرام ٹھہرایا گیا ہے حتیٰ کہ خالص عباداتی چیزیں الصلوٰۃ، الزکوٰۃ، الصوم (روزہ) آپ کو قرآن ہی بتائے گا کہ قدیم سے قدیم دیانات وملل کے عناصر بھی یہی تھے انتہا یہ ہے الحج باستثناء اس کے کہ یہ ایک قدیم ابراہیمی نسک ہے، یوں بھی جب اقوام کے قبلے، کسی زمانہ میں یعنی ان ہی دنوں میں جب ہر قوم کے لیے ان کا مخصوص قومی نبی ہوتا تھا، قبلے بھی قومی تھے تو اس کی تردید کیسے ہوسکتی ہے کہ عیسائی یا یہودی پلگرمس اگر بیت المقدس میں جاتے تھے یا دنیا کی قومیں مختلف تیرتھ گاہوں کو جاتی تھیں، ان کی کوئی اصل نہ تھی۔[1]

عقیدۂ توحید رہا خالق کائنات اور اس کی توحید کا مسئلہ سو قرآن سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (کس نے آسمان وزمین پیدا کیے) کا سوال جس کسی سے بھی کیا جائے گا لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ وہ یہی کہیں گے اللہ، صرف خلق کی حد تک نہیں بلکہ تدبیر وتصرف کے کلی وجزئی اعمال بارش برسانا، روزی دینا ان ساری چیزوں کے متعلق بھی قرآن نے اعلان کیا ہے کہ یہ انسانی اعتقاد کے اجزاء عامہ ہیں یوں ہی مجازات ومکافات کا قانون جس شکل میں بھی ہو لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (یعنی آدمی کو اپنے اچھے کاموں کا نفع بھی پہنچتا ہے اور برے کاموں کا ضرر بھی) ان

[1] میں نے اپنے دیوبندی اساتذہ جس کا نام صحیح طور پر اس وقت محفوظ نہ رہا۔ یہ بھی سنا ہے کہ دیوبند کے سابق صدر مدرس حضرت مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ یعنی حکیم الامۃ رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ امام جو اپنے کشفی بیانات میں جماعت دیوبند میں خاص امتیاز رکھتے تھے کبھی کبھی یہ فرماتے کہ ہر دوارہ ہر بمعنی خدا دوارہ گویا یعنی بیت اللہ ہیں ہر کی پیڑی کے نام سے جو مقام موسوم ہے مجھے اس میں ایک لاہوتی نسبت محسوس ہوتی ہے الفاظ شاید کچھ اور ہوں لیکن معنی یہی تھے اور اس سے اس بات کی توثیق کہ "لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا نَبِيًّا" کا جب زمانہ تھا تو اس وقت بالکل ممکن ہے کہ اقوام کے قبلے جیسے مختلف تھے جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح ان کے مناسک کے مقامات بھی مختلف ہوں وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ والقصۃ بطولہا ۱۲

ساری باتوں کا آپ ہی بتائیے کہ دنیا کی کون سی قابل ذکر قوم منکر ہے، جب سارے اخلاقی قوانین، عباداتی عناصر، عقائد کے اصول سارے جہان کی قوموں میں مشترک ہیں تو آپ ہی غور کیجئے کہ قوموں کے مقابلہ میں آپ اسلام کا کیا امتیاز پیش کر سکتے ہیں؟ جزئیات نہ سہی کلیات میں تو سب آپ کے ساجھی اور شریک ہیں اور اس کا نیز علاوہ واقعات کے خود قرآن سے اس کا تو دعویٰ ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کو وہی دین دیا جا رہا ہے جو نوحؑ کو ابراہیمؑ کو موسیٰؑ عیسیٰؑ سب ہی کو دیا گیا تھا۔ قرآن میں وہی ہے جو صحف ابراہیمؑ[1] و موسیٰؑ میں تھا۔

قرآنِ مقدس

اب آپ ہی بتائیے کہ بجز ایک بات کے اگلوں کو جو کچھ خالق تعالیٰ جل مجدہ کی طرف سے عطا کیا گیا تھا، خالق کے ان علوم کے ساتھ مخلوقات کی دماغی آمیزشوں نے شریک ہو کر اس کو مشکوک اور قابل اعتماد باقی نہیں رکھا، ایسی کتاب جو خدا کے نام سے نسل آدم کو ان ہی صفات رکھنے والی ہستی کے ذریعہ سے سپرد کی گئی ہو جن صفات کی بنیاد پر قوموں نے اپنے اپنے رسولوں کو پیغمبروں کو دخشوروں کو یا اوتاروں کو مانا ہے، روئے زمین پر بنی آدم کے سارے گھرانوں اور امتوں میں قرآن کے سوا قطعاً کوئی دوسری کتاب ایسی باقی نہیں رہی ہے جو بغیر کسی کمی بیشی اور سر مو تفاوت کے ٹھیک اسی حال میں موجود ہو جس

[1] گو اس کی کوئی تصریحی دلیل تو میرے پاس نہیں ہے، لیکن تمام انبیاء میں صرف دو پیغمبروں کا یہاں انتخاب ایک اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسا خیال گزرتا ہے کہ مغربی ممالک عموماً مسیح علیہ السلام (جو موسوی دین ہی پر لوگوں کو قائم کرتے تھے) ان کو پیغمبر مانتے ہیں بلکہ ان کا عمل درآمد ان کی شریعت وہی موسیٰؑ کی شریعت ہے اور مشرقی اقوام ایرانی ہندی وغیرہ کے متعلق تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ ایرانی اپنا دخشور (پیغمبر) اول مہ آبا بانی کعبہ کو ٹھہراتے ہیں، ہندو وید کے متعلق مدعی ہیں کہ برہما کے منہ سے نکلا اسی بنیاد پر وید والے اپنے کو برہمن کہتے ہیں۔ نون آرین زبانوں میں یائے نسبت کا قائم مقام ہے گویا مغرب اور مشرق کے دیانات کی طرف بھی اس روایت میں ایما ہے۔ شیخ عبدالکریم جیلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الانسان الکامل" میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں دو قسم کے لوگ ہیں، عوام تو دشمنوں (بت پرستوں) کا گروہ ہے لیکن وہاں کے خواص براہمہ دین ابراہیمی کی یادگار ہیں ۱۲

حال میں دینے والے نے اسے دیا ہو۔ یہ ایسی کھلی ہوئی واضح بین حقیقت ہے کہ مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کا بھی اس پر اتفاق ہے جرمنی عالم وان ایہم کا یہ مشہور نقرہ ہے:۔

"ہم قرآن کو محمدؐ کا کلام ایسا ہی یقین کرتے ہیں جیسے مسلمان اس کو کلام الہٰی یقین کرتے ہیں۔ (اعجاز التنزیل ص۳)

کچھ عیسائیوں ہی کی یہ خصوصیت نہیں ہے جو بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ علی الاتصال عہد نبوت سے موجودہ انسانی نسلوں تک یہ کتاب اس شان کے ساتھ منتقل ہوتی چلی آئی ہے کہ درمیان میں سال دو سال تو کیا لمحہ دو لمحہ کے لیے بھی کوئی ایسا واقعہ نہیں پیش آیا جیسے یہودیوں اور عیسائیوں یا اسی قسم کی دوسری قوموں کی آسمانی کتابوں کو پیش آیا' یعنی متعدد صدیاں ان کتابوں پر ایسی گذری ہیں کہ ان کا دنیا میں نام و نشان نہ تھا' پھر کسی طریقہ سے ان کے نام و نشان کا پتہ چلایا گیا' خدانخواستہ قرآن کے ساتھ بھی اگر ایسا حادثہ پیش آتا کہ مسلمانوں سے (العیاذ باللہ) قرآن لمحہ دو لمحہ کے لیے بھی الگ ہو جاتا تو اس وقت شبہ کی گنجائش ہو سکتی تھی لیکن سب جانتے ہیں کہ کم از کم مسلمان اس تاریکی حادثہ میں اب تک تو بحمد اللہ مبتلا نہیں ہوئے ہیں اور انشاء اللہ باایں ہمہ سرد مہریاں جو غیر اقوام کے سیاسی اور ذہنی دباؤ سے آہ! کہ اپنی کتاب کے متعلق مسلمانوں میں محسوس ہو رہی ہیں، حفاظت قرآن کے ذمہ دار سے امید ہے کہ ان کو خدانخواستہ اس حال میں مبتلا نہ ہونے دے گا' بہر حال آئندہ سے نہیں گذشتہ اور حال کی جو نوعیت ہے، گفتگو اس میں ہو رہی ہے' یہ ایسا بدیہی واضح ناقابل تردید واقعہ ہے کہ دوست و دشمن کسی کے لیے مجال انکار نہیں۔

اسلام کا سب سے بڑا امتیاز اسی لیے میں اسلام کا سب سے بڑا امتیاز ہی یہ سمجھتا ہوں کہ خدا کی ان ہی باتوں کو جو غیر اقوام میں مشکوک و مشتبہ ہو گئی ہیں ان ہی کی تصحیح کر کے قرآن نے ان کو قطعی اور یقینی بنا دیا ہے۔ آپ اسلام میں یہ کیا تلاش کرتے

ہیں کہ وہ کیا نئی بات بتاتا ہے، وہ نئی بات کا مدعی ہی کب ہے بلکہ جو کچھ ڈھونڈتا ہے دنیا کے تمام ارباب مذاہب کو ڈھونڈھنا ہے وہ یہی ہے کہ معمۂ کائنات اور رازِ حیات کے جن بنیادی سوالات کے جوابات بیرونی آمیزشوں سے مشکوک ہو گئے ہیں ابدا ایسے مشکوک کتاب خدا کی بات کو آدمی کی بات سے آپ کسی طرح جدا نہیں کر سکتے "ناخن کو گوشت سے چھڑا نہیں سکتے" قرآن ان ہی بنیادی امور کا قطعی واضح غیر مشتبہ علم و یقین آپ کو عطا کرے گا! گویا دوسرے لفظوں میں ہر مذہب اور دین والے قرآن میں کسی جدید دین کو نہیں بلکہ اپنے اپنے آبائی دین ہی کو بجائے مشکوک حالت کے یقینی شکل میں پانا چاہیں تو پا سکتے ہیں یہودیوں کو حضرت موسیٰ کی عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ کی ابراہیمیوں کو حضرت ابراہیم کی نوحیوں کو حضرت نوح کی از یں قبیل ہر پیغمبر کی امت اپنے پیغمبروں کی تعلیم قرآن سے پا سکتی ہے اور بچھڑنے کے بعد قرآن کے ذریعے سے پھر اپنے اپنے پیغمبروں تک ہر امت واپس ہو سکتی ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوموں کو ان کے پیشواؤں سے توڑنے کے لیے نہیں بلکہ جوڑنے کے لیے آئے تھے، اور "مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ" اور "النبیین" کے خاتم کا حقیقی منصب ہے بھی یہی۔

غیر مسلموں کو یقین کی دولت حاصل نہیں

انتہائی دیانت داری اور بغیر کسی پاسداری کے میں اس کا اظہار کرتا ہوں کہ قرآن سے ہٹ کر جو لوگ اپنے اپنے مذاہب کے مسلمات اور تعلیمات کو مانتے ہیں، مانتے ضرور ہیں لیکن جسے واقعی یقین کہتے ہیں اس یقین کے ساتھ جزئیات مذہب کے عام تفصیلات ہی نہیں، بلکہ بنیادی امور کا بھی ماننا ان کے لیے ناممکن ہے، انسان بہرحال ایک عقلی فطرت ہے۔ ضد، ہٹ دھرمی، آبائیت جس کی تعبیر اس زمانہ میں قومی روایات یا کلچر[1] وغیرہ کے الفاظ سے کی جاتی ہے، ان جذبات

---

[1] یورپ نے انسانیت پر جہاں جیسیوں مظالم توڑے ہیں ان میں ایک بڑا ظلم اس حدیث العہد لفظ کلچر میں بھی چھپا ہوا ہے۔ قرآن سے پہلے کسی چیز یا مسلک یا طریقہ کی صداقت کی ایک بڑی دلیل یہ بھی (باقی اگلے صفحہ پر)

کے زور سے وہ لاکھ باور کرانا چاہیں کہ جو چیزیں مشکوک ہیں ہمیں ان پر اسی قسم کا یقین ہے جیسے واقعی یقینی ذرائع سے حاصل ہونے والے معلومات کو مانا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا جو آفتاب کو طلوع ہوتے ہوئے آنکھوں سے دیکھ کر مان رہا ہے اس کے یقین کی جو کیفیت ہوگی کیا اس کی برابری اس شخص کے ماننے کی کیفیت کر سکتی ہے جس نے یوں ہی بعض تخمینی قرائن سے باور کر لیا ہو کہ افق سے آفتاب سر باہر نکال چکا ہے۔

مذہب میں یقین کا مرتبہ

مذہب کی بنیاد جن امور پر قائم ہے، جب ان ہی کے متعلق واقعی شک یا یقین نا شک ہو تو پھر ان بنیادوں پر جو تفریعات اور نتائج و آثار پیدا ہوں گے ان کی گرفت میں بھی وہ قوت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو بنیادی امور کے قطعی علم والوں میں پیدا ہو سکتی ہے، آپ قرآن میں پڑھیے یہی راز ہے کہ ان ہی چند بنیادی امور جس پر مذہب کا چکر گھومتا ہے ان ہی کی یقین آفرینی کے لیے ان کو بار بار مختلف پیرائوں میں وہ دہراتا ہے، مثلاً حق تعالیٰ کے صفات و کمالات، قانون مجازاۃ، اور ان دونوں سے بھی زیادہ ذریعۂ علم یعنی رسول کی رسالت کی صداقت، چاہتا ہے کہ جس طرح ممکن ہو اس کا یقین انسانی فطرت میں محلول کر دیا جائے کہ سارا دار و مدار تو علم کے ذریعہ کی قوت اور وثاقت ہی پر ہے، سب کچھ ہو لیکن آنکھ نہ ہو تو ٹٹول ٹٹول کر آپ کن کن چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آنکھ روشن ہو چکی ہے اب کیا ہے جن چیزوں سے زندگی کا حقیقی تعلق ہے ان کو آنکھوں سے دیکھ لینے اور ان کے متعلق قطعی

(بقیہ صفحہ ۸۳ کا) حتیٰ کہ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا (جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا) یعنی جس پر اپنے باپ دادوں کو ہم نے پایا ہے یوں کہ یہ وہی ہے اس لیے سچ ہے۔ قرآن نے ڈانٹ ڈانٹ کر اس بیہودہ استدلال کی بنیاد کو مضمحل کیا۔ لوگ شرمانے لگے کہ صداقت کی دلیل میں باپ دادا کے طرزِ عمل کو پیش کریں لیکن یورپ نے پھر کلچر کا لفافہ ایسا عطا کیا ہے کہ اس میں لپیٹ کر بیہودہ سے بیہودہ بات پر اصرار کرنا ہر قوم کا گویا جائز قومی حق ہو گیا ہے حتیٰ کہ بھولے مسلمان بھی اب اسی کلچر کے نیچے اپنے دین کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ یا للعجب ۱۲

فیصلہ کن علم حاصل کر لینے کے بعد غیر اہم امور میں اگر تخمینہ اور قیاس سے بھی کام لیں تو ظن غالب بھی اس کے لیے کافی ہے لیکن بنیادی امور کو بھی بجائے قطعی اور یقینی بنانے کے جو لوگ صرف شک یا زیادہ سے زیادہ غالب گمان کی راہوں سے پار ہے ہیں بظاہر اپنے آپ کو لاکھ پائے ہووں میں باور کرائیں لیکن یقین کیجئے کہ قطعیت اور لاریبیت کی خنکی سے وہ محروم ہیں یہ انسانی فطرت کا اٹل قانون ہے۔ مذہب کے بنیادی امور اساسی حقائق کے قطعی لازوال یقین کی یہی دولت گرانمایہ ہے جس کا سرمایہ دار کرۂ زمین پر اسی خدا کی قسم جس نے قرآن نازل کیا ہے، قرآن اور صرف:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ	وہی کتاب ایسی ہے جس میں شک نہیں
مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔	کہ جہانوں کے مالک کی طرف سے آئی ہے۔

یہی کتاب ماننے والوں میں اس متعدی یقین کو پیدا کرتی ہے جو ماننے والوں سے نہ ماننے والوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔

قرآنی یقین کا ثمرہ

قرآنی یقین کے اسی آہنی لنگر سے صلاح و تقویٰ کی جو زندگی اور سیرت جکڑی رہتی ہے اسی میں اتنا زور ہوتا ہے کہ سارا فلسفہ سارے خوارق بے زور ہو کر بازو ڈال دیتے ہیں کہ بہرحال باہر میں کچھ بھی دعویٰ کیا جائے لیکن انسانی فطرت کی گہرائیوں میں نہ فلسفہ جڑیں جما سکتا ہے اور نہ عجائب و غرائب یا مافوق العادات قصے اور افسانے یقین کی اس گرفت اور عدم گرفت کا لوگوں میں شعور ہو یا نہ ہو لیکن انسانی فہم عامہ دونوں کے زور میں خطرناک فرق محسوس کرتی ہے مقابلہ کے وقت اس درخت کو سربسجود ہونا پڑتا ہے جس کی شاخیں، باہر میں چاہے جتنی بھی پھیلی ہوں لیکن اندر میں اس کی جڑیں جمی ہوئی نہیں ہیں خواہ لوگوں کو ہم سے اتفاق ہو لیکن میرے دماغ میں تو۔

ایں قوم (ہندو) بر اچنداں نگفت کسے دل   اس قوم (ہندو) کو جتنا بھی کہو کسی کا دل

نہ گردد اما اگر صحبتِ صالحے بیابد امید باشد کہ بہ برکت صحبت او مسلمان شود ص۱۸۲ | نہ بھرے گا۔ البتہ اگر کسی صالح مسلمان کی صحبت میسر آجائے، اس کی برکت سے مسلمان ہونے کی امید کی جاتی ہے۔

سلطان المشائخؒ کے قول سے یہی مطلب سمجھ میں آیا، بلکہ چنداں کے لفظ سے حضرتؒ نے ادھر بھی اشارہ فرمایا کہ یوں بطور بخت واتفاق "گفت" یعنی لیکچر، تقریر کی لفاظیوں سے بھی کبھی کوئی متاثر ہو جائے، لیکن جن حالات میں یہ قوم مبتلا ہے اس کا مقابلہ واقعی قرآنی یقین اور قرآنی یقین کے سوا یقین کی صورت ہی کیا ہے) سے پیدا ہونے والی سیرتِ صلاح و تقویٰ کی زندگی ہی کر سکتی ہے۔

لسانی وعظ و نصیحت

تجربہ بھی اس کا شاہد ہے "گفت" کے ذریعہ سے جن لوگوں نے اس قوم میں کام کرنا چاہا اولاً تو ان کو کامیابی ہی نہیں ہوئی اور الشاذ کالمعدوم کے طور پر بعضوں کو کبھی کامیابی ہوئی مثلاً شاہجہاں نامہ میں ملا محب علی سندھی کے متعلق لکھا ہے جس کا ترجمہ تاریخ برہان پور سے نقل کر رہا ہوں۔

"ملا محب علی اہل اسلام کی حاجت روائی میں بہت سعی کرتے تھے اور کفار کو ترغیب دین اسلام کی بذریعہ وعظ و نصائح وغیرہ دلایا کرتے تھے اور بادشاہ سے واسطے تقرر معاش نو مسلموں کے عرض کرا کے اجرا کراتے تھے۔" ص۱۴۷

واللہ اعلم ملا صاحب کو "گفت" کے اس طریقہ سے کس حد تک کامیابی ہوتی تھی لیکن خود آگے کا فقرہ "بادشاہ سے واسطے تقرر معاش نو مسلموں کے عرض کر کے اجرا کراتے تھے" خود دلالت کر رہا ہے کہ اسلام کی وہ تبلیغ جس سے اسلام لانے والوں کے لیے تقرر معاش کے اجرا کے واسطے بادشاہوں سے عرض کرنے کی ضرورت نہ ہو بلکہ خود اسلام لانے والے

فان ابی ووالدتی وعرضی لعرض محمد منکم فداء (حسان بن ثابت صحابی) | ترجمہ: میرے باپ ماں اور میری عزت و آبرو سب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت پر تم لوگوں کے مقابلہ میں قربان ہوں۔

کہتے ہوئے "اللہ رسول" کے سوا اپنا سب کچھ اسلام کے لیے حاضر کرنے پر آمادہ ہو جائیں یہ بات "گفت" والی تبلیغ میں حاصل نہیں ہو سکتی اور ظاہر ہے کہ وہ تبلیغ ہی کیا ہوئی جس کی کامیابی کے لیے پہلے شاہجہاں اور اورنگ زیب کے خزانوں کا انتظام کر لیا جائے[1]

خواجگانِ چشت کا محورِ عمل

اب دنیا مجھے خواہ بیجا خوش اعتقادی ہی کے ساتھ کیوں نہ متہم کرے ، جہاں تک میرے حقیر تتبع و تلاش کا تعلق ہے خواجگان چشت کا جو سلسلہ ہندوستان کے میدانوں میں خیمہ زن ہوا ان کے پاس تو کم از کم میں جس چیز کو سب سے بڑے کارگر حربہ کی حیثیت سے پاتا ہوں وہ حقیقی اور واقعی صلاح و تقویٰ پیدا کرنے والے یقین کی واحد ضامن کتاب مبین ہی کو پاتا ہوں ، جو دی ہی گئی ہے اس لیے کہ :-

یَّھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ	راہ دکھاتا ہے اس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو جو (واقعتاً یقین
اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ سُبُلَ	کی حقیقی روشنی میں ، اللہ کی رضامندی کو ڈھونڈتے ہیں (اور ان کاموں
السَّلٰمِ وَیُخْرِجُھُمْ	سے اعتماد اٹھا چکے ہیں جن میں خدا کے ساتھ غیر خدا کی رضامندی

[1] آج کل خصوصاً جب سے سرشماری پر حقوق کی بنیاد مغربی حکومت نے رکھ دی ہے ، تبلیغ اسلام کا لفظی ذوق مسلمانوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے ، اور اسکیمیں رہی سوچی جاتی ہیں جو عموماً پادری اپنے مشن کے چلانے میں اختیار کرتے ہیں ۔ لیکن بندگان خدا اتنا نہیں سوچتے کہ پادریوں کا تعلق یورپ و امریکہ کے جن سامو کاروں ، دولت مندوں اور حکومتوں سے ہے ۔ غریب ، محکوم مفلس مسلمان ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں ، آج وہ بیچارے سامان جو دانے کے محتاج ہیں ، اس پر بھی مسلمانوں کو جب پکارا جاتا ہے ، مذہب کے نام سے پکارنے والے پکارتے ہیں تو ان کی اکثریت اپنی جیب جھاڑنے کو تیار رہتی ہے ۔ افسوس کہ اس کا بھی صحیح مصرف نہیں لیا جاتا ۱۲ -

مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۝ (مائدہ ۷)

شریک ہوگئی ہے تاکہ وہ کتاب ان کو سلامتی کی راہوں پر ڈال دے اور نکالے ان کو (شک) کی اندھیریوں سے (یقین) کی روشنی میں (اپنی عقلی تجویزوں سے نہیں بلکہ) فرمان سے اللہ ہی کے اور لے چلتی ہے وہ کتاب سیدھی راہ پر)

ہندوستان کا تعلیمی نظام

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے مشائخ چشت قرآن کے سوا اور کچھ پڑھتے پڑھاتے ہی نہ تھے، ہندوستان کے تعلیمی نظام کے ذکر میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ یہاں کے تعلیمی میدان کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اسلامیات کے چند لازمی مضامین کے ساتھ ادب، لغت، فلسفہ، منطق، ریاضی، ہندسہ حتیٰ کہ موسیقی، السنۂ غیر وغیرہ سب ہی چیزیں شریک تھیں۔ اور یہ تو اسلامی عہد میں اس ملک میں مسلمانوں کے تعلیمی ماحول کا عام حال تھا" مشائخ چشت کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے غیر عالمانہ تصوف کی ان نگاہوں میں کوئی قیمت معلوم نہیں ہوتی، نہ بنگال کے شیخ الشیوخ شیخ سراج عثمان جن کا شاید پہلے بھی ذکر آچکا ہے، جب وہ اس راہ میں خدمت کرنے کے لیے آمادہ ہوئے جو مشائخ چشت کا اس ملک میں کاروبار تھا تو حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا۔"

"اول درجہ دریں کار علم است" (سیر الاولیاء ۲۸۸) — اس کام میں پہلا درجہ علم کا ہے۔

اور سلطان المشائخ کا یہ کوئی ذاتی خیال نہ تھا، ان کے شیخ حضرت فریدالدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی اسلامی تصوف اور درویشی کی بنیاد علم ہی پر قائم تھی، سلطان جی ہی ان سے ناقل ہیں کہ:

"درویش را قدرے علم باید ص۲۸۸" — فقیر راہ خدا کے درویش کو تھوڑا علم چاہیے

درس علوم کے بعد علم تصوف اور تجوید

"قدرے علم" کا کیا مطلب تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ سلطان المشائخ ان کی خدمت میں مروجہ درسی علوم

کے نصاب کو ختم کر کے گئے تھے' بلکہ فضل والے نصاب کو بھی انھوں نے تو پورا کر لیا تھا لیکن اس کے بعد بھی شیخ کبیر نے ان کو براہِ راست تمہید سالمی بھی اول سے آخر تک سبقاً سبقاً پڑھائی' عوارف بھی پڑھائی' اور اس سے بھی زیادہ یہ بات کہ خود شیخ کبیر شکر گنج نے سلطان المشائخ کو تجوید کی بھی تعلیم دی' حالاں کہ گذر چکا کہ سلطان المشائخ نے بچپن میں قرآن جس استاد سے بداؤں میں پڑھا تھا وہ نومسلم مقری شادی نامی تھے' جو خود قرأت سبعہ کے عالم تھے' لیکن باوجود اس کے بھی شیخ کبیر نے ضرورت محسوس کی کہ سلطان المشائخ کو صحیح تلفظ اور لہجہ کے ساتھ قرآن پڑھنا سکھائیں اور وہ ایک پارے نہیں' اس توجہ' انہماک' و اہمیت کو ملاحظہ کیجئے کہ چھ پارے کامل تجوید کے ساتھ شیخ کبیر نے سلطان جی کو پڑھائے اس کی تصریح تو مجھے نہیں ملی کہ لفظی تجوید کے ساتھ قرآن کے معانی اور مطالب بھی بیان کرتے تھے یا نہیں' واللہ اعلم بالصواب۔ البتہ الفاظ کی تجوید و تصحیح جس طریقہ سے ہوتی تھی' اس کا تذکرہ ملتا ہے' سلطان المشائخ ہی سے فوائد الفواد میں منقول ہے کہ:۔

"چوں من خواندن آغاز کردم مرا فرمود کہ الحمد	جب میں نے پڑھنا شروع کیا' مجھ سے فرمایا الحمد
بخاں چوں بخواندم و رسید ولا	پڑھو جب میں پڑھ کر ولا الضالین پر پہونچا' فرمایا ضاد
رسیدم فرمود ضاد ہم چنیں بخواں کہ من می خوانم"	اس طرح پڑھو جس طرح میں پڑھتا ہوں"۔

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ۔

"ہر چند کہ می خواستم نیامد"	میں نے بہت کچھ چاہا مگر ادا نہیں ہوا'

یعنی ضاد کا جو خالص عربی تلفظ ہے' جیسے عربوں سے ٹ' ڑ وغیرہ حروف کے ادا کرنے کے لیے زبان کو جہاں جانا چاہیے وہاں عادت نہ ہونے کی وجہ سے نہیں جاتی' اسی طرح ہندی نژاد کے لیے ضاد" کے حرف کا ادا کرنا عموماً سخت دشوار ہوتا ہے' یہی حال سلطان جی فرماتے ہیں کہ ہمارا تھا' لیکن شیخ کبیر کی معلوم ہوتا ہے کہ مشق بہت پختہ تھی'

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ صوفیوں کے جس طریقہ میں قرآن کے الفاظ اور حروف کی ادائگی کو اہمیت دی جاتی ہو ان کا قرآن کے معانی سے کیا تعلق ہوگا' سلطان المشائخ بھی قرآن کی اس تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ کبیر کی مہارت کے متعلق فرماتے:

این چہ فصاحت و بلاغت بود شیخ شیوخ	یہ فصاحت و بلاغت کیا ہے۔ شیخ' شیوخ
العالم ضاد بہ نوعے خواند کہ ہیچ کس را میسر	العالم ضاد اس طرح ادا کرتے تھے کہ کسی
نہ شد (سیر الاولیاء وغیرہ ص ۷۱)	کو نصیب نہیں'

خلافت کے لیے علم کی تلاش

بہر حال جب درویشی کے " قدرے علم" میں قرآنی الفاظ کی تجوید و تصحیح بھی داخل تھی اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ عام علوم درسیہ کے متعلق چشتی طریقہ کے بزرگوں کا مطمح نظر کیا تھا۔ شیخ بنگال عثمان سراج ہی کے قصہ میں دیکھئے کہ سلطان المشائخ اس راہ میں گامزن ہونے کی اجازت اس لیے نہیں دے رہے تھے۔

کہ از علم او چنداں نصیبے نہ دارد"	وہ علم میں کچھ زیادہ حصہ نہیں رکھتے تھے۔

اور جب تک مولانا فخر الدین زرادی نے حضرت والا کو یقین نہیں دلا دیا کہ عام علوم درسیہ دینیہ میں نے انھیں پڑھا دیا ہے' اجازت نہ ملی "علم" کی قدر و منزلت اہمیت و ضرورت کا احساس سلطان المشائخ کو کس حد تک تھا' اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے کہ ان کی مجلس مبارک میں سب سے آگے علماء کی نشست ہوتی تھی اور اس کے بعد دوسرے لوگ بیٹھتے تھے۔ حضرت والا کی طرف سے آداب مجلس کے سلسلہ میں اس کا اعلان کر دیا گیا تھا' سیر الاولیاء میں ان ہی کی زبانی یہ فقرہ منقول ہے کہ۔

"من نخواہم کہ ہیچ مجعدے بالاتر متعمے	میں نہیں چاہتا کہ کوئی کاکل والا کسی
بہ نشیند" ص ۲۰۲	عمامہ والے سے اونچی جگہ بیٹھے۔

اور یہ نقطۂ نظر تو علم کے قدر ضروری کے متعلق تھا' باقی اس راہ میں جو لوگ دین کی
بہ ملاحظہ کریں ص ۹۱ پر

خدمت کی نیت سے داخل ہوتے تھے ان کے لیے علمی مشاغل کا ایک درجہ وہ تھا جس میں اشتغال کی ممانعت تو نہیں تھی، لیکن عام طور پر ہمارے خواجگان چشت ان لوگوں کے لیے پسند نہیں فرماتے تھے۔

علمی مذاکرہ کی اجازت اس سلسلہ کا ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہے۔ جس کے راوی میر خورد ہیں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت سلطان المشائخ کے حلقۂ ارادت میں اودھ کے علماء کا جو گروہ آ کر شریک ہوا تھا ایک مدت سے علمی مباحث جن کے وہ عادی تھے خانقاہی زندگی میں ان سے کچھ بیگانہ ہوتے چلے جا رہے تھے، آخر ایک دن سبھوں نے مل کر مشورہ کیا کہ اس باب میں حضرت والا سے استمزاج کیا جائے۔ میر خورد کا بیان ہے کہ

• وقتے یاران اعلیٰ کہ از اودھ بودند اتفاق کردند کہ اجازت تعلم و بحث کردن از سلطان المشائخ بستانند"	اودھ کے اونچے متوسلین نے ایک دن یہ طے کیا کہ سلطان المشائخ سے پوچھ تاچھ اور تحقیق کی اجازت حاصل کریں۔

یہاں" تعلم و بحث کردن" سے مراد اصطلاحی تعلم نہ تھا بلکہ پیشہ ورانہ تحقیق و تدقیق مطالعہ و مباحثہ کا پرانا ذوق ان کے دلوں میں جو گدگدیاں لے رہا تھا اسی ملائی ذوق کی تشفی چاہتے تھے، میر خورد ہی نے لکھا ہے کہ،

• اگرچہ ہر یکے ازیں یاراں عالمے متبحر بود لیکن ہوس ایں کار کہ عمر بداں مشغول بودند باعث می شد"	اگرچہ ان متوسلین میں سے ہر ایک متبحر عالم تھا مگر چوں کہ پوری عمر سب اسی تحقیق میں مشغول رہے تھے اس لیے اجازت کے طالب ہوئے۔

حاشیہ صفحہ ۹

ؔ بجعد جعد سے ماخوذ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے شوقین حضرات کاکل بھی رکھتے تھے اور کاکلوں کو چوٹی بنا کر باہم گوندھ کر ادھر ادھر لٹکا دیتے تھے، ایک اور عبارت سے جو اسی سیر الاولیاء میں ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علوی سادات بجائے ایک ایک چوٹی کے دو دو چوٹیاں ادھر ادھر لٹکاتے تھے اور غیر سادات ایک ایک۔ متعمم تو ظاہر ہے عمامہ سے ماخوذ ہے یعنی دستار والے یہ اس زمانہ میں علماء کی تعبیر

(باقی اگلے صفحہ پر)

لگر جب یہ سوال اٹھا کہ حضرت گرامی کی خدمت میں ان کی اس خواہش اور ذوق کا
اظہار کون کرے، تو ہر ایک کانوں پر ہاتھ دھرنے لگا۔ دو قدح کے بعد طے ہوا کہ وہی مولانا
جمال الدین جنہوں نے خراسان کے "مولانا بحاث" کے دماغ کا نشہ اتارا تھا، چوں کہ حضرت
نے خصوصی خوشنودی کا ان کے ساتھ اظہار کیا تھا، اس لیے ان ہی کو آمادہ کیا گیا، بیچارے
سیدھے آدمی تھے، تیار ہو گئے اور سب مل کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ آگے
بڑھ کر مولانا جمال الدین نے عرض کیا،

"مخدوم را اگر فرمان باشد یاران وقتے بحثے کنند"	حضرت والا فرمائیں تو وابستہ لوگ کسی وقت بحث و مباحثہ کرلیا کریں،

یہ سننا تھا کہ سلطان المشائخ کا چہرہ متغیر ہو گیا، گو پیش کرنے والے تو صرف مولانا جمال الدین
ہی تھے لیکن:

دانست کہ ایں سوال ہمہ یاران است کہ حاضر آمدہ اند"	آپ نے سمجھا کہ یہ سوال تمام متوسلین کی طرف سے ہے، جو آئے ہوئے ہیں۔

لایعنی یعنی غیر ضروری دماغ کاویوں میں وقت ضائع کرنے کی چاٹ جو ان لوگوں کو پڑی
ہوئی تھی، یہ محسوس کرکے کہ ابھی ان کا یہ غلط ذوق بالکلیہ مردہ نہیں ہوا ہے، ذرا برہمی
کے ساتھ آپ نے فرمایا:

من چہ کنم مرا از ایشاں مطلوبے دیگر است	میں کیا کروں میں ان لوگوں سے کچھ اور مقصد رکھتا
وایشاں ہم چو پیاز پوست در پوست اند	ہوں اور یہ لوگ پیاز کی طرح چھلکے پر چھلکا ہی ہیں

یہ بڑا اہم تاریخی فقرہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مریدوں کا ایک طبقہ تو عوام کا تھا جو

(بقیہ صفحہ ۹۱ کا) تھی گویا عوام اور خواص میں یہی فرق تھا کہ خواص علمار دین متعلم ہوتے تھے اور عام
لوگ مجعلہ فوائد الفواد کی ایک عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی میں سلطان المشائخ بھی
کبھی مجعد رہتے تھے (فوائد الفواد ص۲۹)۔

مرید ہوتا تھا اور چلا جاتا تھا، ان لوگوں کو مرید کرنے کی کیا غرض ہوتی تھی، اس کا ذکر تھوڑی دیر بعد کیا جائے گا۔

مقصد خاص کی پیش نظر تھا علمی مباحثہ سے پرہیز

لیکن اہل علم کے ایک طبقہ کو سلطان المشائخ کسی خاص مطلب اور غرض کے لیے تیار کر رہے تھے، لیکن ان کو مایوسی ہوئی کہ مغز کار تک ان کی رسائی نہیں ہوئی، اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ ارشاد ایک شیخ کا اپنے تلامذہ اور مریدوں کے ساتھ تھا، لیکن اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ پیشہ وارانہ علمی مشاغل کے ایک بڑے حصہ کو خصوصاً ان لوگوں کے لیے جنہیں اپنے کسی مطلوب خاص کے لیے تیار کیا جاتا تھا، ان کے لیے اس قسم کی غیر ضروری مشغولیت کو پسند نہیں فرماتے تھے، زائد از حاجت غیر ضروری مطالعہ جو زیادہ تر ذہنی اللذاذ کے لیے کیا جاتا ہے، یہ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے واقعی طالب علمی کی ہو ایک ایسا عارضہ ہے جس سے نجات آسان نہیں ہے اس کے لیے بڑی گہری اور عمیق عقل کی ضرورت ہے، ورنہ جس بیچارے میں صرف پوست ہی پوست ہو مغز نہ ہو اس کے نزدیک تحقیق و تدقیق، ریسرچ، اکتشاف سے بہتر کام اور کیا ہو سکتا ہے

ع غالباً ایں قدر علم کفایت باشد عموماً اس قدر علم کافی ہوتا ہے۔

اس حقیقت تک رسائی ہر بے مغز آدمی کا کام نہیں ہے، علم کو صرف علم کے لیے حاصل کرنا چاہیے، اس بے معنی فقرہ کا اہمال اگر کسی پر واضح بھی ہو جائے، پھر بھی یہ واقعہ ہے۔ ع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

اہل علم میں علمی ذوق

علم گزیدہ دماغوں سے باوجود سب کچھ سمجھنے کے۔ اس ذوق کا یہی اثر آخر وقت تک نہیں مٹتا۔ سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ اس قصہ کا دانائے راز حقیقت آگاہ اور کون ہو سکتا ہے وہ کبھی تو کبھی تحفل شکنی اور بحاثی کی لذت اٹھا چکے تھے حالت یہ تھی کہ "علم کو علم کے لیے" کاروبار کو چھوڑ دینے کے بعد کبھی کبھی خود اپنا حال بیان فرماتے جیسا کہ حسن علا سنجری نے فوائد الفواد

میں نقل کیا ہے کہ ایک دن "مشغولی حق" کا ذکر ہو رہا تھا، ارشاد ہوا کہ،

"کار آں دارد و دیگر ہرچہ جز آں است مانع آں دولت است"	کام کی بات یہ ہے اور جو کچھ اس کے سوا ہے وہ اس دولت کے لیے مانع ہے۔

مگر اس تحقیق کے بعد بھی وہی دماغ سے گذری ہوئی پرانی چیزوں کا خیال آہی جاتا تھا، مطالعہ کے لیے ان ہی کتابوں میں سے کوئی کتاب اٹھا کر دیکھنا شروع کرتے کہ معاً خیال آجاتا کہ یہ کیا کر رہا ہوں، خود ہی فرماتے ہیں۔

"اگر وقتے از آں کتب کہ خواندہ ام مطالعہ می کنم وحشتے درمن ظاہر شود باخود گویم کہ کجا افتادیم" صـ۱۹	اگر کسی وقت پڑھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرتا وحشت ہونے لگتی اور خود اپنے کو مخاطب کر کے کہتا کہ کہاں گر گئے،

بہرحال غیر ضروری معلومات کے ذخیرہ کو دماغ میں بھرتے چلے جانا یا ان نکات اور پیچیدگیوں کا حل کرنا جن کا نہ دین میں نفع ہو نہ دنیا میں جو ہمارے یہاں کے علوم نہیں بلکہ سارے جہان کے اکثر علوم و فنون کا کیا حال ہے، کوئی مرے ہوئے لوگوں کی ولادت اور وفات کے سنین کی تحقیق میں مشغول ہے کوئی کسی قبر کے کتابہ کو پڑھ رہا ہے، کوئی ستاروں کو گن رہا ہے، کوئی آسمانی طبقات کو شمار کر رہا ہے الیٰ غیر ذلك من المشاغل العلمية التی یتشاغلون فیھا انما شغل علمی مگر غزالی الامام نے اگر یہ لکھا ہے کہ آسمانی طبقات کا گننا اور کسی پیاز کے چھلکوں کو اتار اتار کر شمار کرنا، نتیجہ کے لحاظ سے بتایا جائے کہ دونوں میں کیا فرق ہے تو اس کا آخر کیا جواب ہے، جو گلیوں کے سنگریزوں اور ٹھیکریوں کو چن چن کر گنتا جائے اور اپنی ڈائری میں ان کی تعداد کو نوٹ کرتا پھرے، اگر اس پر جنون کا فتویٰ لگانا صحیح ہے تو پھر جو رات رات بھر جاگ جاگ کے آنکھوں پر دوربینیں لگا لگا کر کہکشاں کے ستاروں کو گنتے ہیں، اس کی باضابطہ رپورٹ تیار کرتے ہیں اور اسے اسٹرانومی (نجومیات) کی اہم خدمت قرار دیتے ہیں، اس فتوے سے ان بیچاروں کو محفوظ کرنے کی

کیا صورت ہو سکتی ہے۔" افادہ کے معیار پر آپ علوم و فنون کی اس لمبی فہرست کو اگر جانچیں گے تو اکثر و بیشتر کا یہی حال نظر آئے گا، اس لیے حدیثوں میں علم لاینفع (ایسا علم جس پر کوئی نفع مرتب نہ ہوتا ہو) سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، اور یہی ہمارے مشائخ چشت کا علم کے باب میں نقطۂ نظر تھا تاہم پھر بھی علوم کی ان قسموں کے متعلق جن سے اگر نفع نہیں ہے تو ضرر بھی کسی کو نہیں پہنچتا بجز اس ضرر کے کہ آدمی کا وقت بیکار ضائع ہوتا ہے، چنداں سختی نہیں کی جاتی تھی۔

تصوف کی طرف رغبت تعلیم سے نہیں روکتی

سلطان المشائخ جب فرید شروع میں شیخ کبیر شکر گنج کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں تو آپ کا بیان ہے کہ حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد۔

عرض داشت کردم فرمان شیخ چیست ترک تعلم گیرم؟ — درخواست کی کہ حضرت کا کیا حکم ہے درس و تدریس و تحقیق چھوڑ دوں۔

اس تعلم سے غیر ضروری علوم کا مطالعہ درس و تدریس تحقیق و تدقیق مراد ہے کیوں کہ علم کی قدر ضروری سے تو حضرت فارغ ہو ہی چکے تھے، اور جو کچھ کمی رہ گئی تھی بابا صاحب نے اس کی تکمیل خود ہی فرمادی تھی۔ شیخ کبیر نے جواب میں ارشاد فرمایا:

من کسے را از تعلم منع نہ کنم آں ہم کن ایں ہم کن تا غالب کہ آید۔ ص ۱۰۷ — میں کسی کو سیکھنے سے منع نہیں کرتا لہٰذا وہ بھی کرو اور یہ بھی، تاکہ کوئی غالب آجائے۔

مطلب یہ ہے کہ جس نے اس راہ میں حقیقت آگاہی کے صحیح مقام کی یافت کے بعد قدم رکھا ہے اس کا تعلق غیر ضروری علوم سے خود بخود رفتہ رفتہ کمزور و مضمحل ہوتا چلا جائے گا اور علم کا جو حقیقی مقصد اور مآل کار ہے اس پر قدم جما دے گا اور اگر یوں ہی دیکھا دیکھی اس راہ میں آیا ہے تو پھر اپنے قدیم مالوفات کی طرف واپس ہو جائے گا، اور اس سے ان بزرگوں کے حکیمانہ طریقۂ کار کا سراغ ملتا ہے کہ جس پر حقیقت واضح نہیں ہوئی ہے زبردستی جبراً اس

کو ایسی بات پر مجبور کرنا جس میں کوئی ضرر بھی نہیں ہے، تربیت کی صحیح راہ نہیں ہو سکتی، بلکہ وہی بات کہ "ایں ہم کن آں ہم کن تا کہ غالب آید" جو کچھ اندر میں ہے باہر اسی کا تابع ہو جائے گا۔

غیر مفید علم

لیکن یہ فیصلہ صرف ان ہی علوم کی حد تک محدود رہ سکتا ہے جس سے نفع نہیں تو ضرر بھی کسی کو نہیں پہونچ سکتا، باقی تعلیم و تعلم، تحقیق و مطالعہ کی وہ راہ جس نے خدا جانے کتنوں کی راہ ماری اور جو بسا اوقات برہم زنِ ایوانِ انسانیت ہوئی ہے، حضرت بابا صاحب ہی سے نظام الاولیاء نے نقل کیا ہے کہ ایک دن اجودھن میں حضرت کے پاس ایک شخص آیا اور کان میں کچھ کہنے لگا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ ہم دونوں دلی میں ہم سبق تھے، پھر علم سیکھا کیا دنیاوی فوائد حاصل کر سکتے تھے، اس کا ذکر اس نے کیا۔ شیخ کبیر کو میں نے دیکھا کہ وہ جواب میں فرما رہے تھے و

"اے بیچارہ اگر خواندن برائے جدل است	اے شریف آدمی! اگر پڑھنا لڑائی کے لیے ہے
مخواں و بخلق ایذا مرساں و اگر برائے	تو اس سے باز آ اور مخلوق کے لیے باعث ایذا رسانی
عمل است ہمیں قدر کافی است کہ می	مت بن! اور اگر یہ پڑھنا عمل کے لیے ہے تو اس کے لیے
خوانند و عمل می کنند" ص ۸۵ سیر	اتنا ہی کافی ہے جتنا لوگ پڑھتے اور عمل کرتے ہیں!

اور یہ علم کی وہ قسم اور اس کا وہ استعمال ہے جس کے متعلق ہمارے بزرگوں کا فیصلہ "مخواں" کا تھا، یعنی جس کا پڑھنا نہ پڑھنے سے بہتر ہے، خصوصاً دینی علوم کے لیے تو زہرِ ہلاہل اور سمِ قاتل ہے، اس کے بعد خود شیخ کبیر کا ارشاد ہے:

"مقصود از خواندن شریعت عمل است	شریعت کا پڑھنا عمل کے لیے ہے نہ کہ
نہ از برائے ایذائے خلق"	مخلوق کی تکلیف دہی کے لیے!

دینی علوم میں اضمحلال اور اس کے نتائج

اور یہی وہ تماشا ہے جس کا نظارہ ہندوستان میں آج تقریباً سو سال سے دیکھا جا رہا ہے، جب تک اس ملک کے لازمی نصاب میں لوگ دینیات کی حیثیت سے صرف قرآن اور وہی مشارق الانوار یا مصابیح

السنۃ، قدوری، ہدایہ پر قناعت کر رہے تھے اس وقت تک یہاں کے مسلمانوں کا ایک دین تھا، ایک مشرب تھا، لیکن آج ادب کا غلغلہ بلند ہے، اخطل اور عنترہ اور ابوالعلاء اور فرزدق کی شاعری پر تنقید ہو رہی ہے، تحریر و تقریر کا بازار گرم ہے اسماء الرجال اور تاریخ و سیر کا سمندر ہے کہ ابل رہا ہے لیکن اسی کے ساتھ شاید ہی ہندوستان پر کسی دن کا آفتاب گذشتہ صدی میں طلوع ہوا جس کے ساتھ کسی نئے فتنہ نے سر نہ اٹھایا ہو، کہیں اجتہاد کا دعوٰی ہے فقہ اور ائمہ فقہ کی توہین ہو رہی ہے، کسی جگہ مہدویت و مسیحیت بلکہ نبوت کی تعمیر قلزم علم کے ان ہی صدف ریزوں سے عمل میں آرہی ہے کسی گوشہ سے حدیث کے انکار کا جھنڈا بلند ہو رہا ہے، کسی سمت سے قرآنی آیات کی نئی نئی تفسیریں پیش ہو رہی ہیں، کہیں "امت مسلمۃ" کا نظام نو بنایا جا رہا ہے، گند ہے جو مچی ہوئی ہے، فتنے ہیں کہ ٹوٹے ہوئے ہار کی مانند یکے بعد دیگرے اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دینیات کا جو لازمی کورس ہمارے بزرگوں نے اس ملک میں رکھا تھا، اگر علم کو جدل اور لڑائی جھگڑوں کے لیے استعمال نہ کیا جائے تو عمل کے لیے وہ کافی نہ تھا؟ قرآن اور حدیث کی عام معمولی سادہ عربی سمجھنے کے لیے کیا واقعی امرء القیس اور طرفہ تابط شرا کے کلام کے نکات کو عبور حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

عربی زبان کی تسہیل کا حال میں نے کسی جگہ عرض کیا تھا کہ ہمارے اسلاف (قدس اللہ اسرارہم) کے جہاں اور بہت سے عجیب و غریب کارنامے ہیں ان میں بڑا نمایاں کام ان کا یہ بھی ہے کہ عربی زبان کے اس حصہ کو جس میں اسلامی ادبیات محفوظ ہیں اسے اتنا آسان کر دیا گیا تھا کہ اگر کسی ملک کی مادری زبان اسے نہ بنا سکے تو ان علاقوں کے مسلمانوں کی جو مادری زبان تھی اسی میں قرآن و حدیث کے ان الفاظ کو شریک کر دیا گیا تھا۔ جس کا آج

یہ نتیجہ ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کے اس ذخیرے سے (جسے میں اسلامی الفاظ کہتا ہوں) تقریباً ۹۰ فی صدی الفاظ سے ہم عربی سیکھے بغیر واقف رہتے ہیں، مثلاً آپ سورۂ فاتحہ کو لیجئے۔ ایک انگریز کے سامنے بھی اسے پڑھیے اور ایک ہندوستانی مسلمان کے سامنے بھی، ظاہر ہے کہ عربی زبان نہ انگریز کی مادری زبان ہے اور نہ ہندوستانی مسلمان کی۔ لیکن انگریز اول سے آخر تک ہر ہر لفظ کے معنی جاننے کے لیے اس کا محتاج ہے کہ اسے بتایا جائے۔ مگر ہمارا حال کیا ہے، ہم میں کون ہے جو حمد، اللہ، رب، عالم، رحمن، رحیم، مالک، یوم، الدین، عبادت، استعانت، ہدایت، صراط، مستقیم، انعام، غضب، غیر، ضلالت کے معانی سے واقف نہیں، اب آپ ہی گن لیجئے کہ ان اٹھارہ الفاظ کو نکال لینے کے بعد سورۂ فاتحہ میں کتنے الفاظ رہ گئے جن سے ہندوستانی مسلمان ناواقف ہیں۔ بجز حروف جارہ، اسم اشارہ، اسم موصول یعنی لِ، ایاک، نا، الذین، ہم، علیٰ کے اور بھی اس پوری سورت میں کچھ ہے جس سے ہندوستانی مسلمان عموماً واقف نہیں ہیں۔ تقریباً چوبیس الفاظ میں صرف چھ لفظوں کی عدم واقفیت کوئی عدم واقفیت قرار پا سکتی ہے؟

تھوڑی توجہ سے قرآن کا سمجھنا آسان ہے

اور یہ الفاظ بھی ایسے ہیں جن کی حیثیت مفردات منتشرہ کی نہیں ہے، یعنی جن میں ہر ہر لفظ کے لیے لغت دیکھنے کی ضرورت ہو، بلکہ کلی الفاظ ہیں، یعنی اسم اشارہ، اسم موصول، حروف جارہ یا از یں قبیل چند گنے چنے کلی الفاظ ہیں، جنہیں بآسانی چند دنوں میں سکھایا جاتا ہے گویا ان چند صنفی الفاظ کے معانی سے واقف ہو جانے کے بعد تقریباً قرآن کے پچانوے چورانوے فیصدی الفاظ کے ہم عالم ہو جاتے ہیں۔ ایک چیز یہ، دوسری بات صیغوں کی خصوصی شکلیں یعنی عبادت کے معنیٰ سے واقف ہو جانے کے باوجود نعبد سے یا استعانت کے معنی جاننے کے باوجود نستعین کا مطلب ہندی مسلمان جو نہیں سمجھ

سکتا' یہ بھی ایک معمولی سی بات ہے، چند سادہ صرفی ابواب سے روشناس ہونے کے ساتھ ہی وہ صیغوں کی صورت پہچاننے لگتا ہے ایک فَعَلَ کی صرفی صورت سے اسے آشنا کر دیجئے واحد غائب ماضی کے سارے قرآنی الفاظ سے وہ آشنا ہو جاتا ہے اور صرفی صیغے یہ ہیں ہی کتنے۔ تیرہ چودہ شکلیں ماضی کی' تیرہ چودہ مضارع کی چھ شکلیں امر کی باقی اسم فاعل' اسمِ مفعول' اسم ظرف' اسم آلہ' مبالغہ تفضیل' صفت مشبہ۔ یہ بھی اتنے کلی قاعدوں میں جکڑے ہوئے ہیں کہ ان کے یاد کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی[1]۔ باقی تعیلات کا قصہ وہ دراصل اشتقاق کبیر کا علم ہے جو نفعل کو سمجھتا ہے کہ جمع متکلم کا صیغہ ہے' قرینہ سے نقول کو بھی سمجھ لے گا' خواہ یہ نہ جانتا ہو کہ تلفظ میں فرق کیوں پیدا ہو گیا' اردو میں ہم تھوکنا روز بولتے ہیں' لیکن اس پر کون غور کرتا ہے کہ یہ تھوکرنا کا مخفف ہے۔ "را" کلمہ بوجہ ثقیل ہونے کے حذف ہو گیا' قرآن کے چند رکوع میں ہیر پھیر کر جب صحیح' معتل' مضاعف' مہموز کے ابواب کی صورتیں گذریں گی، دماغ خود اندازہ کرلے گا کہ عربی میں مثلاً ہُنصَرَ بھی ماضی کی ایک شکل ہے اور قَالَ بھی۔ ہر زبان میں اس قسم کے تغیرات ہوتے ہیں' ان پر غور کیجئے تو کچھ کچھ کلیات ہی ہوتے ہیں جن کے تحت یہ تغیرات پیدا ہوتے ہیں' لیکن ان کو بے جانے آدمی بولتا ہے' سمجھتا ہے' آپ روز جانا مصدر بولتے ہیں گیا ماضی' جانے والا اسم فاعل' لیکن کبھی اس کو بھی سوچا کہ جانے کی جیم ماضی میں گاف سے کیوں بدل گئی اور مضارع میں پھر اصلی حالت پر کیوں واپس آ گئی۔ آپ تمباکو بھی بولتے ہیں اور گڑاکو بھی لیکن اس پہ آپ نے کب غور کیا کہ گڑاکو میں تمین میں حروف ت م ب کو حذف کر کے گڑاکو بنا لیا گیا ہے۔ سوچئے تو بات میں بات نکلتی چلی آئے گی اور نہ سوچئے تو ساری باتیں اس سوچ کے بغیر آپ کی سمجھ میں آتی چلی جائیں گی۔

---

[1] خاکسار نے ایک کتاب بھی ادب قرآنی کے نام سے ان ہی باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھ دی ہے جو طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے۔

اور بالفرض اگر تھوڑے بہت تعلیلی قوانین سے صرف میں واقف ہونے کی ضرورت بھی ہو تو ان قانونوں کی تعداد ہی کیا ہے، یہ تو پچھلے زمانوں میں ان معلموں نے جنہیں غالباً خطرہ رہتا ہوگا کہ اگر صرف و نحو کی کتابیں جلد ختم کرا دیتا ہوں تو ہمارا سرمایہ ہی ختم ہوتا ہے آگے بقاء ملازمت کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ معاملہ کو دراز کیا جائے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان صرفی قوانین کو اتنی اہمیت حاصل نہیں جتنی اہمیت اسے خدا ہی جانتا ہے کہ اس ملک میں کب دی گئی، اگر ہمیشہ سے یہی حال تھا تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس زمانہ میں فاتحہ فراغ کی عمر عموماً چودہ پندرہ سے لے کر بیس بائیس کی کیسے ہوتی تھی۔ اب تو جس طریقہ سے صرفی ابواب کو پنجابی طریقہ سے رٹایا جاتا ہے، اس کے لیے یا زیادہ سے زیادہ نحو کو بھی ملا لیجیے، اتنی مدت کافی نہیں ہوتی جس کی شہادت پنجابی نحو و صرف کی وہ تعلیم دے سکتی ہے جو آج سے تیس چالیس سال پہلے مروج تھی۔

عربی زبان کا اسلامی حصہ

خلاصہ یہ ہے کہ عربی زبان کا جو اسلامی حصہ ہے، میرے خیال میں اس کے مطالب اور معانی سے واقف ہونے کے لیے عربی زبان کے ان الفاظ اور ترکیبوں بندشوں کے جاننے کی چنداں ضرورت نہیں ہے

لہ میرے گاؤں گیلانی میں ہندوؤں کا ایک ابتدائی پاٹ شالہ ہے، اس پاٹ شالہ کے بوڑھے گروجی کا عام قاعدہ ہے کہ دو سال میں بیس تک کے پہاڑے سے آگے بچوں کو پڑھنے نہیں دیتے۔ مدت ہوئی ان سے ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ گروجی آپ دو سال میں بیس تک کا پہاڑہ سکھاتے ہیں؟ بولے کہ اتنے پہاڑے تو میں چار مہینوں میں بھی سکھا سکتا ہوں لیکن اس کے بعد پھر میری تنخواہ کا کیا سامان ہوگا۔

ﷺ واللہ اعلم پنجاب میں یہ رواج کب سے جاری ہوا تھا کہ شرح جامی اور اس کے حواشی تک کی تعلیم میں پندرہ پندرہ سولہ سولہ سال صرف ہوتے تھے لیکن بحمد اللہ اب زمانہ بدل گیا، خود پنجاب کے ایک عالم حافظ عبدالرحمن امرتسری مرحوم نے کتاب التصرف و کتاب النحو لکھ کر صرف و نحو کے قصہ کو چند مہینوں تک محدود کر دیا ہے۔ ۱۲۔

جن میں جاہلی شعرا کا کلام ہے، اور بالفرض کہیں کہیں تھوڑا بہت ہو بھی تو تفسیروں میں؟
بیان کر دیا گیا ہے، اب تفسیروں کی ان ہی بتائی ہوئی باتوں کو پھر خود تحقیق کرنے کے لیے
دواوین عرب پر عبور حاصل کرنا، اگر آپ کا ذاتی ذوق ہے تو اختیاری مضامین کی حیثیت
سے آپ یہ بھی کر سکتے ہیں، ہر زمانہ میں جن لوگوں کو شوق تھا ان کو کون روکتا تھا، لیکن
ہر طالب علم کے لیے خواہ اسے براہ راست ادبی تحقیقات کا شوق ہو یا نہ ہو، وہ بجائے جلالین
یا مدارک بیضاوی کے نہیں چاہتا کہ قرآن کے ہر ہر لفظ کے متعلق جاہلی شعراء کے کلام سے
شاہد پیش کرے۔ بلکہ مفسرین نے تحقیق کر کے جو معنی لکھ دیئے ہیں یا جس فقرہ کی جس
ترکیب کا جو مفہوم پیدا ہوتا ہے، اس مفہوم کو بتا دیا ہے تو آپ اس بیچارہ کو خواہ مخواہ
اس پر کیوں مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی آپ کے اس غیر ضروری مذاق کی ہمنوائی کرے آخر
زمخشری، ابو عبید وغیرہ ائمۂ لغت سے تو آپ کا علمی احاطہ زیادہ وسیع نہیں ہو سکتا ہے آپ
قرآن کے جس لفظ کا مطلب جاہلی شعراء کے کلام میں تلاش کرتے ہیں، وہ بیچارہ کشاف میں یا
بیضاوی میں اٹھا کر دیکھ لیتا ہے۔ حاصل تو دونوں کا ایک ہی ہوا۔

علم حدیث میں سہولت

یہی حال حدیث کا ہے، سند کے مباحث مدت ہوئی کہ ختم ہو
چکے، امام بخاری، مسلم جیسے ائمہ جن کی کتابیں تلقی بالقبول ہو
چکی ہیں، یہ مان لیا گیا ہے کہ جانچ کر پرکھ کر صحیح حدیثوں کو غیر محدثوں سے جدا کر کے
ان بزرگوں نے اپنی کتابوں میں جمع کر دیا ہے، اس لیے اب ہر حدیث کی ہر سند پر بحث کرتے
ہوئے طلباء کو پڑھانا ایک ایسے کام کو انجام دینا ہے جو آپ سے بہتر شخصیتوں کے ذریعہ
سے انجام پا چکے ہیں۔ رہ جاتا ہے متن کا معاملہ، متنِ حدیث میں ایک حصہ خلافیات کا ہے
اور وہ کم ہے، دوسرا حصہ وہ ہے جو علم حدیث کی جان ہے یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
کی سیرت طیبہ، ظاہر ہے کہ پہلے حصہ کے متعلق بھی پہلی ہی صدی میں بحمد اللہ امت کے
بہترین دل و دماغ اس کام سے فارغ ہو چکے ہیں۔ ان کے متعلق ترجیح و تطبیق و تاویل

کے لیے جو کچھ کرنا تھا سارا کام کیا جا چکا ہے اور اسی کام کے آخری نتائج کا نام فقہ ہے
جو مختلف ائمہ کے ناموں سے امت کے مختلف طبقات میں معمول بہ ہے اور یہ مسلمہ ہے کہ ان
میں کوئی طبقہ گمراہ اور استحقاق نجات سے محروم نہیں ہے اس لیے حدیث میں طلبہ کو لازمی طور
جو پڑھانے کی چیز اور سمجھانے کی بات ہو سکتی ہے وہ حدیث کا وہ حصہ ہے جس کا تعلق
خلافیات سے نہیں، بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک کے مختلف پہلوؤں سے ہے
اور اس کے لیے کیا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ مشارق الانوار یا مصابیح السنہ، مشکوٰۃ المصابیح
جیسی کتابیں کیا کافی نہیں ہو سکتیں۔ ان کتابوں میں سے کسی کتاب کو جو اچھی طرح جانچ کر
پڑھ لے گا آئندہ وہ حدیث کی دوسری کتابوں کا شروح، حواشی کی مدد سے یقیناً مطالعہ
کر سکتا ہے، پھر ہمارے بزرگوں نے لازمی نصاب کا جزء ان ہی کتابوں میں سے کسی کتاب کو
اگر رکھا تھا تو کیا غلطی کی تھی؟ باقی اس کے بعد بھی اگر کسی کو فن اسناد وفن خلافیات میں
خصوصی مہارت پیدا کرنے کا خیال ہو تو اس سے کس نے کب منع کیا تھا، اور جن لوگوں
کو شوق تھا وہ اپنے شوق کی ہر زمانہ میں تکمیل کرتے ہی رہے، ہندوستان کبھی ایسے
بزرگوں سے کبھی خالی نہ رہا، جس کا اجمالی ذکر پہلے آ چکا ہے۔

قدیم نصاب تعلیم کے سلسلہ کی غلط فہمی

غالباً بعض خیالات جن کا میں پہلے بھی اظہار کر چکا ہوں، ان سے
بالکلیہ تو نہیں، لیکن بعض اجزاء کو میں نے پھر دوہرایا ہے اور یہ بیں
نے قصداً کیا ہے، ایک بڑی غلط فہمی ہمارے قدیم نصاب کے متعلق پھیلی ہوئی ہے چاہتا
ہوں کہ لوگ اس کے افادے کو سمجھیں اور نہ اس وقت تو مقصد شیخ کبیر کے کلام کی تشریح
تھی کہ شریعت یا دینی علوم کی تعلیم سے مقصود اگر عمل ہے اور وہی ہو بھی سکتا ہے تو اس
لحاظ سے ہمارا قدیم نصاب قطعاً کافی تھا اور ایسا آسان وسہل الحصول تھا کہ جس طرح
پہلے زمانہ میں اس کو مختلف عقلی علوم وفنون کے ساتھ جوڑا گیا تھا، اس زمانہ میں بھی
با آسانی، پرانے عقلیات کو نکال کر جدید علوم وفنون کے نصاب میں "اسلامیات" کے نام

لازمی نصاب کو با آسانی ہم شریک کر سکتے ہیں تاکہ دینی و دنیوی علوم کی جو مختلف دو دھارے دو تلواروں کی طرح ہمارے ملک میں بہہ رہے ہیں اور ان سے باہم خواص بھی کٹے جاتے ہیں" ان کا وقار برباد ہو رہا ہے اور عوام بھی ذبح ہو رہے ہیں اس دو عملی کا خاتمہ ہو جائے، مذہب کو اپنی عملی زندگی میں شریک کرنے کا موقع اہل علم کی ہر جماعت کو براہ راست حاصل ہو جائے۔

لیکن اگر بجائے عمل کے مذہب کو نکتہ نوازیوں اور دماغی زور آزمائیوں کی صرف مشق گاہ کی حیثیت سے آپ استعمال کرنا چاہتے ہیں یا بقول شاہ ولی اللہ علم حدیث کو نقاصوں کی خود نمائیوں کی تماشا گاہ بنانا چاہتے ہیں کہ جہاں کوئی ذرا سا اجنبی و مشکل لفظ حدیث میں یا قرآن میں آیا گویا شکار ہاتھ آیا اور بقول شاہ صاحب۔

شواہد آن از کلام شعرا و اخوات کلمہ و اشتقاق و محال استعمال وے۔

کا دریا بہنے لگا۔ ہر ہر سند کے ہر ہر راوی کے متعلق" احوال ایں قوم و سیرت ایشاں" کا بیان شروع کر دیا گیا۔ اور کہیں فقہ کے کسی مسئلہ کا ذکر آگیا تو براں مسئلہ خصوص علیہا تخریج کا دروازہ کھل گیا اور ساری بحر الرائق اور شامی، عالمگیری اونڈیل دی گئی، کوئی تاریخی قصہ ہاتھ آیا بس بادنیٰ مناسبت قصص عجیبہ وحکایات غریبہ نوادر و امثال محاضرا و مسامرات کی بھرمار شروع ہو گئی۔ شاہ ولی اللہ نے اگر درس حدیث[1] و قرآن کے اس طریقہ کے متعلق یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ درس کا یہ طریقہ

---

[1] یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے، دارالعلوم دیوبند اور اس کے متعلقہ مدارس میں حدیث کا جو دورہ ہوتا ہے اس کی تاریخ یہ ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس فتنہ حادثہ کے مقابلہ میں جو غیر مقلدیت کی شکل میں نمایاں ہوا بطور اختیاری مضمون کے حدیث کے دورے کا افتتاح کیا۔ ہندوستان کے مختلف مدارس سے فارغ ہونے کے بعد جن لوگوں کو تکمیل حدیث کا شوق ہوتا تھا وہ حضرت کے پاس جاتے تھے۔ اصل مقصود تو وہی دماغ کی اصلاح کے بعد دل کی اصلاح ہوتی (باقی اگلے صفحہ پر

"طریقہ قصاص است و قصد از آں اظہار فضیلت و علم است نہ عزآں" تو انھوں نے کیا غلط لکھا ہے
مستعد طالب العلم پڑھنے کے بعد خود مطالعہ کے ذریعے جن چیزوں کو جان سکتا ہے اسی کو
سنا سنا کر اور وہ بھی ایسے وقت میں جب ان چیزوں کے سمجھنے کی پوری اس میں صلاحیت
بھی نہیں ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ بسا اوقات اضاعت وقت کا سبب ہو جاتا ہے اور وہی بات
صادق آتی ہے جو ہندوستان کے ایک مشہور معقولی استاذ کی طرف منسوب ہے ان کا
قاعدہ تھا کہ تہذیب میں ملا جلال کی باتیں اور ملا جلال میں شفار و اشارات کی باتیں
طلبار کے سامنے بیان کیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس درجہ کے طلبار کی سمجھ سے وہ
اونچی باتیں باہر ہوتی تھیں، طلبار جب پڑھ کر اٹھنے لگتے تو خود ہی فرما دیتے کہ پڑھانے
کو تو میں نے سب کچھ پڑھا دیا، لیکن میری تقریر میرے مصلیٰ سے باہر نہیں ہوئی، گھوم
گھام کر اسی میں رہ جاتی ہے۔

پرانے معقولی

اور درس کے اس طریقہ میں خود نمائی ہی صرف ہو تو خیر متحمل بھی ہو سکتی ہے
آج تو جس چیز کا تجربہ ہو رہا ہے، فتنہ اور فساد کے جو دروازے بغیر کسی ضرورت
کے کھولے جا رہے ہیں تو جیسا کہ شیخ کبیر شکر گنج نے فرمایا تھا کہ

"اے بیچارہ اگر خواندن برائے جدل است مخواں"   اگر پڑھنا لڑائی کے لیے ہے تو مت پڑھو"

اس پڑھنے اور پڑھانے سے تو ملک کا جاہل ہی رہنا بہتر تھا، بلکہ پرانے
معقولی اگر اپنی خود نمائی کے لیے معقول کی کتابوں میں بال کی کھال نکالا کرتے تھے،
میر زاہد اور ملا جلال کی ایک ایک سطر پر جھونپڑیاں ڈال ڈال کر خود بیٹھتے تھے

(بقیہ صفحہ ۱۰۳ کا) تھی لیکن ضرورت وقت کو دیکھ کر حضرت نے حنفی مذہب کی تائید
کے طریقہ کا اضافہ درس میں فرما دیا، یہی دورہ گنگوہ والا دیوبند میں جاری ہے۔ بجز ایک
ترمذی کے عموماً نو مہینے میں صحاح ستہ بطور سرد کے ختم کرا دی جاتی ہے۔ ۱۳۰

اور طلبار کو بٹھاتے تھے، حمداللہ کے ایک مقام "وجود رابطی" پر خدا ہی جانتا ہے کہ اس زمانہ میں کتنے رسائل تصنیف ہوئے تو یہ ایک غیر دینی چیز کے ساتھ ملعبہ تھا اور کہا جا سکتا ہے کہ ایک قسم کی دماغی ورزش طلبار کو کراتے تھے، لیکن دین کو دماغی عیاشیوں کا تختۂ مشق بنانا تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ علوم کی قدر ضروری وغیر ضروری، مفید ومضر کے متعلق ان لوگوں کے جو خیالات تھے جن کے ہاتھ میں ہندی مسلمانوں کی باگ، قدرت نے سپرد کی تھی، میری مراد خواجگان چشت کے اکابر سے ہے وہ آپ کی نظر سے گذر چکے اور میں نہیں سمجھتا کہ ان بزرگوں نے اس باب میں جو رائے قائم کی تھی اس پر اب بھی کوئی اعتراض کر سکتا ہے۔ ہندوستان کے علمار عموماً چونکہ ان ہی بزرگوں کے زیر اثر رہے اسی کا یہ نتیجہ ہے جو ان کی علم کے متعلق رائے تھی اُسی کے ماتحت یہاں کا علمی نصاب رہا، باقی یہ سوال کہ علم کے جس قدرِ ضروری کو عمل کی شکل وہ دیتے تھے اس کی کیا صورت تھی اور اس کا کیا طریقہ تھا۔ یہی دراصل اصل سوال ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان عموماً اور علمار خصوصاً اس پر غور کریں۔

علم کی تعمیلی شکل خواجگانِ چشت میں

دوسرے طرق وسلاسل کے مقابلہ میں کسی فخر وامتیاز کا اظہار مقصود نہیں ہے بلکہ ہمارے بزرگوں کا جو طریقہ کار تھا اس کی مثالیں پیش کرنی ہیں اور ان مثالوں سے تربیت واصلاح کے جن اصولی ضوابط کا سراغ ملتا ہے صرف ان کی طرف اشارہ کرنا، غرض صرف اتنی ہے

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، ان لوگوں کے متعلق جو "قدرے علم" کے عام نصاب سے فارغ ہونے کے بعد ان بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے جیسا کہ ہونا چاہیے تھا طبعاً دو طریقۂ کار اختیار کیے جاتے تھے یعنی ایک تو وہی تزکیہ یا چاہیے تو صاف اور

عام تعبیر میں یہ کہیے کہ صفائی کا کام کیا جاتا تھا، ہم سلبی اور منفی طریقہ کار اس کا نام رکھتے ہیں اور دوسری بات تحلیہ یعنی صفائی کے بعد جن صفات کی پرورش ان کے پیش نظر تھی اس کی عملی راہ پر لوگوں کو لگانا، نفوس کو ان صفات وملکات سے آراستہ و پیراستہ کرنا۔

تزکیہ اور صفائی

یوں تو تزکیہ کے ذیل میں بیسیوں چیزیں آتی ہیں لیکن خیر وشر کے اس مجموعہ میں جس کا نام "الحیٰوۃ الدنیا" ہے جس کی کوئی بھلائی برائی سے جدا ہو کر نہیں پائی جاتی اور کوئی برائی ایسی نہیں ہے جس میں بھلائی کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل آتا ہو، حتیٰ کہ بقول عارف شیراز

چراغ مصطفوی با شرار بولہبی ست

اسی چمن کا ایک بہترین پھول علم کا بھی پھول ہے لیکن قرآن کے حوالہ سے گذر چکا کہ اس پھول میں جس

کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی — ہوشیار! کہ انسان ضرور سرکش ہوجاتا ہے

کا کانٹا بھی چبھا ہوا ہے، سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ ایک دن فرمانے لگے کہ آدمی

"چوں علم بیاموزد او را شرفے حاصل آید" — جب آدمی علم سیکھتا ہے اسے عزت حاصل ہوتی ہے۔

ص ۲۴ فوائد

پورا اگر یہ علم کہیں دین کا علم ہوا اور دینی علم کے مطابق روزے نماز میں بھی کوئی لگ گیا، تو پھر کیا کہنے ہیں۔

"چوں طاعت کند کار او بہتر رود" — جب بندگی کرتا ہے اس کا کام بہتر چل نکلتا ہے

سو دا خوب چل نکلتا ہے، انگلیاں اٹھنے کے لیے، آنکھیں جھانکنے کے لیے ہر طرف تیار ہو جاتی ہیں۔ حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ علم اور عمل کی اس مجموعی کیفیت سے "پندار" کا

فاسد مواد عالم کے دماغ میں پکنے لگتا ہے یہی وقت ہوتا ہے کہ لبساطِ علم کے ان تازہ نو واردوں پر کوئی پختہ کار۔

پیر باید تا ہر دو را بشکند یعنی علم و عمل را از نظر او فرو آرد	پیر کو چاہیے دونوں کو توڑ ڈالیں یعنی علم و عمل کو اس کی نظر میں بے وقعت بنا دیں۔

علمی پندار کی ریاح جب دماغوں میں بھر جاتی ہے اور ان مسکینوں کی گردنیں ان ہی زہریلی گیسوں سے اکڑ کر رہ جاتی ہیں، اس وقت اس کھنچی ہوئی گردن کو نرمانے کے لیے نشتر کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ سب سے بڑا سرطانی پھوڑا جس کا نام "خود پسندی" اور "عجب" ہے اس کی ٹیس سے انسانی روح کو نجات مل جاتی ہے سلطان المشائخ فرماتے ہیں۔

تا بہ عجب مبتلا نہ شود	تاکہ خود پسندی میں مبتلا نہ ہو۔

سلطان المشائخ بہرحال یہ پہلی سلبی کارروائی ہوتی ہے جو اس راہ میں اختیار کی جاتی ہے، سلطان المشائخ کا علاج شیخ کبیر نے اس سلسلہ میں کس طریقہ سے کیا تھا، بعد کو اس کا ذکر خود کیا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ "مولانا بحاث" اور "محفل شکن" کے خطابات لے کر مولانا نظام الدین کے نام سے سلطان جی شیخ کبیر شکر گنج کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، پہلا کام شیخ نے یہی کیا کہ باوجود سب کچھ لکھ پڑھ چکنے کے حکم دیا کہ نظام تمھیں کچھ کتابیں مجھ سے بھی پڑھنی پڑھیں گی، اسی بنیاد پر عوارف کا سبق شروع ہوا، غالباً چند ہی اسباق ہوئے ہوں گے کہ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جو نسخہ عوارف کا شیخ کبیر کے ہاتھ میں تھا:

"ہمانا کہ نسخہ بود بخط باریک نوشتہ با سقیم گونہ"	وہی نسخہ تھا جو باریک خط میں ناصاف لکھا ہوا تھا۔

یعنی اس نسخہ کا خط باریک تھا، یا اس کی لکھائی اچھی نہ تھی، ہوا یہ کہ۔

"شیخ را در میاں آن اندک باملتے بود" یعنی شیخ کبیر کچھ اس مقام پر اٹکنے لگے، بیچارے بوڑھے آدمی، وہ تو اس عبارت میں غور کر رہے تھے، ادھر جوان عالم کے جوان علم کے گرم خون میں جوش آیا، سلطان المشائخ کا بیان ہے کہ۔

من نسخۂ دیگر بخدمت شیخ نجیب الدین متوکل علیہ الرحمۃ دیدہ بودم"	میں دوسرا نسخہ شیخ نجیب الدین متوکل علیہ الرحمۃ کی خدمت میں دیکھ چکا تھا۔

اسی "دیدہ بودم" کے ذریعہ سے اپنی وسعت نظری کا اظہار فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ کبیر کے سامنے بایں الفاظ کہا کہ۔

"شیخ نجیب الدین نسخۂ صحیح دارد"	شیخ نجیب الدین کے پاس صحیح صاف نسخہ ہے۔

بس "دیدہ بودم" کے علم کا ادھر اظہار ہوا اور دوسری طرف سے ایک آواز جس میں ہیبت ملی ہوئی تھی سلطان المشائخ کے کان سے ٹکرانے لگی۔

درویش را قوت تصحیح نسخۂ سقیم نیست	فقیر کو اس ردی نسخہ کی تصحیح کی قوت نہیں ہے

ایک دفعہ نہیں بار بار شیخ کبیر اس فقرے کو دہراتے جاتے تھے،

شیخ کبیر کی ناراضی

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ شروع میں تو مجھے خیال نہ آیا کہ یہ اشارہ کس کی طرف ہے لیکن چند بار مکرر سہ کرر یہی الفاظ شیخ کبیر کی زبان مبارک سے نکلتے رہے تو جماعت کے دوسرے ساتھی مولانا بدرالدین اسحاق نے سلطان جی کو اشارہ کیا کہ خطاب تمھاری طرف ہے۔ سلطان جی کے ہوش اڑ گئے۔ فرماتے ہیں کہ۔

"سر برہنہ کردم و در پائے شیخ افتادم	سر ننگا کر کے شیخ کے قدموں میں پڑ گیا،

شیخ کبیر کے قدموں پر "محفل شکن مولانا بحاث" کا سر پڑا ہوا تھا کہتے جاتے تھے۔

"نعوذ باللہ منہا کہ مرا مقصود ازیں سخن کنایتے بہ مخدوم بودہ باشد"	خدا کی پناہ کہ اس بات سے میرا مقصد حضرت کی طرف کوئی اشارہ رہا ہو،

وہ یہ سمجھے کہ شیخ کبیر نے شاید میرے اس بیان سے کہ شیخ نجیب الدین کا نسخہ صحیح ہے اپنی

اہانت محسوس کی اسی کی معافی چاہ رہے تھے، حالاں کہ واقعہ تو کچھ اور تھا' فرماتے ہیں کہ میں عرض کر رہا تھا کہ:

من نسخہ دیدہ بودم ازاں حکایت کردم ا — میں نے نسخہ دیکھا تھا اس کی حکایت کردی'

اصلاً چیزے دیگر در خاطر نہ بود" — اس کے علاوہ کچھ اور دل میں نہ تھا.

اور اسی "دیدہ بودم" کے نیچے تو وہ بات چھپی ہوئی تھی جس پر یہ قیامت برپا ہوئی تھی خلاصہ یہ ہے کہ:

"من معذرت می کردم اثر بے رضائی پیچاں — میں معذرت کر رہا تھا مگر مجھ ناخوشی کا اثر ویسا

در شیخ می دیدم" — ہی شیخ میں دیکھ رہا تھا.

جرم ناقابل عفو قرار پایا۔ سب کچھ تج کر جو کسی کے آستانہ پر آیا تھا صرف ایک دیدہ بودم کے دعوے نے اس کو اس حال میں پہنچا دیا' صادق اور کاذب طلب میں امتیاز کا وقت آگیا' دنیا دیکھ رہی تھی کہ اب مولانا نظام الدین کا فیصلہ کیا ہوتا ہے کیا مولانا بحاث' اور محفل شکن" ہی کے لقب کو لے کر دنیا سے واپس چلے جائیں گے جیسے لاکھوں ہی بحاث اور محفل شکن آئے اور چلے گئے یا مشائخ کے سلطان کا جو تخت خالی ہے اس پر قدم رکھنے کی ہمت کرتے ہیں اپنے حوصلہ کی بات ہوتی ہے ورنہ سچ یہی ہے.

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا — ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

"چند کلیاں" جواب تک ان کے ہاتھ میں تھیں وہ پھینک دی گئیں اور اپنی تنگ دامانی کے علاج کے آخری فیصلہ پر وہ ڈٹ گئے، ظرف کے چھوٹے ہوتے تو کہہ سکتے تھے کہ بھلا میرا کیا قصور ہے' میں نے غلطی ہی کیا کی ہے، ایک اچھے نسخہ کا علم تھا اس کا اظہار کیا گیا تھا پھر اس پر اتنی برہمی کے کیا معنی؟ یہی شوشہ اگر سامنے آجاتا وہی لمبی لکیر بن سکتا تھا' اتنی لمبی کہ شیطان کی آنت بھی اس سے چھوٹی ہو' بڑھاپے میں دماغی توازن صحیح نہیں رہا ہے، مزاج میں تندی اور غصہ ہے. العیاذ باللہ! آگے بڑھ کر تو اسی کو "نفسانیت" کا ثبوت

بھی قرار دیا جا سکتا تھا بلکہ دین کی آڑ لے کر سلطان جی چاہتے تو " اسوۂ حسنۂ نبویؐ کے
معیار پر شیخ کبیر کے اس طرزِ عمل کو کھوٹا بتا کر لوگوں کو دکھا سکتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ وہ اپنا علاج
کرانے آئے تھے شیخ کبیر کی کمزوریوں کا علاج اجودھن آنے سے مقصود نہ تھا اس کو طے
کر چکے تھے کہ یہ "معالج" "طبیب" ہے، اس کے بعد تنقید کا حق ان کے لیے باقی ہی کب رہا تھا
بہرحال فرماتے ہیں کہ شیخ کبیر کی "بے رضائی" کو ایک حال میں دیکھ کر مایوس مجلس سے
اٹھا۔ برخاستم نہ دانستم کہ چہ کنم" نہ دانستم چہ کنم" یہ الفاظ اس شخص کی زبان سے آج اجودھن
میں نکل رہے ہیں جو کل تک ہر محفل میں ہر سوال کا جواب دے کر محفل کا رنگ بگاڑ
رہا تھا۔ آج اس کی قابلِ رحم نادانی اور چہ کنم کا یہ حال ہے۔ فرماتے ہیں،

" مبادا ہیچ کس را آں چناں روز — کسی کو بھی اس دن اور اس غم جیسا غم
چناں غم کہ مرا آں روز بود" — نہ ہو جیسا مجھے تھا

جواب کی جگہ غم

دماغ میں جواب پیدا ہونے کی جگہ دل میں غم کی لہریں اٹھنے لگیں اور
کیسی لہریں جس کی کسک آخر وقت تک نہیں بھولے تھے، دعا کرتے
تھے کہ خدا کسی پر ایسا سخت دن نہ لائے اور ایسے غم میں کسی کو مبتلا نہ کرے، دل کے اس
درد اور سینہ کی اس سوزش کا علاج اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا جو ہمیشہ غم دیدوں
کا آخری علاج ہے، خود وہی فرماتے ہیں،

"گریہ در من افتاد" — مجھ پر گریہ طاری ہو گیا،

اور یہی "گریہ" اصل مقصود تھا، جس سے وہ سب کچھ دھل جاتا ہے جسے اپنے ساتھ وہ دلی
دلی کے مدرسوں سے لائے تھے، روتے تھے، روتے جاتے تھے، کوئی چپ کرنے والا بھی نہیں
جب تک رونا ممکن تھا روتے رہے، آنسوؤں کا ذخیرہ ختم ہو گیا، اب کیا کروں، فرماتے ہیں کہ

• مضطرب و حیراں بیروں آمدم" — حیران و پریشان خاطر باہر نکلا

سننے والے سن رہے ہیں" بیروں آمدم" یہ بیروں آمدم کس ارادے اور کس قصد سے ہوا

ہے۔ "شیخ نجیب الدین نسخۂ صحیح دارد" صرف علم کے اس دعوے نے آج رونے والے کو حجرے سے باہر نکالا ہے، اس لیے نکالا ہے کہ:۔

تا بر سیدم بر سر چاہے" | تاکہ کسی کنویں پر پہونچوں،

کیا پانی پینے کے لیے، ہاتھ منہ دھونے کے لیے، غم کی گرمی میں ٹھنڈک پیدا کرنے کے لیے، "بر سر چاہے" رسائی ہوئی ہے، ان ہی سے سنیے جو اس کنوئیں کے کنارے آکر کھڑے ہوئے ہیں

خواستم کہ خود را دراں چاہ اندازم | میں نے چاہا کہ اپنے کو کنوئیں میں ڈال دوں،

معالج نے علاج سے انکار کیا ہے، اس مریض سے پوچھیے جو طبیب سے آخری جواب لے کر واپس ہوا ہو۔ نَوَّرَ اللہُ ضَرِیْحَ السَّعْدِیْ۔ حَیْثُ قَالَ

ماجرائے دلِ دیوانہ بگفتم بہ طبیب | کہ ہمہ شب درِ چشم ست بفکرت بازم
گفت ازیں نوع حکایت کہ تو گفتی سعدی | دردِ عشق است ندانم کہ چہ درماں سازم

پھر کچھ خیال آیا، کیا خیال آیا۔

"وایں بدنامی برکہ باز گردد | مگر اس بدنامی کی وجہ سے واپس ہوا

کنوئیں میں فقیر کو کس نے ڈھکیل کر مار ڈالا، اس تہمت میں کس کس کی گرفتاری ہو، فرماتے ہیں کہ اسی خیال نے "چاہ اندازم" کے خیال سے باز رکھا، عقل و ہوش کا تکلیفی سرمایہ اگرچہ گم ہو چکا تھا، لیکن ہو سکتا ہے کہ تحت الشعور "خودکشی" کے جرم کا خیال بھی مانع آ رہا ہو، بہرحال کنوئیں کی منڈیر سے نیچے اتر آئے اور

"دریں محنت و حیرت سراسیمہ وار جانب | اس تکلیف و پریشانی میں پریشان حال
صحرا بیروں رفتم" | جنگل کی طرف نکل کھڑا ہوا،

اجودھن کی فضاؤں میں کسی کے نالہائے زار اب تک گونج رہے ہوں گے، فرماتے ہیں:

"جانب صحرا بیروں رفتم باخود گریہ وزاری کردم" | جنگل میں باہر چلا گیا اور روتا رہا،

شیخ کبیر کی طرف سے معافی | خدا ہی جانتا ہے "گریہ وزاری" کا یہ طوفان کب تک امنڈتا

رہا، ہفتہ گذرا یا مہینہ، شیخ کبیر کے ایک صاحب زادے شہاب الدین لقب سلطان جی اور ان میں میل ملاپ تھا، موقع مناسب پاکر انھوں نے سلطان جی کا حال شیخ کبیر کے سامنے عرض کیا، جو مقصود تھا پورا ہو چکا تھا، حاضری کی اجازت مرحمت ہوئی۔

"بیامدم، سر در قدم مبارک آوردم" — میں آیا اور سر اپنا شیخ کے قدموں میں ڈال دیا۔

جرم کی معافی ہوگئی، معافی کے دوسرے دن پھر طلبی ہوئی اور ارشاد ہوا، جو راز تھا اس سے پردہ اٹھایا گیا۔ شیخ کبیر نے مولانا نظام الدین بحاث و محفل شکن کو جواب صرف بابا فرید کے "نظام" بن چکے تھے مخاطب کرکے فرمانے لگے:

"ایں ہمہ برائے کمال حال تو می کردم" — یہ سب تیری حالت کو کمال تک پہنچانے کے لیے میں کیا تھا

مرید سے پیر کا کیا تعلق ہوتا ہے، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اسی دن یہ راز بھی واضح ہوا۔ شیخ کبیر نے فرمایا،

"پیر مشاطۂ مرید باشد" — پیر مرید کا سنوارنے والا ہوتا ہے۔

مرید کی ساری ژولیدگیوں کو وہی سلجھاتا ہے، میل کچیل کو دھو دھا کر صاف کرتا ہے، غازہ ملتا ہے، بال سنوارتا ہے اور یوں "یحببکم اللہ"[1] کے مقام پر پہنچا کر اسے اللہ کا اور ملاء اعلیٰ کا اثر ملاء ادنیٰ پر، ملاء ادنیٰ سے محبوبیت کی وہی کیفیت قلوب انسانی میں پھیل جاتی ہے[2]۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اس ارشاد کے بعد:

"مرا خلعت فرمود بکسوت خاص مرا مشرف گردانید" فوائد الفواد ص ۲۷ — مجھ کو خلعت سے نوازا اور خاص خرقہ سے مشرف فرمایا۔

---

[1] خدا کے تم محبوب ہو جاؤ گے، اگر تم اپنے اندر میرا رنگ ڈھنگ، میری شان و ادا پیدا کر دو گے، حضرت حق سے محبوبیت ذاتی کا جسے تعلق ہے اسی کی زبان مبارک سے قرآن میں یہ اعلان کرایا گیا ہے، قل اِن کُنتُم تُحِبُّونَ اللہَ فَاتَّبِعُونِی یُحْبِبْکُمُ اللہُ کی آیت سے کون واقف نہیں: ۱۲

[2] ایک صحیح حدیث جو عام طور سے مشہور ہے یہ اسی کا حاصل ہے ۱۲۔

علم کے پندار کا خاتمہ

پندار و خود پسندی کا فاسد مواد اگر اتنے کار گزشتہ کے بعد بھی نہ نکلتا تو کب نکلتا، اس کے بعد سلطان المشائخ کا جو حال ہو گیا تھا اس کی کیفیت بھی خود ہی بیان کرتے ہیں، شیخ کبیر نے سلطان جی کو ایک دعا سکھائی پوچھا کہ اب سناؤ، سنانے لگے، ایک لفظ کے اعراب میں شیخ نے اصلاح فرمائی، فرماتے ہیں کہ گو جو اعراب میں نے پڑھا تھا۔

"ہم معنیٰ داشت"	یہ بھی معنی رکھتا تھا۔

لیکن یہ تو ان کا نحوی علم تھا، اس سے دست بردار ہو چکے تھے۔ بس۔

"ہمچناں کہ شیخ فرمود بخواندم"	جس طرح شیخ نے فرمایا، میں نے پڑھا

شیخ نے دوبارہ سنانے کے لیے حکم دیا، دعا ر سنائی گئی۔

"و آں شیخ فرمودہ بود ہمچناں بخواندم"	اور شیخ نے جس طرح فرمایا تھا ویسا ہی میں نے پڑھا

سلطان المشائخ فرماتے ہیں، میرے اس طریقۂ عمل کو مولانا بدر الدین اسحاق دیکھ رہے تھے جب شیخ کبیر کے سامنے سے اٹھ کر ان کے پاس آیا کہنے لگے:

"نیکو کردی کہ ایں اعراب ہمچناں خواندی	اچھا کیا کہ تم نے یہ اعراب ویسا ہی پڑھا
کہ شیخ فرمودہ بود"	جیسا کہ شیخ نے فرمایا تھا،

سلطان المشائخ نے جواب میں کہا:

اگر سیبویہ کہ واضع ایں علم (نحو) ست و کل	اگر سیبویہ علم نحو کا واضع اور دوسرے تمام واضعین
دیگراں کہ بانی ایں قواعد بودند بیایند مرا	قواعد آئیں اور کہیں کہ اعراب اس طرح نہیں
گویند کہ اعراب ہمچناں نیست کہ می خوانی من	ہے جس طرح تو پڑھتا ہے، لیکن پھر بھی میں
ہمچناں بخوانم کہ شیخ فرمود"	ویسا ہی پڑھوں گا جیسا شیخ نے فرمایا۔

یہ تھا صفائی کا پہلا مقام جس پر پہنچنے کے بعد:

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست   کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

یہ تو پندارِ علم کی شکست کی تدبیر تھی جو اس زمانہ میں اپنے مریدوں کے ساتھ پیروں کا وہ طبقہ اختیار کرتا تھا جو واقعی ان کی مشاطہ گری کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیتا تھا لیکن علمی پندار سے بھی زیادہ ایک اور دوسرا عارضہ انسانی فطرت کو چمٹا ہوا ہے، عارضہ بھی ہے اور اسی پر ساری صحت مندیوں ترقیوں اور بلندیوں کا دار و مدار بھی۔

خدا کی مرضیات پر اپنے نفس کی قربانی

انسانیت کا معکوس فلسفہ جو دنیا پر چھایا ہوا ہے اب تو اس کا سمجھنا بھی آسان نہیں ہے۔ بہرحال سمجھ میں آئے یا نہ آئے مجھے تو ہندوستان کے ایک خاص عہد کی تاریخ بیان کرنی ہے جو واقعات گذرے ہیں ان کا اظہار مقصود ہے، سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے بات یہ ہے کہ مذہب کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں بجائے اپنی مرضی اور اپنے دماغی مشوروں کے حق تعالیٰ کی اس مرضی کی پابندی کی جائے جس کا اظہار پیغمبروں کے ذریعہ سے فرماتا رہا ہے اور جس کی کامل ترین محفوظ ترین آخری شکل کا نام قرآن اور اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے، خدا کی مرضی جب اپنی مرضی سے ٹکرانے لگے اس وقت خدا ہی کی مرضی کی رہنمائی قبول کر کے اسی کے تحت اپنے آپ کو ڈال دینا، اسی کی مشق کا اصطلاحی نام ہمارے بزرگوں میں یہ تھا کہ نفس کی خلاف ورزی کی مشق بہم پہنچانی چاہیے، قرآن کی آیت:

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ (القرآن الحکیم، اور روکا نفس کو "الہویٰ" سے

سے ان کی یہ اصطلاح ماخوذ تھی، خدا کی مرضیات سے نفس کی جو خواہشیں متصادم ہوتی ہیں ان ہی کا قرآنی نام "الہویٰ" ہے، ظاہر ہے کہ جب نفس کی عام خواہشوں پر آدمی کو قابو حاصل ہو جائے گا تو پھر جو خواہشیں مرضی حق کے مطابق نہ ہوں گی ان کو چھوڑ کر بہ آسانی اپنی زندگی کو رضائے الٰہی کے مطابق بنانے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

زادی کا غلط نظریہ

آزادی اور حریت کے اس دور میں جس میں نفسانی خواہشوں کی تعبیر رائے کی آزادی، فکر کی آزادی اور خدا جانے کون کون کی آزادیوں کی خوب صورت الفاظ سے کر کے انسانیت کی بلندی کا معیار یہی اب یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ جو شخص جس حد تک اپنی نفسانی خواہشوں کا پابند ہے اسی حد تک وہ آزاد ہے، حر ہے، اور جو حر ہے، وہ آزاد ہے۔ اسی پر بنی آدم کی ساری بڑائیاں ختم ہوتی ہیں۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایسی معکوس اور اوندھی ذہنیت کے زمانہ میں ی لفت نفس'' کا نظریہ جس حد تک بھی بے معنی ہو کر نہ رہ جائے کم ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ پرانے ادبیات کی پیروی میں کم و بیش اب بھی اس لفظ کا استعمال دنیا میں باقی ہے۔ لیکن اس کا کیا مطلب ہے، اس مشق کا کیا مقصد ہے، میں تو نہیں سمجھتا کہ کسی کے سامنے ان سوالات کے وہی جواب جو واقعی ان کے جواب تھے اب باقی ہوں گے، کچھ دھندلا دھندلا سا اس قسم کا تصور عام لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ صوفیہ کے نقطۂ نظر سے گویا آدمی میں ثانوی قسم کا کوئی زندہ حیوانی وجود اور بھی ہے، جس کی دشمنی اور عداوت صوفیوں کے نزدیک ضروری ہے، حالانکہ واقعہ جو کچھ ہے وہ میں عرض کر چکا حق تعالیٰ کی مرضیات کے مطابق جو زندگی گذارنا چاہتا ہے کیا اس مشق سے بے نیاز رہ سکتا ہے؟!

چراغ دہلوی کا مقولہ

بہرحال اب کسی کی سمجھ میں آئے نہ آئے لیکن ایک زمانہ تھا جس میں کامیابی کا تمام راز اسی مشق میں مستور سمجھا جاتا تھا، چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

• نفس آدمی بمنزلہ درختیست کہ بعد دمیدے	آدمی کا نفس ایک درخت کی طرح ہے شیطانی
شیطانی در ذات این کس بیخ می گیرد و محکم	وسوسوں کی مدد سے اس میں بیخ پڑتی ہے بیہودہ
می شود اگر آدمی بتدریج و سکونت بزور	درخت بن کر مضبوط ہو جاتی ہے، اگر انسان آہستہ
عبادت و تقویٰ و بقوت محبت و عشق بہر	آہستہ سنجیدگی سے عبادت و تقویٰ کے زور اور

روز آں درخت را بہ جنبانند ہر آئینہ	محبت وعشق الٰہی کی قوت سے روزانہ
بیخ او سست شود و قابل قلع گردد	اسے ہلاتا رہے گا تو یقینی طور پر وہ سست
سیر الاولیاء صـ ۲۴۲	پڑ جائے گا اور اکھاڑنے کے قابل ہو جائے گا!

اور جب یہ درخت اکھڑ جاتا ہے تو پھر آدمی کو قوانین الٰہی کی پابندی میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی،

فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی (القرآن الحکیم) جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے

کا نظارہ اسی "نَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی" کی تعمیل کے بعد ہی سامنے آجاتا ہے،

خلاصہ یہ ہے اس زمانہ میں خواہ جو بھی فیصلہ صادر کیا جائے، اور آزادی حریت جس چیز کا بھی نام رکھا جائے، لیکن ہمارے بزرگوں کے نزدیک تو

غلام حافظ ازاں زلف تابدار باد   کہ بستگان کمند تو رستگارانند

حقیقی آزادی کا صحیح ترجمہ یہی تھا اس آزادی کی تلاش میں سلطان المشائخ شیخ کبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، شیخ اس سلسلہ میں ان سے کیا کیا کراتے تھے اس کا اندازہ اسی واقعہ سے ہو سکتا ہے جس کے بعض اجزاء کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے، میں نے بیان کیا تھا کہ سلطان جی جب اجودھن میں تھے تو ان کا ایک رفیق درس بھی اس عرصہ میں اجودھن پہنچا ان کی اس حالت کو دیکھ کر جس میں بظاہر وہ مبتلا نظر آتے تھے اسے بڑا تعجب ہوا اور بولا کہ

• نظام الدین ترا چہ پیش آمد   نظام الدین تجھے کیا پیش آیا۔

میں نے لکھا تھا کہ شیخ کبیر نے اسی زمانہ میں حضرت نظام الاولیاء کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ تمہاری موجودہ حالت کو دیکھ کر اگر کوئی کچھ پوچھے تو کہنا کہ

نہ ہمرہی تو مرا راہ خویش گیر برو   ترا سعادت بادا مرا نگونساری

کیا شبہ ہے کہ سننے کی حد تک اور کہنے کی حد تک شعر بڑا لذیذ ہے لیکن جب اسی پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو کتنے ہیں جو سعادت کو چھوڑ کر نگونساری اختیار کرنے کے لیے آمادہ ہوں گے

سلطان المشائخ کا بیان ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج نے صرف شعر سنانے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اسی کے بعد آپ نے سلطان جی کو حکم دیا کہ :

"در مطبخ برود و بگو تا خوانے پر بالوان نعم آراستہ بیارند" — باورچی خانہ میں جاؤ اور کہو کہ مختلف طرح کے کھانوں سے آراستہ ایک خوان نعمت لائیں

یہ اجودھن کا وہ وقت تھا کہ جہاں ایک مدت تک سلطان المشائخ کی روایت کے مطابق کہ شیخ کبیر نے جب شروع شروع۔

"در اجودھن ساکن گشت بنان درویشانہ و چیز ہائے کہ دراں دیار خیزد چوں پیلو و مانند آں قانع گشت" — اجودھن میں قیام پذیر ہو گئے اور فقیری کی روٹی اور اس دیار کی معمولی چیزوں پر قناعت کر لی، جیسے پیلو وغیرہ۔

مخلوق اور فتوحات کی آمد

لیکن اب وہ وقت باقی نہ تھا بلکہ

"از آمد و شد خلق حد نہ بود" — مخلوق کے آنے اور لینے دینے کی کوئی حد نہ تھی

آنے والوں میں غیاث الدین بلبن جیسے سلاطین بھی تھے[۱] اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد اس اجودھن کا کیا حال ہوگا۔ نظام الاولیاء کا بیان ہے کہ :

---

[۱] سلطان المشائخ ہی کی روایت ہے کہ جس زمانہ میں بلبن سلطان ناصر الدین محمود کے نائب السلطنت ہونے کی حیثیت سے کام کرتا تھا تو ملتان جاتے ہوئے اجودھن بھی حاضر ہوا۔ ساری اسلامی فوج نے اجودھن کا احاطہ کر لیا تھا، ہر ایک شیخ کبیر سے تبرک حاصل کرنا چاہتا تھا، کوٹھے سے ایک آستین شیخ کی لٹکا دی گئی اور فوج کے لوگ اسی کو بوسہ دے کر آگے بڑھتے جاتے تھے تا اینکہ "آں ہم پارہ پارہ شد" والقصہ بطولہا آخر میں بلبن نے خدمت مبارک میں نقد اور چار گاؤں کا فرمان پیش کیا، گاؤں کے تو فرمان کو تو واپس کر دیا گیا، اور نقد فقراء میں تقسیم کرنے کے لیے قبول فرما لیا گیا بلبن نصیحت کا طلبگار ہوا، دو شعر سنا دیے گئے

فریدون فرخ فرشتہ نبود — ز عود و ز عنبر سرشتہ نبود
بداد و دہش یافت آں نیکوئی — تو داد و دہش کن فریدوں توئی

در خانہ بہ قیاس نیم شب کم وبیش نہ بستندے یعنی پیوستہ در باز بودے وطعام و نعمت موجود از کرم خدائے آئندہ و روندہ را ازاں نصیب شدے، ہیچ بخدمت ایشاں نیامدے کہ او را چیزے نصیب نہ گردے۔

گھر کا دروازہ کم وبیش آدھی رات تک بند نہ فرماتے بلکہ برابر کھلا رہتا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے جو کچھ کھانا اور نعمت موجود ہوتی آنے جانے والوں کو ملتا رہتا، کوئی آپ کی خدمت میں نہیں آتا کہ اس کو کچھ نہ کچھ حصہ نہ دیا جائے۔

(سیر الاولیار ص ۶۵)

اور سچ تو یہ ہے کہ تقویٰ کی تاریخ میں،

يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۔

بنا دیتا ہے اللہ اس کے لیے کشائش کی راہ اور روزی پہنچاتا ہے ایسی جگہ سے جہاں سے سان گمان بھی نہ ہو

کی قرآنی آیت کی ان تفسیروں کو دنیا نے کب نہیں دیکھا ہے خصوصاً اسلام تو اراک (پیلو) ہی کے پھل کھانے والوں سے شروع ہوا اور "الوان نعم" پر ختم ہوا۔

نظام الاولیار کو شیخ کا حکم بہر حال میں کیا کہنے لگا، قصہ نظام الاولیار کا سنا رہا تھا کہ شیخ کبیر شکر گنج نے ان کو مطبخ بھیجا کہ ایک مکلف خوان مرتب کر کے میرے پاس لایا جائے۔ خوان آگیا، کس لیے آیا، سلطان المشائخ ہی سے سنیے فرماتے ہیں کہ مجھ ہی کو خطاب کر کے شیخ کبیر کا ارشاد ہو رہا تھا،

• نظام! ایں خوان طعام را بر سر کن و در مقامے کہ آں یار فرود آمدہ است ببر۔

نظام! کھانے کا یہ خوان سر پر رکھو اور وہاں پہنچاؤ جہاں وہ تمہارے ساتھ فروکش ہیں!

ابھی جب ہم درس نے مولانا نظام الدین کو دلی میں محفل شکنی میں مصروف پایا تھا، اور اسی بنیاد پر ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوئے چند گھنٹے پہلے اسی اجودھن میں اس حسن ظن کا اظہار کیا تھا کہ،

• اگر در شہر تعلیم می کردی مجتہد زمانی شدی

اگر تو شہر میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتا تو مجتہد زمانہ ہوتا۔

اسی بیچارے "مجتہد زمانہ" کا یہ انجام ہے کہ اس کے سر پر خوانچہ رکھا جاتا ہے اور دور دیہ بازار کے بیچ سے بھری ہوئی مخلوق کے سامنے سے اسی کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اس طعنہ دینے والے ساتھی کے پاس اس خوان کو لے جاؤ خودداری کے گھاؤ رکھنے والے اس ٹھیس کو کیا برداشت کر سکتے تھے؟ آزاد فکر، آزاد رائے کیا اس بوجھ کو اٹھا سکتی تھی؟ "تر اسعادت باد امر انگو نساری" کی لذت صرف کانوں تک نہیں بلکہ جب روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے تو پھر سب کچھ اٹھا لیا جاتا ہے۔ "مجتہد زمانہ" سمجھنے والوں کے سامنے وہی آدمی چلا جاتا ہے، سر پر خوانچہ لیے چلا جاتا ہے" دیکھو مولانا نظام الدین اسی حال میں "اجودھن" کے بازار سے گذر رہے ہیں، خود فرماتے ہیں:

"من بحکم فرمان خواجہ آں خوان را بر سر	میں نے خواجہ صاحب کے حکم کے مطابق
گرفتم و رواں شدم و در سرائے کہ آں	خوان سر پر اٹھایا اور روانہ ہوا اور
یار فرود آمدہ بود آوردم"	جس سرائے میں وہ ساتھی ٹھہرے ہوئے تھے پہنچا آیا

"مجتہد زمانہ" ہونے کی صلاحیت کا حسن ظن رکھنے والا سلطان جی سے کس حد تک متاثر تھا، اس کا اندازہ آپ اسی سے کیجیے کہ خود حضرت ہی کا بیان ہے،

"چوں نظر آں یار بر من افتاد گریہ کناں دوید"	جوں ہی ساتھی کی مجھ پر نگاہ پڑی روتے ہوئے دوڑ پڑے

جو دلی میں اتنا بلند تھا کہ دنیا اس کو سر پر اٹھائے ہوئے تھی آج وہ ایک معمولی خدمت گاروں کی مانند برسر بازار اپنے سر پر خوانچہ لیے چلا آرہا ہے۔ یہ حال تھا ہی اتنا رقت انگیز کہ وہ "چیخ اٹھا" روتے ہوئے دوڑا۔

"وخوان از سر من فرود آورد و پرسیدن	میرے سر پر سے خوان اٹھا لیا اور
گرفت کہ ایں چہ حال ست"	پوچھنے لگا یہ کیا حال ہے۔

سلطان جی اس کے سوا کیا کہہ سکتے تھے کہ ؎

کاں تجمل کہ تو دیدی ہمہ بر باد افتاد	وہ ٹھاٹھ باٹ جو تو نے دیکھا تھا برباد ہو چکا ہے

جو دل چاہے، دماغ چاہے، وہ نہ چاہا جائے' اس کی مشق گاہ میں یہ سب کچھ کیا جا سکتا ہے' جھوٹی عزت اور جھوٹے ناموس کا علاج کرنے والے یہی علاج کرتے ہیں' سننے والا اور دیکھنے والا بھی آدمی تھا' انسان کسی حال میں بھی ہو کسی دلدل میں پھنسا ہو لیکن حقیقت شناسی کے فطری جواہر پھر بھی ان ہی کیچڑوں میں کسی سخت ضرب سے چمک اٹھتے ہیں اب وہ بھی روشنی میں تھا' اعتراف کرنے لگا کہ :

"ایں چنیں شیخے معظمے داری کہ نفس ترا	آپ اتنا عظیم المرتبت شیخ رکھتے ہیں کہ انھوں
بدیں حد ریاضت دادہ ست	نے اس ریاضت پر تم کو آمادہ کر دیا'

"نفس ترا بدیں حد ریاضت دادہ ست" یہ تھی سارے قصہ کی روح جسے افسوس اُس زمانہ میں وہ بھی پا لیتے تھے جو کچھ پائے ہوئے نہ تھے' اس نے بھی شیخ کبیر کی قدمبوسی کی تمنا ظاہر کی' سلطان جی نے کھانا کھانے پر اصرار کیا' کھانا کھا لیا گیا' اب خوانچہ خالی ہو چکا تھا' سلطان جی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد،

دانشمند خدمت گار خود را گفت کہ ایں خواں	اس عالم نے اپنے نوکر سے کہا' یہ خوان سر پر
بر سر کن برابر ما بیا	رکھو اور ہمارے ساتھ چلو۔

وہ خدمتگار سے یہ کہہ رہا تھا' لیکن خدمت لینے والے نے یہ خدمت جس کے سپرد کی تھی؛

"خیر چنانکہ آں خوان آوردہ ام ہمچناں برم	جیسے وہ خوان لایا ہوں' ویسا ہی لے
و برسانم"	جاؤں گا اور پہونچاؤں گا۔

کہتے ہوئے جس خوان کو ان کے شیخ نے سر پر چڑھایا تھا' پھر سر پہ اٹھا لیا' دانشمند مجبور تھا کیا کرتا' اسی حال میں،

"آں دانشمند برابر سلطان المشائخ	وہ عالم سلطان المشائخ کے ساتھ شیخ
بخدمت شیخ شیوخ العالم آمد"	شیوخ العالم کی خدمت میں آیا'

اس قصہ کے براہ راست راوی حضرت چراغ دہلوی نے یہ فرما کر فقرہ کو ان الفاظ

پر ختم کیا:۔

واز سر عزت را بر خاک درگاہ آں بادشاہ	اہل محبت کے بادشاہ نے سر سے غرور
اہل محبت نہاد (سیر الاولیاء ص ۲۴۲)	نکال کر خاک میں ملا یا'

نفس کی مخالفت چشتیہ کے یہاں

میر خورد نے چراغ دہلوی کی زبان مبارک سے اس قصہ کو سن کر اپنی کتاب میں درج کیا ہے' حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں طریقہ چشت کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ:

مخالفۃ النفس راس العبادۃ وموافقۃ الناس اساس الکفر	"النفس" کی مخالفت (چشتیوں) کے یہاں عبادت کی جان ہے' اور عام راہ و رسم کی پابندیوں میں پھنسے رہنا یہ ان کے یہاں کفر کی بنیاد ہے۔

اور یہ کہ "النفس ہو الصنم الاکبر" (چشتی صوفی) نفس کو "صنم اکبر" کہتے ہیں۔
چشتی مجاہدات کی یہی بنیادی اینٹ ہے' ان کا "طریقہ خاص" جیسا کہ شاہ صاحب نے اسی کے بعد نقل کیا ہے' اس دستور پر مبنی تھا:

"گر حیات خوب" خواہی نفس را گردن بزن زانکہ از نفست توی تر ہیچ دشمن وار نیست"

اور "حیات خوب" ستھری زندگی" کے حاصل کرنے کی یہ سلبی شرط تھی' یعنی اپنی مرضی اپنی خوشی' اپنی خواہش سے جس وقت بھی دست بردار ہونے کا حکم دیا جائے' آدمی اسی وقت بغیر کسی کشمکش لیت ولعل کے دست بردار ہو جائے' ظاہر ہے کہ اس ملکہ کو پیدا کرنے کی صورت اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ گو "طریقہ چشت" میں مجاہدہ کے اس پہلو پر بظاہر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور راہ کی پہلی منزل یہی ٹھہرائی گئی ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اور بھی جتنے دوسرے طرق و وسائل ہیں' ان کی مشق تو سب ہی میں کرائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس

حد تک تو دنیا کے تمام ادیان و مذاہب کے محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ جب تک نفس کی مخالفت کی مشق بہم نہیں پہنچائی جائے گی غیب کی راہ آدمی پر نہیں کھلتی، جوگیوں سے، یوگیوں سے، راہبوں سے جس سے بھی آپ پوچھیں گے پہلی بات وہ آپ کے سامنے یہی پیش کرے گا اور دل ہلا دینے والے ریاضاتِ ہائلہ جن کا انتساب مختلف مذاہب کے درویشوں، اور فقیروں کی طرف کیا جاتا ہے، دریافت سے معلوم ہوگا کہ سب کی تہہ میں یہی بات چھپی ہوئی ہے گو جس کا مطالبہ کیا گیا تھا[1] غلو پسند انسان جیسا کہ اس کا قاعدہ ہے اپنے "نشان زدہ" حدود پر ٹھہرا نہ رہا، اور نفس کی مخالفت میں بڑھا، تو اتنا بڑھا کہ جس مقصد کے لیے یہ مشق تھی خود اس مقصد کی مخالفت کی بھی پرواہ نہ کی گئی، مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہشوں کی مخالفت کے مشق کی غرض جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہی تھی کہ حق کی مرضیات کی تعمیل آدمی پر آسان ہو جائے۔ لیکن دیوانوں نے مخالفت نفس ہی کو مقصد بنا لیا، اور اس حد تک اب اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے کہ خدا کی مرضی کی بھی اس سلسلہ میں اگر مخالفت ہو رہی ہے تو اس سے بھی وہ بے پروا ہو گئے۔

مخالفت نفس ہندوستان میں

خصوصاً ہمارے ملک ہندوستان نے تو "مخالفت نفس" کے مسئلہ میں وہ عجیب تماشے تاریخ میں پیش کیے ہیں کہ شاید دنیا اس کی نظیر کے پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ اس ملک کے ہندو درویشوں ہی کا ایک فرقہ وام مارگی فرقہ تھا جو تنہائی میں عورتوں اور

[1] غلو کی ایک اچھی مثال مولانا غلام علی نے نقل کی ہے حضرت برہان الدین غریب کے ایک مرید مولانا شمس الدین فضل اللہ نامی تھے ایک دن جوش میں آکر شیخ سے عرض کرنے لگے "ایں بیچارہ می خواہد کہ ترک نفل و اوراد می کند" شیخ نے پوچھا کیوں تو بولے کہ قرآن میں ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ جو عمل نیک کرتا ہے اپنے نفس کے لیے کرتا ہے بولے کہ من برائے نفس کردہ خود عمل نہ خواہم کرد ص۱۲ ظاہر ہے کہ اسی کا نام غلو ہے شیخ مسکرائے اور فرمایا جنبیں ست یا بدکرد۔ اور جب قرآن کے مطابق ہوا تو نفس کے لیے کب رہا۔ ۱۲

مردوں کے مخلوط مجمع میں شراب پی پی کر اس کا امتحان لیتا تھا کہ عورتوں کے متعلق مردوں
کو اپنے نفس پر کتنا قابو حاصل ہے کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں سارا سارا بر اعظم ہند ایسی
خانقاہوں اور آشرموں سے بھرا ہوا تھا جن میں جوان مرد اور جوان عورتیں عریاں ہو کر
نفس کشی کی مشق کرتی تھیں، اور بات اسی حد پر پہونچ کر ختم نہیں ہو گئی تھی اگھوری پنتھ
کے فرقے بھی مخالفت نفس ہی کی ایک غلیظ نظریہ کے ساتھ اس ملک میں پیدا ہوئے اور اپنے
سارے گندے کاموں کی تعبیر "نفس کشی" سے کر کے مدعی تھے کہ ان کی آتما (روح) اس طریقہ
سے مہا آتما (روح اعظم) کے مقام تک پہنچ جاتی ہے، پنڈت دیانند سرسوتی جی کا تو ستیارتھ
پرکاش میں یہ بیان بھی ہے کسی ملک میں نفس دشمن فرقوں میں ایک فرقہ "باسمپر دائے"
ان لوگوں کا بھی تھا جو اپنے مسلک کی تعبیر "مانگ ددیا" سے کرتے تھے، پنڈت جی ہی نے اس
کا مطلب یہ بتایا ہے کہ ان کے یہاں "مخالفتِ نفس" کا سب سے اعلیٰ مقام یہ تھا کہ آدمی
اپنی ماں سے بھی بدکاری کر گزرے کہ یہ سب سے بڑی مخالفت ہے نفس کی جس پر وہ کبھی
آمادہ نہیں ہو سکتا۔ گویا جب یہ بھی کر گزرا تو اب اس راہ کی کوئی منزل باقی نہیں رہی اور
یہی ہوتا ہے ہمیشہ انجام ان لوگوں کا جو خدا کی باتوں میں اپنے دماغی وسوسوں کو شریک
کر کے اسی کو اپنا مذہب ٹھہرا لیتے ہیں، ہا! کتنا پاکیزہ اصول تھا لیکن نفس کے بندوں
نے نفس ہی کی موافقت میں مخالفت نفس کے نام سے کن تباہیوں اور بربادیوں کا اسے ذریعہ بنا دیا

مخالفت نفس وہ معتبر ہے جو رضائے الٰہی کے لیے ہو

بہرحال یہ انجام تو ان کا تھا جنہوں نے مخالفت نفس کے
طرزِ عمل کو حق تعالیٰ کی مرضیات کی موافقت کا ذریعہ نہیں بلکہ
خود اسی کو ایک اہم مقصد بنا لیا، لیکن ظاہر ہے کہ اسلام میں مخالفتِ نفس کی بذات خود
کوئی قیمت نہیں ہے۔ اس کی قیمت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس مخالفت کو رضائے
حق کی موافقت کا ذریعہ بنایا جائے، مخالفتِ نفس کے سلبی اور منفی مجاہدہ کے بعد قدرۃً یہ
سوال ہوتا ہے کہ اس مشق کی قیمت حاصل کرنے کی صحیح راہ کیا ہے؟ زندگی کو مرضیات

حق پر بآسانی منطبق کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا جب یہی اس مجاہدہ کی اصل غرض تھی، تو اب یہی تلاش کرنے کی چیز تھی کہ حق کی مرضیات کے ملنے کی ایسی راہ کون سی ہے جس میں خالق کے سوا کسی مخلوق کے دماغی مشوروں کے کانٹوں سے الجھ جانے کا قطعاً اندیشہ نہ ہو کیوں کہ اگر خالق کی مرضی کے ساتھ ساتھ مخلوق کی مرضی پر بھی ہمیں چلنا ہے تو پھر مخلوقات میں بجائے دوسروں کے خود اپنی مرضی ہی کی شرکت کے ساتھ خدا کی مرضی کی اطاعت ہم کیوں نہ کریں۔

دنیا کی جن قوموں کے پاس "خدا کی مرضی" جو پیغمبروں کے ذریعہ سے ان تک پہنچی تھی، جب "خالص خدا کی مرضی" باقی نہ رہی تو مخالفتِ نفس کی ساری ورزشوں کے بعد ظاہر ہے کہ اس ورزش سے نفع اٹھانے کی کوئی صورت ہی ان کے پاس باقی نہ رہی، غالباً غیر اقوام وادیان کے پیروؤں میں مخالفتِ نفس کی بوالعجبیوں کے رواج پذیر ہونے کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ جس مقصد کے لیے ان کے بزرگ نفس کشی کراتے تھے، جب اس مقصد کا حصول ہی ان کے لیے ناممکن ہو گیا تو انھوں نے بذاتِ خود "نفس کشی" ہی کو اپنا بالذات مقصود بنالیا، چوں کہ مخالفت نفس کی انتہائی ہولناک بلکہ مہلک غیر فطری" شکلوں میں بعضوں کو "یکسوئی کے مواقع ہاتھ آجاتے ہیں، آخر جس نے کھانا بھی چھوڑ دیا ہو، پینا بھی چھوڑ دیا ہو، پہننا بھی چھوڑ دیا ہو، ظاہر ہے کہ اس کے دماغ میں حرکت ہو تو کیوں ہو۔ انسانی دل و دماغ میں حرکت و جنبش تو ان ہی ضروریاتِ حیات کی فراہمی کے لیے ہوتی ہے اور یہ ایک مذہبی نہیں بلکہ فطری بات ہے، انسان کی فطرت کا قانون ہے کہ یکسوئی کے بعد آدمی کی پوشیدہ قوتیں فعالیت کا رنگ اختیار کر لیتی ہیں، کیوں کہ ضروریات حیات میں ژولیدہ قلوب ان قوتوں کے آثار سے محروم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو حیرت ہوتی ہے، لوگ ان پوشیدہ قوتوں کے کرشموں کے دکھانے والوں کے معتقد ہو جاتے ہیں، وہ مسکین یہ سمجھ لیتا ہے کہ لوگوں کا معتقد ہو جانا یہی مذہب کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اسی کو "وصول حق"

قرار دے کر خود بھی فریب میں مبتلا رہتا ہے اور دوسروں کو بھی فریب میں مبتلا کرتا ہے۔

فریب نفس

سمجھ میں نہیں آتا کہ اندھوں کے مقابلہ میں اگر سوانکھوں کے پاس بینائی کی قوت پائی جاتی ہے، ایسی بینائی جس سے رنگ، روشنی وغیرہ کو وہ دیکھ سکتا ہے، جن کے دیکھنے سے اندھے معذور ہیں، تو کیا یہ سوآنکھوں اور بینائی والوں کا یہ حال اس کی دلیل ہے کہ وہ خدا رسیدہ، اللہ کے برگزیدہ ہیں، چوں کہ میں سنتا ہوں، اس لیے میں ولی ہوں، چونکہ میں دیکھتا ہوں اس لیے قطب ہوں۔ اگر دعویٰ اور دلیل کی یہ صورت مضحکہ خیز ہے تو پھر یہ بات کہ میں چونکہ تھاٹ ریڈر ہوں اس لیے ولی ہوں، مجھے اشراف علی الضمائر ہوتا ہے، لوگوں کے قلبی اور دماغی خطرات کا علم ہو جاتا ہے اس لیے برگزیدۂ حق ہوں۔ میں کچھ پیش گوئیاں کر سکتا ہوں اس لیے رسیدۂ حق ہوں۔ بتایا جائے کہ دعویٰ اور دلیل کی ان صورتوں پر بھی ہنسی کیسے رک سکتی ہے، دین کا مقصد تو خدا کی مرضی کو خدا کی خالص مرضی کی شکل میں پانا ہے، کہ شخصی ہستی ہو یا کائناتی ہستی دونوں ہی معمہ کا حل اسی مرضی کی یافت کے بغیر ناممکن ہے، عقل اس معمہ کے حل میں درماندہ ہو چکی ہے۔

لیکن لوگوں نے بجائے اس کے باطنی قوتوں کے بیدار کرنے، احساس و علم کی بعض چھپی ہوئی طاقتوں کے ابھارنے ہی کا نام دین اور مذہب رکھ لیا، حالاں کہ اگر اسی کا نام مذہب ہے تو پھر وہ بیچارہ پہلوان جو مٹی اور گرد کو بازوؤں پر مل مل کر اپنے مسل اور عضلات میں مقاومت کی قوتوں کو برسرکار لاتا ہے، ان کو یا جمناسٹک والوں یا مداریوں کے تماشہ والوں کو بھی دین اور مذہب کی بلندی کا کوئی حصہ کیوں نہیں عطا کیا جاتا، آخر یہ لوگ بھی تو اپنی پوشیدہ قوتوں ہی کو بیدار کرتے ہیں، ان ہی چھپی ہوئی طاقتوں کو ابھارتے ہیں جن کے امکانات ان کی فطرت میں پوشیدہ تھے۔

یہ ساری بے تمیزیاں دراصل پیدا ہی اس سے ہوئیں کہ "حق کی مرضی" کو ان قوموں نے "حق کی مرضی" کی شکل میں باقی نہ رکھا، مقصود کا چہرہ نگاہوں سے چھپ گیا، وہ دالیں

ہوئے اور وہاں واپس ہوئے جہاں سے عدا ہی جانتا ہے کہ "مرضیٔ حق" کی تلاش کی طرف انھیں کب واپسی میسر آئے گی، وہ قومی نخوتوں کے شکار رہیں، اپنی قوم اپنے وطن اپنی زبان کے سوا کسی دوسری قوم کسی دوسرے ملک کسی دوسری زبان میں وہ خدا کی مرضی کو ڈھونڈھنا نہیں چاہتے حالاں کہ جس ذات گرامی نے (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری دفعہ کامل ترین شکل میں "خدا کی مرضی" کو دنیا پر ظاہر کیا، اس نے اپنی دعوت کو، اپنی آواز کو، اپنی ہمدردیوں کو کسی قوم، کسی ملک، کسی زبان کے ساتھ مخصوص نہیں رکھا ہے، وہ جہان کا رسول بن کر آیا ہے، عالمین کے لیے رحمت بن کر آیا ہے، لیکن قومی نشوں کے متوالے اسے اب تک عرب ہی کا رسول، امیوں ہی کا پیغمبر، مسلمانوں کا ہی نبی باور کر رہے ہیں۔

خواجگانِ چشت کے یہاں مجاہدہ

میں پھر دور نکلا جا رہا ہوں، عرض یہ کر رہا تھا کہ ہندوستان کے "خواجگانِ چشت" مخالفتِ نفس کی ممارست و مشق کے سلبی مجاہدہ کے بعد پھر کس اثباتی مجاہدہ میں لوگوں کو مشغول کرتے ہیں؟

ایک سوال ہے اور بڑا، بلکہ بڑے ہونے کے ساتھ دلچسپ سوال بھی ہے۔ میں نے ابتدا ہی میں اپنے دعویٰ کا اعلان کیا ہے کہ اس سلبی مشق کے بعد جس ایجابی مشغلہ میں اپنے وابستوں کو وہ غرق کرتے تھے، دنیا سن کر ضرور جھجکے گی، جن چشتیوں کا کام آج صرف گانا بجانا سمجھا جاتا ہے، یقیناً ان ہی کے متعلق یہ سن کر اچنبھا ضرور ہوگا، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ وہ یقینِ خالص کے تحت دینی زندگی کو منظم کرنے کے لیے اس کتاب میں غوطے دیتے تھے جس کے سوا رب العلمین کی طرف منسوب ہونے والی کتابوں میں ریب اور شک سے دنیا کی کوئی کتاب اب پاک نہیں ہے، جس ملک میں مذہب کو فلسفہ بنانے یا میتھالوجی، بنانے میں آخری زور دکھلایا گیا ہو، میں نے عرض کیا تھا، اسی ملک میں اس کے سوا "چارہ کار" بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ لوگوں میں "مرضیٔ حق"

کے اسی لاریبی مظہراتم" القرآن الحکیم" کے ذریعہ سے لازوال لیقین کی روشنی پیدا کی جائے اور یہی میرا دعویٰ ہے کہ" خواجگان چشت" کے طریقہ میں بھی ذکر و شغل، مراقبہ وغیرہ کے صوفیانہ مشاغل پائے جاتے ہوں، جیسا کہ عام طور پر صوفیاء اسلام کے دوسرے طرق و سلاسل میں پائے جاتے ہیں یا نہ پائے جاتے ہوں۔

لیکن جن بزرگوں کو سرزمین ہند میں طریقہ چشتیہ" کے معماران اول کا مقام حاصل ہے جہاں تک میں نے ان کے حالات کا مطالعہ کیا ہے اس سے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایجابی مجاہدات کے سلسلہ میں ان کا سارا زور اس یقین کی پیدائش پر مرکوز تھا جو قرآن سے پیدا ہوتا ہے کہ یقین کا یہی ایک ایسا سرمایہ یا کارگر حربہ ہو سکتا ہے جیسا کہ تفصیلاً عرض کر چکا ہوں کہ اس سے فلسفیانہ دین یا قصاصانہ دھرم والوں کا عملی مقابلہ ممکن ہے۔ اس "لازوال یقین" سے پیدا ہونے والی عملی زندگی کے سامنے یقین کیجئے کہ نہ وہ زندگی ٹھہر سکتی ہے جو فلسفیانہ نظریات کے زیر اثر منظم ہوئی ہو اور نہ وہ زندگی جس پر صرف مبالغہ آمیز خوارق و عجائب کے افسانوں کا دباؤ ہو۔ میں کہہ چکا ہوں کہ فلسفہ ہو یا افسانوی وسوسہ، ظاہر ہے کہ دونوں کی بنیاد میں صرف شک ہے ظن ہے تخمینہ ہے، رجم بالغیب ہے، جو کچھ کہا گیا ہے بے دیکھے کہا گیا ہے بے جانے کہا گیا ہے۔ دونوں طریقوں سے پیدا ہونے والی مذہبی زندگیوں کی گرفت دکھانے والے خواہ قوت کی جس شکل میں بھی اسے دکھاتے ہوں، لیکن جس کی آخری بنیاد میں یقین نہیں ہے انسانی فطرت پر اس کی گرفت اتنی سخت ہو ہی نہیں سکتی جو صرف کامل یقین ہی سے پیدا ہو سکتی ہے آپ یقین کیجئے کہ جس ملک میں کام کرنے کی خدمت چشت کے پیشواؤں کے سپرد ہوئی اس میں تو خوارق اور کرامتوں سے بھی کام نہیں چل سکتا تھا، میں بتا بھی چکا ہوں اور کون نہیں جانتا کہ" مخالفت نفس" کی پریکٹس نے عوام نہیں تو اس ملک کے خواص میں وہ ساری خصوصیتیں پیدا کر دی ہیں جن سے ان خوارق کا تعلق ہے جو ہر

اس شخص سے صادر ہو سکتے ہیں جس نے "مخالفت نفس" کی مشق کے ذریعہ سے یکسوئی پر قابو حاصل کیا ہو۔ اس کے لیے تو خدا کے ماننے کی بھی ضرورت نہیں، آج یورپ میں کتنے اسپریچولزم، مسمریزم، ہپناٹزم اور خدا جانے کون کون سے ازم والے ہیں، جن کی زندگی کو خدا کے عقیدہ کی ہوا بھی نہیں لگی ہے، اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے دیکھنے سننے، سونگھنے، سمجھنے کی احساسی وادراکی قوتوں کے لیے اگر خدا کا ماننا ضروری نہیں ہے تو پھر اسی قسم کی بعض پوشیدہ ادراکی قوتیں اگر کسی کی برسرکار ہو جائیں تو اس کے لیے خدا کا ماننا کیوں ضروری ہو۔

مگر ظاہر ہے کہ ان سارے تماشوں سے سب کچھ ہو سکتا ہے، آدمی ہوا پر اڑ سکتا ہے، پانی پر چل سکتا ہے، دلوں کے بھید بتا سکتا ہے، لیکن "معمہ کائنات" کے "یقینی حل" کی جو قدرتی راہ ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ "خالق کائنات کی مرضی" کی بازیافت کا جو طبعی طریقہ ہے اس سے بے تعلق ہونے کے بعد "یقین، وسکینت" کی کیفیت سے وہ اسی طرح محروم رہے گا جیسے ایک عام آدمی کا حال ہے۔

اور یہی ایک چیز ہے جو قرآن کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے کسی کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

خواجگانِ چشت اور قرآن

"چشتی اور غزلوں کے دیوان" کی جگہ یہ واقعہ ہے کہ اس زمانہ میں "چشتی اور قرآن" کی ترکیب لوگوں کو ایک عجیب اکھڑی اکھڑی سی، ان میل، بے جوڑ بات محسوس ہو رہی ہوگی، لیکن میں کیا کروں کہ میری معلومات یہی ہیں، اور آپ کو چاہیے کہ میرے بیان سے پہلے انکاری یا استعجابی فیصلے کے صادر کرنے میں عجلت نہ کریں تمہیدی گفتگو

بہت طویل ہوگئی، مختلف اغراض و مقاصد کے تحت مجھے اپنی اس تمہید میں بہت سی باتوں کو طے کرنا تھا، خدا کرے جو میں نے سوچا ہے، وہی اثر قلوب پر مرتب بھی ہو۔ اب سیدھے سادے الفاظ میں اپنے اس عجیب و غریب دعوے کے متعلقہ معلومات کو پیش کرتا ہوں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ خواجگانِ چشت میں پہلی ہستی جو اس ملک میں آئی وہ حضرت خواجہ بزرگ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ اتنا تو مسلم ہے کہ حضرت تو اجہ حافظ قرآن تھے، مناقب العارفین میں ہے کہ گھر سے نکلنے کے بعد حضرت خواجہ

مُدتے در سمرقند و بخارا ماند و حفظ قرآن و علوم ظاہری تحصیل کرد (ص ۲۵۰)

گر اس سلسلہ میں حضرت والا کے متعلق مجھے جس تفصیل سے عرض کرنا ہے ابھی نامکمل ہونے کی وجہ سے میں ان کے متعلق سر دست اسی پر اکتفا کر کے درخت پر بحث کرنے کے بجائے چاہتا ہوں کہ اس کے پھلوں کا کچھ ذکر کر دوں۔

آخر جس درخت کے پھلوں کو ہم پہچانتے ہیں آپ مجھے روک نہیں سکتے، اگر خود اس درخت کے پہچاننے کا بھی دعویٰ کر دوں، اس لیے خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تو اپنے بیان کو ملتوی صرف ملتوی کرتے ہوئے ان کے بعد کی کڑیوں پر آتا ہوں۔ سب جانتے ہیں کہ اس سلسلہ میں پہلا نام مبارک حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ المعروف بہ قطب صاحبؒ کا آتا ہے، حضرت قطب کے ان سلبی مجاہدات کا ذکر مقصود نہیں ہے جو اپنے مرشد کے زیر ہدایت انجام دئے گئے کیوں کہ نمونہ کے لیے میں شیخ کبیر کے طرز عمل کو پیش کر چکا ہوں، بتانا یہ ہے کہ جب سلب اور نفی کی ساری منزلیں طے ہو چکیں تو ان کا آخری مشغلہ کیا رہ گیا تھا؟ سنیے ان کے بیک واسطہ مرید و جانشین حضرت سلطان المشائخ کی شہادت سنیے۔ فوائد الفواد میں ہے۔ حسن علا سنجری لکھتے ہیں، یہ بیان ۱۲ر شوال روز چہار شنبہ ۷۱۲ھ کا ہے۔

لکھتے حکایت بزرگی شیخ قطب الدین بختیار   شیخ قطب الدین بختیار کاکی کی بزرگی کا

استاد قدس اللہ سرہ العزیز فرمودؒ	تعصہ لینا پڑا۔

کیا فرمائیں گے، کیا یہ کہ قطب بختیار رحمۃ اللہ علیہ قرآن کی تلاوت بہت کیا کرتے تھے، یا یہ فرمائیں گے کہ وہ حافظ تھے، بچپن میں انھوں نے قرآن یاد کیا تھا، نہیں یہ نہیں بلکہ

"فرمود کہ در آخر عمر قرآن یاد گرفت چوں تمام محفوظ شد آں گاہ نقل فرمودؒ ص ۹۷	فرمایا کہ آخر عمر میں قرآن پاک حفظ کیا جب وہ پورے طور پر محفوظ ہوگیا تو اس وقت اسے منتقل کیا'

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ جب سب کچھ کر چکے، تزکیہ و تصفیہ کے سارے مراتب سے فارغ ہو چکے تو دل و دماغ کی جو تختی دھو کر صاف کی گئی تھی، اسی صاف شدہ تختی پر جو نقوش آخر عمر تک سرزمین ہند کے اسلام کا دوسرا بنیادی معمار ثبت کرتا رہا وہ صرف "یقین" و "اذعان" کا وہی لاریبی سرمایہ تھا، جس کا نام "القرآن" ہے اس کے بعد زندگی کی آخری سانس تک یہی مجاہدہ جاری رہا تا اینکہ جب یہ مجاہدہ بھی پورا ہوگیا یقین کا یہ سارا سرمایہ ہضم ہوگیا تب "آں گاہ نقل فرمود" یہ خواجہ بزرگ اجمیری قدس سرہ العزیز کے پہلے خلیفہ اور جانشین کے متعلق شہادت ہے، ایسی شہادت جس سے زیادہ معتبر قابل وثوق شہادت اور کیا مل سکتی ہے کہ خود سلطان المشائخ کا یہ براہ راست بیان ہے۔

خواجہ حمید الدین ناگوری	طریقہ چشت کا جو پہلا پودا اس سرزمین میں آکر نصب ہوا، اس کے ایک ممتاز پھل (قطب صاحبؒ) کے متعلق تو یہ رپورٹ

ہے، عوام واقف نہ ہوں، لیکن خواص تو جانتے ہیں کہ خواجہ اجمیری قدس سرہ کے ایک اور نامور خلیفہ حضرت حمید الدین الناگوری السوالی ہیں۔ شیخ محدث ان کے ذکر میں لکھتے ہیں:

از اعاظم خلفاء حضرت خواجہ بزرگ معین الحق والدین است"	خواجہ معین الدین چشتی کے بڑے خلفاء میں سے ہیں۔

صاحب سیر الاولیاءؒ ہم خرقہ شیخ الاسلام قطب الدین بختیار اوشی قدس سرہ "سمان

روشناس کراتے ہیں، ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے ایک دلچسپ سوال کے جواب میں لوگ ان ہی حمید الدین الناگوری رحمۃ اللہ علیہ کا نام پیش کرتے ہیں، یعنی دلی کو پایۂ تخت بنا کر مسلمانوں نے ہندوستان کو باضابطہ دار الاسلام بنانے کا اعلان جب کیا تو اس نئے جدید دار الاسلام میں سب سے پہلے پیدا ہونے والا مسلمان کون تھا؟

شیخ محدث دہلوی نے خواجہ حمید الدین سے ان کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے:

"اول مولودے کہ بعد از فتح دہلی درخانۂ مسلمانان آمدہ منم" اخبار ص ۳۰	دہلی فتح ہونے کے بعد مسلمان کے گھر پیدا ہونے والا سب سے پہلا بچہ میں تھا۔

ابوالفضل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے معزز دولت مند اسلامی خانوادے سے آپ کا تعلق تھا، لکھتا ہے،

شیخ حمید الدین سوالی ناگوری پور شیخ احمد در سرآغاز جوانی لبس نکورو دخواستہ ثروت و دولت یاد می (؟)	شیخ حمید الدین سوالی ناگوری آغاز جوانی میں خوب رو اور ایک صاحب ثروت آدمی تھے۔

یعنی صرف کسی خواستہ دار گھرانے ہی سے تعلق نہ تھا بلکہ بذات خود بھی امیرانہ شکل وصورت رکھتے تھے جو عموماً ناز و نعمت میں پلنے والوں کی خصوصیت ہے۔ درمیان میں کند ذہنی اور قلبی انقلابات سے گذرنا پڑا۔ بڑا طویل قصہ ہے آخر میں اسی نیکو رو خواستہ دار نوجوان کو مارواڑ کے علاقہ ناگور (نواگرام) کے ایک گاؤں سوالی میں ان کو دیکھا گیا۔ میر خورد نے لکھا ہے:

یک بیگہ زمین داشت نیم بیگہ ازاں بدست مبارک بکلند (کدال) راست کردے و چیزے بکاشتے تا ایں غایت کہ آں رسیدے (فصل تیار ہوجاتی)، نیم بیگہ دیگرے	ایک بیگہ زمین تھی اس سے آدھا حصہ اپنے دست مبارک سے تیار کرتے اور کچھ چیز بودیتے جب یہ فصل تیار ہوتی دوسرا آدھا تیار کرتے اور اس میں

راست کردے درپیرہ بکلنتے (سیرالاولیاء ص ۲۰)	کچھ لگا دیتے۔

خواجہ بزرگ نے اپنے محبوب اور استباز مرید کو سلطان التارکین کا خطاب عطا فرمایا تھا' فرماتے' پیار کے لہجہ میں فرماتے،

' التارک للدنیا والنازع عن العقبی سلطان	دنیا ترک کر دینے والا اور عقبی کی تلاش میں
التارکین حمید الدین الصوفی ' (اخبار ص ۲۰)	ہمہ تن مصروف سلطان التارکین حمید الدین صوفی

علوم رسمیہ میں بھی پایہ بڑا بلند تھا' عمر بھی کافی طویل ہوئی۔ بعض تحریری یادگاریں اب بھی پائی جاتی ہیں جن سے علمی جلالتِ شان کا پتہ چلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ علم کا جو بوجھ آپ پر لدا ہوا تھا جب ارادہ ہوا کہ ہم ہی اس پر لد جائیں' محمول کی جگہ علم ہی ہمارا حامل ہو جائے اسی کی عملی ترکیب سیکھنے خواجہ اجمیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خاندانی اعزہ نے بری طرح ان کا پیچھا کیا کہ آخر میں ناصحانِ مشفق کو خطاب کر کے فرمایا۔

' بروید بنشینید منکہ ازار بند خود چناں	آپ لوگ جائیں میں نے ازار بند اس
محکم بستہ ام[1] کہ فردا شاید بحوران جنت	قدر مضبوط باندھ لیا ہے کہ کل شاید
ہم باز نہ کنم (سیرالاولیاء ص ۱۵۶)	جنت کی حوروں کی وجہ سے بھی نہ کھولوں'

[1] اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ برہم چاریوں کی زندگی آپ نے اختیار فرمائی تھی' آپ بیوی بھی رکھتے تھے بال بچے بھی ہوئے' نسل آپ کی مدتوں باقی رہی کیا تعجب ہے کہ اب بھی ہو' آپ کی بیوی صاحبہ کا ایک دلچسپ لطیفہ تاریخوں میں نقل کرتے ہیں' کہتے ہیں کہ ناگور کے مقطع (صوبہ دار) نے شیخ سے چاہا کہ کچھ اس کی امداد قبول کریں' لیکن پذیرائی نہ ہوئی۔ اس نے بادشاہ غالباً نصیر الدین محمود یا التمش کو ان کے حالات لکھ بھیجے۔ دلی سے پانصد تنکہ نقرہ و فرمان یک دیہ صوبے دار کے پاس آیا کہ فوراً شیخ کی خدمت میں حاضر کرو۔ صوبہ دار لے کر حاضر ہوا۔ آپ دیوان خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے' صوبہ دار نے حال سنایا' کچھ نہ بولے' اندر زنانہ میں تشریف لے گئے۔ بیوی سے جا کر واقعہ کا ذکر کیا۔ اس وقت بیوی صاحبہ کی اوڑھنی پھٹی ہوئی تھی اور شیخ کی لنگی میں بھی پیوند تھے مگر سنتے ہو اس حال میں بھی اسلام کی خاتون (باقی اگلے صفحہ پر)

آپ کے خطوط کا ایک بڑا مجموعہ حضرت زکریا بہاء الدین ملتانی کے نام ہے جن کا نقطۂ نظر اس راہ میں ابوذری نہیں، سلیمانی و عثمانی تھا' اس لیے دونوں میں سوال وجواب کا سلسلہ جاری رہتا تھا' ان کے مکاتیب کی قیمت کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے جیسا کہ شیخ محدث نے لکھا ہے کہ سلطان المشائخ:

بکلمات اورا از تصنیفات او انتخاب نموده (ص ۳۴) ان کی تصنیفات سے ان کے کلمات عالیہ منتخب کیے

سلطان التارکین شیخ حمید الدین ناگوری ہندی خواجگانِ چشت میں جس مقام رفیع کے مالک ہیں اس کے لیے مذکورۂ بالا اجمالی تعارف غالباً کافی ہے اب سنیے حضرت شیخ محدث دہلوی شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنیے کہ ان کا طریقہ خاص جو صدیوں ان کے سلسلہ میں معمول بہ رہا وہ کیا تھا؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۲) کا حال سنتے ہو' شیخ سن رہے تھے' اے خواجہ تو چہ می خواہی کہ نفقہ چندیں سالہ خود را باطل کنی' تو خاطر جمع دار من دو سیر ریسماں بدست (دو سیر سوت کات لیا ہے) خود رشتہ ام ازاں مقصد ترا جامہ خواہد شد کہ ترا فوطہ دلنگی) و مرا دامنے (اوڑھنی) مرتب خواہد شد (سیر۔ ص ۱۵۷) ظاہر ہے کہ جس کی بیوی کا یہ حال ہو اس کا شوہر سلطان التارکین اگر ہو جائے تو کیا تعجب ہے ۱۲۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) لہ میر خورد نے انتخاب کے طریقہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مطالعہ کی کتابوں میں نشان لگانے کا اس زمانہ میں کیا طریقہ تھا' اس کا پتہ چلتا ہے۔ سلطان المشائخ بقلم مبارک خود بعلامت "خ" در حاشیہ اختیار کردے "خ" سے شاید ترجیح مراد ہو یا محبت کا مخفف ہو' واللہ اعلم' ایک اور دلچسپ بات میر خورد نے یہ لکھی ہے کہ شیخ حمید الدین اور شیخ زکریا بہاء الدین میں خط و کتابت جو ہوتی تھی اس میں ذریعہ یہ تھا کہ سوداگرے بود در ناگور کہ کنجد (تل) از ناگور در ملتان بردے و از ملتان پنبہ و روئی) در ناگور آورد۔۔۔! یہی سوداگر دونوں کے درمیان ڈاکیہ کا کام انجام دیتا تھا' معلوم ہوتا ہے کہ مارواڑ' ناگور وغیرہ میں روغنی دانے اور ملتان میں کپاس کی کاشت اس زمانہ میں ہوتی تھی' کیا تعجب ہے کہ شیخ ناگوری بھی تل ہی کی کاشت کرتے ہوں کہ تھوڑی زمین سے نفع اٹھانے والے زیادہ تر اسی قسم کی قیمتی کاشت اختیار کرتے ہیں۔

بادشاہ محمود خلجی

واقعہ یہ ہے جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے کہ دلی کی مرکزی حکومت کی مرکزیت ٹوٹ کر چند حصوں میں جب تقسیم ہو گئی تو ان میں ایک مستحکم علم دوست دین پژوہ حکومت شادی آباد مانڈو کی بھی تھی، شادی آباد مانڈو کے بادشاہوں میں ایک مشہور بادشاہ محمود خلجی ہیں جنہوں نے مالوہ کے سوا۔

تمام ولایت بوندی ومارواڑ بزور شمشیر برگرفت (سیر المتاخرین ص ۱۷۱)	جنہوں نے بوندی اور مارواڑ کا تمام علاقہ قوت سے حاصل کیا۔

اسی وجہ سے اجمیر، ناگور وغیرہ کے علاقے بھی اسی کے دائرہ حکومت میں شریک ہو چکے تھے محمود خلجی کی عظمت و شوکت کا چرچا ہندوستان سے باہر نکل کر دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمانوں تک پہنچا ہوا تھا، ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے۔

"خواجہ جمال الدین استرآبادی از جانب سلطان ابوسعید مرزا ہا گزیں ارمغاں پیش آوردہ"	بادشاہ ابوسعید مرزا کی طرف سے خواجہ جمال الدین نے قیمتی تحفے لاکر پیش کیے۔

یعنی تیمور کے پوتے نے دربار مانڈو میں اپنی سفارت بھیجی تھی، ہندوستان کی اس نئی طاقتور حکومت کا شہرہ سن کر حسب دستور مختلف بلاد و امصار سے لوگ شادی آباد کی طرف کھنچے چلے آتے تھے، شاید پہلے بھی کہیں ذکر آیا ہے کہ علماء اور صلحاء کو اپنے شہر میں لاکر بسانے اور اپنے ملک میں آباد کرنے کا محمود کو خاص شوق بھی تھا، مآثر رحیمی میں محمود خلجی (سلطان مالوہ) کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"چوں سلطنت باوقار گرفت در تربیت علماء و فضلاء کوشید و مدارس ساخت"	جب حکومت نے قوت حاصل کرلی تو شاہ نے علماء اور فضلاء کی تربیت کی کوشش کی اور مدارس کھولے۔

اس نے صرف یہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ:

"زر بہ اطراف واکناف عالم فرستادہ و مستعداں را طلب داشت"	دنیا کے دور دراز گوشوں میں روپے بھیج کر وہاں سے مستعد لوگوں کو بلایا،

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ بادشاہ کے اس عجیب و غریب ذوق و شغف کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں مالوہ کے جنگلوں کے بیچ کا یہ شہر[1]

"در زمان او یونان ثانی گشت" ص۳۵۔ اس کے زمانہ میں یونان ثانی بن گیا'

تاج الافاضل

بہرحال اطراف و اکناف عالم میں روپے بھیج بھیج کر جن اہل علم و کمال والوں کو محمود خلجی نے مالوہ بلایا تھا ان میں حضرت امام محمدؒ بن حسن الشیبانی صاحب ابی حنیفۃ الامام کے خاندان کے ایک بزرگ بھی تھے جنہیں بادشاہ نے تاج الافاضل کا خطاب دیا تھا' اجمیر شریف کے قضا ان کے سپرد ہوئی تھی۔ قیام گاہ راجپوتانہ کے

[1] ابوالفضل نے مانڈو کی اسی توجیہ اور جنگل میں اس شہر کو بسا کر جس راجہ نے منگل منایا تھا یہ عجائی قصہ نقل کیا ہے کہ کسی کسان کی درانتی سنگِ پارس جو اس علاقہ میں کار آگہاں ہندی نشاد کے خیال کے مطابق پایا جاتا ہے' اس سے چھو گئی۔ بجائے سیاہی کے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا' کسان غریب بیچارہ پریشان ہوا کہ یہ کیا مصیبت آئی' مقامی لوہار کے پاس اصلاح کے لیے گیا' لوہار نے پہچان لیا کہ یہ تو سونا ہو گئی ہے' واقعہ پوچھا کسان نے اس پتھر کا پتہ دیا جس کا یہ کرشمہ تھا' لوہار نے اس پتھر کو اٹھا لیا' کچھ دن خود نفع اٹھایا اور آخر میں اس عہد کے راجہ بکرماجیت سنگھ دیو کی خدمت میں اس پتھر کو نذر گذران دیا۔ تمنا صرف یہ ظاہر کی کہ میرے نام سے ایک قلعہ بنا دیا جائے۔ لوہار کا نام "مانڈن" تھا اسی کے نام پر راجہ نے بارہ میل کے دور میں قلعہ بنایا' پتھر جو قلعہ میں لگائے گئے ہیں لوہار کی مناسبت سے سندان (نہائی) کی شکل کے ہیں جب مالوہ کی مستقل حکومت کا مانڈو دار السلطنت قرار پایا تو اس کا نام شادی آباد رکھ دیا گیا' لیکن پتہ چلا نہیں مسلمانوں نے اپنے عہد میں اس قلعہ کی عمارتوں میں بہت کچھ رد و بدل کیا' بلکہ گویا نیا قلعہ تعمیر کیا' ایک ہشت منظری منار درمیان قلعہ میں تھا جس سے دور دور کے مقامات نظر آتے تھے۔ شاہ ہوشنگ کی قبر پر جو گنبد ہے ابوالفضل نے لکھا ہے کہ گرمیوں میں اس سے پانی جھڑتا رہتا ہے' لوگ اس کو ہوشنگ کی کرامت خیال کرتے ہیں' ژرف نگاہ داند کہ حال چیست' واللہ اعلم ژرف نگاہ نے کیا تحقیق کی ہے' تقریباً ایک سو ستر سال تک مالوہ میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم رہی اکبر کے زمانہ میں دلی سے الحاق ہو گیا۔ ۱۲

مشہور شہر نارنول میں تھی جو کسی زمانہ میں شرفا اسلام کا ایک بڑا مرکز تھا، تاج الافاضل کے صاحبزادے علامہ مجد الدین الشیبانی تھے جو قاضی مجد کے نام سے مشہور تھے، قاضی مجد کے سات صاحبزادے تھے، شیخ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ:

"قاضی مجدالدین را ہفت پسر بود ہمہ دانشمند و عالم، متقی و متدین	قاضی مجدالدین کے سات لڑکے تھے اور سب کے سب عالم، متقی اور دین دار تھے۔

لیکن ان ساتوں بھائیوں میں شیخ احمد مجد شیبانی نے اپنے وقت میں بڑی عظمت و شہرت حاصل کی، یہ نارنول سے اٹھارہ سال کی عمر میں اجمیر شریف چلے آئے تھے، اجمیر شریف میں اس وقت سلطان التارکین خواجہ حمیدالدین ناگوری جن کا تعارف کرا چکا ہوں، ان ہی کے خاندان کے ایک بزرگ خواجہ حسین ناگوری کی معرفت و ہدایت کا چراغ روشن تھا۔ شیخ احمد مجد خواجہ حسین ناگوری ہی کے شاگرد و مرید تھے، اخبار میں نے شیخ احمد مجد کے متعلق ذکر کیا تھا کہ عربی زبان پر ان کو اتنی دسترس حاصل تھی کہ:۔

"در عربی و فارسی تقریر کردے (اخبار)	عربی اور فارسی میں تقریر کرتے تھے۔

قاضی شیخ مجدالدین

تقریباً جو را نوے سال کی عمر ہوئی، عمر کا زیادہ حصہ اجمیر میں گذرا لیکن وفات ناگور میں ہوئی، شیخ محدث نے ان ہی کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کے معمولات میں ایک اہم ضروری معمول یہ تھا کہ عصر کے بعد:

"تفسیر مدارک میان اہل مجلس بیان فرمودے"	مجلس میں تفسیر مدارک کا درس دیتے!

یہ بھی لکھا ہے کہ:

ہفتاد سال در اجمیر بر ہمیں منوال گذرانید	اجمیر میں ستر سال اسی طور پر گذارے

مدارک پڑھاتے وقت ان پر جو حال طاری رہتا تھا، شیخ محدث نے اس کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے:

"در بیان وعدہ و وعید چنداں گریہ	وعدہ وعید کی آیتوں میں اس قدر روتے

وحالت کردے کہ صوفیاں در حالتِ	اور ایسا حال طاری ہوتا جیسا مجلس سماع میں
سماع کنند وچشماں او از غایت بکار	صوفیوں پر، اور آپ کی آنکھیں بکثرت گریہ و
و بیداری سرخ و مرملاآشوب زدہ بود'	شب بیداری کی وجہ سے آشوب کر آتی تھیں۔

لیکن اس شیبانی بزرگ نے اس طریقہ کو کیا ہندوستان سے باہر کسی دوسرے اسلامی ملک سے یہاں داخل کیا تھا؟ مجھے اسی کے متعلق عرض کرنا ہے' شیخ محدث کی شہادت ہے،

"وایں وظیفہ تفسیر مدارک طریقہ سلوک مشائخ ایشاں است"	تفسیر مدارک کا یہ وظیفہ ہی ان مشائخ کا طریق سلوک تھا۔

"مشائخ ایشاں" کون لوگ ہیں' ایشاں کی شرح میں محدث ہی فرماتے ہیں:

بکہ خواجہ حسین ناگوری شیخ حمید الدین صوفی نیز ہمچنیں می کردند (اخبار الاخیار ص ۱۸۶)	خواجہ حسین ناگوری شیخ حمید الدین صوفی بھی یہی کرتے تھے۔

مطلب اس کا اور کیا ہوا کہ خواجہ حمید الدین صوفی جن کے متعلق آپ سن چکے کہ یکے از اعاظم خلفاء خواجہ بزرگ و حضرت قطب الدین بختیار اوشی ہیں' یہ ان ہی کے عرفانی سلوک کا طریقہ تھا۔

اب خود ہی غور کرنا چاہیے کہ خواجہ بزرگ اجمیری کے دو ہی خلفاء نے ہندوستان میں خواجہ کی نیابت کا فرض انجام دیا' دونوں میں سے ایک کے متعلق سلطان المشائخ کی گواہی گذر چکی کہ کامل قرآن،

"چوں محفوظ شد آنگاہ نقل فرمود"	(جب وہ محفوظ ہو گیا تو اس وقت اسے منتقل کرنا شروع کیا)

اور دوسرے صاحب کے متعلق محدث دہلوی کی شہادت ہے کہ "تفسیر مدارک" کو سلوک کا طریقہ بنا کر اپنے سلسلہ میں اس کو رائج کیا' کہ اسی وظیفہ سے ان پر وہ حال طاری ہوتا تھا

بکہ صوفیاں در حالت سماع کنند'	جیسا صوفیاء سماع کی حالت میں کرتے ہیں۔

کیا اسلام کا جو ایمانی و عرفانی شجرۂ طیبہ سب سے پہلی دفعہ کفرستان ہند میں نصب ہوا اس کے دونوں پھلوں' خواجہ بختیار و خواجہ حمید رحمۃ اللہ علیہما کے اس رنگ و مزہ کو دیکھ کر ہم اس "شجرۂ طیبہ" کے طریقۂ سلوک کے متعلق فیصلہ کرنے میں اب بھی شک کر سکتے ہیں؟[1]

اجمیر کی جامع مسجد کے امام کی نصیحت ایک نوجوان کو

خواجہ بزرگ کو روپوش ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہے حضرت قطب صاحب زندہ ہیں اجمیر شریف کی جامع مسجد کے امام ایک بزرگ مادھو نامی ہیں۔ معلوم نہیں اصلی نام کیا تھا' سلطان المشائخ نے اسی نام سے ان کا تذکرہ کیا ہے' اجمیر کی جامع مسجد کے ان ہی امام صاحب کے سامنے سے ایک نوجوان لڑکا گذرتا ہے' احمد نام ہے' شیخ محدث نے لکھا ہے:

باقندہ بود (ص ۲۲) بننے والا تھا'

آواز میں درد ہے' ہندی زبان کے گیت لوگوں کو سنا رہا ہے' امام جامع مسجد اجمیر ان کو پاس بلاتے ہیں' سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ اسی گانے والے نوجوان کو خطاب کر کے امام نے کہنا شروع کیا:

"چنیں آوازے تو داری دریغ باشد کہ در سرود ہندوی خرچ کنی"

تو ایسی اچھی آواز رکھتا ہے افسوس ہے کہ اسے تو ہندی گانے میں خرچ کرتا ہے۔

• یعنی جس قسم کی آواز تم رکھتے ہو افسوس کی بات ہے کہ ہندی گانوں میں اسے خرچ کرو' نوجوان پوچھتا ہے کہ پھر کیا کروں؟ اجمیر کو اجمیر والے نے جس فضا سے معمور فرمایا تھا کیا امام جامع کا یہ جواب فضا کی اس تاثیر کے سوا اور کسی چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ انھوں

---

[1] اجمیر شریف میں اب بھی عہد خواجہ کا جو تبرک دکھایا جاتا ہے واللہ اعلم تاریخی سند اس کی کیا ہے لیکن کہتے ہیں کہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن ہے جو خواجہ بزرگ (باقی اگلے صفحہ پر)

نے مشورہ دیا۔ سلطان المشائخ کے حوالہ سے فوائد الفواد میں مشورہ کا یہ فقرہ منقول ہے:

"فرمود کہ قرآن یاد گیر" حکم دیا کہ قرآن پاک حفظ کرو۔

مشورہ قبول کیا جاتا ہے اور چند ہی دنوں میں ہندوی گیت والے باخندہ کے متعلق خبر ملتی ہے کہ:

قرآن یاد گرفت (فوائد الفواد ص ۱۴۷) قرآن یاد کر لیا۔

کیا صرف "یاد گرفت" کا تعلق محض الفاظ سے تھا؟ شیخ محدث نے لکھا ہے خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی کے سامنے جب یہی احمد جواب" خواجہ احمد نہروانی" کے نام سے مشہور تھے پیش ہوئے تو فرمایا:

"اگر مشغولی احمد بسنجند دہ صوفی باشد" یعنی دس صوفیوں کا سرمایہ ایک شیخ احمد کی مشغولی کے مساوی ہے"

(اخبار ص ۷۴)

شیخ محدث نے زکریا ملتانی قدس سرہ العزیز کی یہ رائے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے کہ

"شیخ الاسلام زکریا ملتانی قدس سرہ کم کسے را پسندیدے" شیخ الاسلام زکریا ملتانی کم کسی شخص کو پسند کرتے۔

لیکن جس نے قرآن پایا تھا، بھلا اس کی پسندیدگی میں بھی کسی کو شک ہو سکتا تھا، قول ثقیل سے جو وزن پیدا ہو سکتا ہے، یقین کیجئے کہ اس وزن کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوت نہیں کر سکتی، پہاڑ جس سے پھٹتے ہوں، خود سوچنا چاہیے کہ اس کو کون کھاڑ سکتا ہے[1]

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۱۳۸) کی تلاوت میں رہتا تھا، اگر صحیح ہے تو پیر و مرید دونوں کے ذوق کا ثبوت ملتا ہے سے

بعد مرنے کے مرے گھر سے تو قرآں نکلا

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] اشارہ قرآن کے ان چند امتیازی صفات کی طرف ہے جن کا ذکر قرآن ہی میں کیا گیا ہے، سورہ مزمل میں اس کو "قول ثقیل" (وزنی بات) سورہ حشر کی مشہور قرات والی آیتوں میں ہے کہ اگر اس قرآن کو پہاڑ پر ہم اتارتے تو تم دیکھتے کہ اللہ کے ڈر سے پہاڑ جھک گئے، اور پاش پاش ہو گئے ۱۲

خواجہ اجمیری کے خلفاء حقیقت یہ ہے کہ خواجہ بزرگ کے دونوں خلفاء میں سے حضرت قطب صاحب کو تو بجائے اجمیر کے دلی رہنا پڑا، شمس الدین التمش نے بڑی بڑی خوشامدوں سے ان کو خواجہ بزرگ سے مانگ لیا تھا، میر خورد کی روایت ہے کہ جب دلی میں رہنے کی اجازت خواجہ بزرگ نے قطب صاحب کو عطا فرمائی تو۔

۔ سلطان شمس الدین سعادت قدم بوس شیخ	سلطان شمس الدین نے قدمبوسی کی سعادت
را دریافتہ ہمراہ شیخ قطب الدین بشادی تمام	حاصل کی اور شیخ قطب الدین کو لے کر خوشی
متوجہ شہر گردید (سیر الاولیار ص ۵۵)	خوشی شہر کی طرف روانہ ہوا۔

لیکن مارواڑ اور راجپوتانہ میں خواجہ اجمیری کی روشنی کو پھیلانے کے لیے، وہی ایک بیگہ زمین کے کاشت کار سلطان التارکین شیخ حمید ناگوری ہی رہ گئے تھے، انھوں نے طریقہ چشتیہ کے حقیقی رنگ کو پیش کیا، آہ! کہ جو رنگ آج نگاہوں سے اتنا پوشیدہ ہو رہا ہے کہ میں دعویٰ کرتا جا رہا ہوں اور خود یہ سمجھ رہا ہوں کہ لوگ اسے میری زبردستی قرار دینے پر تلے ہوں گے، مگر اب تک جو واقعات آپ کے سامنے پیش ہو چکے ہیں کیا ان میں میرے دعوے کے ثبوت کی جھلک بھی آپ کو محسوس نہیں ہو رہی ہے، مگر نہیں مجھے تو ابھی بہت کچھ کہنا ہے۔ میں نے شیخ احمد مجد شیبانی کے پیر خواجہ حسین ناگوری کا ذکر کیا تھا۔ بتایا تھا کہ یہ خواجہ حمید الدین ناگوری کی اولاد میں ہیں، مدارک کے وظیفہ کے سوا "جُوباً عن جدٍّ" طریقۂ سلوک کے طور پر ان کے خاندان میں منتقل ہوتا چلا آرہا تھا ان ہی کا وہ قرآنی ذوق تھا جس کا تذکرہ میں نے کسی اور جگہ بھی کیا ہے یعنی تیس جلدوں میں "نور النبی" نامی تفسیر ان ہی خواجہ حسین ناگوری کی لکھی ہوئی ہے۔ ہر پارہ کی تفسیر کے لیے الگ جلد ارقام فرمائی گئی تھی۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ اجمیر اور مارواڑ کا علاقہ محمود خلجی کے عہد میں حکومت مالوہ سے ملحق ہو چکا تھا، محمود خلجی کے بعد مانڈو کے تخت پر غیاث الدین خلجی بیٹھا۔ اسی کے عہد

حکومت میں خواجہ حسین ناگوری اجمیر میں افادہ و استفادہ کی مسند بچھائے ہوئے تھے، غیاث الدین ان کا بیحد معتقد تھا، لیکن ساری عمر اسی آرزو میں اس کی گذری کہ کسی دن مانڈو بھی آپ کے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز ہو، شیخ کی طرف سے باوجود رعیت ہونے کے نفی میں جواب ملتا رہا، محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ غیاث الدین کو کسی نے ترکیب سجھائی، بادشاہ کے پاس کسی نے موئے مبارک نذر میں پیش کیا تھا، ترکیب بتانے والے نے مشورہ دیا کہ موئے مبارک کی زیارت عام کا اعلان کیجئے۔ شیخ کھنچے کھنچے خود ہی چلے آئیں گے، یہی ترکیب کی گئی اور چل گئی، محدث دہلوی کا بیان ہے کہ خبر پاتے ہی خواجہ حسین۔

جہاں سکتے بے توقف سماع کناں وہ روئے گریاں احترام دیدار منشد بسعت"۔ اسی وقت بلا توقف سماع اور روتے ہوئے دیدار منشد کرنے ذنت سعونا معا

بادشاہ کو اپنے نسخہ کے کارگر ہونے کا جب علم ہوا، شیخ کے استقبال کو شہر سے باہر نکلا، بیسیوں بیل گاڑیاں آ جا رہی تھیں، ان ہی میں ایک خستہ حال گاڑی شیخ کی بھی تھی اسے خیال بھی نہ گذرا۔ بعد کو پتہ چلا، بڑی معذرت سے پیش آیا، بعض کرامات کا بھی تجربہ ہوا محمود خلجی کی قبر پر لے جا کر مغفرت کی دعا کرائی، شیخ نے منظور فرمایا، یوں غیاث الدین اور خواجہ حسین ناگوری میں تعلقات پیدا ہوئے۔ شیخ محدث نے لکھا ہے کہ:

سلطان تحفہائے عالی پیش آوردہ او	بادشاہ نے بیش قیمت تحفے پیش کئے مگر
قبول نہ کرد"	آپ نے قبول نہیں فرمایا۔

شیخ نے تو خیر سلطان کے تحفے قبول کیے یا نہ کیے لیکن ہم تاریخوں میں پڑھتے ہیں، اسی غیاث الدین خلجی سلطان مانڈو کے ذکر میں پڑھتے ہیں، فرشتہ راوی ہے: "ہزار کنیزک حافظ قرآن در حرم داشت" یعنی صرف شاہی محلسرا میں قرآن کا ذوق اتنا پیدا ہو گیا تھا کہ بادشاہ کی لونڈیوں میں ایک ہزار عورتیں قرآن کی حافظ تھیں، اسی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ پھر مردوں کا کیا حال ہو گا، ظاہری حکومت مانڈو کی اجمیر پر قائم تھی لیکن بباطن خدا نے یوں مانڈو کو اجمیر کے قرآنی مذاق کا ماتحت بنا دیا تھا۔

غیاث الدین کا حال غیاث الدین کا یہ حال تھا کہ اس نے محل کی عورتوں کو حکم دے رکھا تھا:

کہ جہت نماز تہجد او را بیدار کردہ می باشند	تہجد کی نماز کے لیے اس کو بیدار کریں اور بوقت ضرورت
و عند الاحتیاج آب بر روے او می پاشیدہ	چہرہ پر پانی چھڑکیں، اگر گہری نیند میں ہوں تو
باشند اگر در خواب گراں باشد بزور بجنبانند	بازو پکڑ کر زور سے ہلائیں اگر اس سے بھی نہ
داگر ہاں ہم بیدار نشود دستش گرفتہ برخیزانند	جاگیں تو ہاتھ پکڑ کر ان کو بٹھا دیں۔

یہ بھی فرشتہ ہی کا بیان ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ جس نے بادشاہ کی دنیا رد کی تھی بادشاہ پر اس کے دین کا کتنا گہرا اثر پڑا تھا اور یہ ترکیب تو بادشاہ نے مادی نیند سے بیدار کرنے کی اختیار کی تھی۔ غفلت کے خواب سے چونکنے کے لیے اس نے اپنے درباریوں کو یہ عجیب حکم دے رکھا تھا، کہ جب،

در وقت عشرت و مشغولی بسخنان دنیا ہیچ	دنیا دی باتوں میں مشغولی اور راحت کے
کسا سم کفن بر دنہادہ بودند بنظرش می گذرند	وقت میں وہ کفن جو رکھے ہوئے ہیں اس کے
تا تنبیہ شدہ عبرت گرفتہ از مجلس می برخواست	سامنے لائیں تاکہ تنبیہ اور عبرت حاصل کر کے مجلس سے
و تجدید وضو کردہ با ستغفار و توبہ و انابت	وہ اٹھے اور وضو کر کے گناہوں کی معافی اور توبہ
می پرداخت"	اور رجوع الی اللہ کا اہتمام کرے۔

اور یہی بات مجھے پیش کرنی تھی کہ خواجگان چشت کا تعلق قرآن سے کیا تھا، خواجہ حسین ناگوری کا چونکہ ذکر آگیا ہے اس لیے ایک اہم تاریخی بات جس کا ان کی ذات سے تعلق ہے جی چاہتا ہے کہ اس کا ذکر بھی کر دوں۔

خواجہ اجمیری کی قبر شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں خواجہ بزرگ اجمیری کی قبر شریف کے متعلق یہ واقعہ درج کیا ہے:

• در اجمیر کہ موضع اقامت او بود مدفون گشت	اجمیر جس جگہ آپ قیام پذیر تھے وہیں دفن

اول قبر خواجہ از خشت بود۔ | ہوئے، خواجہ کی قبر پہلے اینٹ کی تھی۔

غالباً "خشت" سے کچی اینٹیں ہی مراد ہیں، سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ سے شیخ کبیر شکر گنج کے روضۂ طیبہ کے متعلق یہ مروی ہے کہ:

بجہت لحد شیخ شیوخ العالم خشت خام حاجت شد، چوں موجود نمی شد در خانہ شیخ شیوخ العالم کہ بخشت خام برآوردہ بودند ازاں خشت زود آوردند تا در لحد خرچ شد طاب اللہ ثراہ (سیر الاولیار ص ۹۱)	شیوخ العالم کے شیخ کی قبر کے واسطے کچی اینٹ کی ضرورت ہوئی تھی، جب فراہم نہ ہوئی تو شیوخ العالم کے گھر میں جو کچی اینٹیں لگی ہوئی تھیں اس کو اکھاڑ لائے تا کہ لحد میں خرچ کی جائے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طریقہ چشتیہ کے معماران اولین کی قبروں میں کچی اینٹوں ہی کے لگانے کا رواج تھا، محدث دہلوی نے خواجہ بزرگ کے مزار مبارک کے متعلق یہ تاریخی بیان بھی دیا ہے کہ جس زمانہ میں خواجہ حسین ناگوری نے جوار خواجہ میں قیام فرمایا، اس وقت:

وحوالی او بیشہ شیراں گشتہ و دراں زماں بالائے قبر شریف عمارت نہ بود"	اس کے ارد گرد شیروں کی جھاڑی تھی اس زمانہ میں قبر کے اوپر کوئی عمارت نہ تھی،

یہ بھی لکھا ہے کہ اطراف میں کوئی خانقاہ وغیرہ بھی نہ تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد جو محدث دہلوی نے یہ لکھا ہے کہ:

دروازہ و خانقاہ بعضے از ملوک ہند ساختند" (ص ۲۳)	دروازہ اور خانقاہ شاہان ہند میں سے کسی نے بنایا۔

بعضے ملوک ہند سے یہی غیاث الدین خلجی ہی مراد ہے، کیوں کہ غیاث الدین ہی کے عہد میں غالباً اپنے قیام اور واردین صادرین کے قیام کے لیے جیسا کہ شیخ محدث ہی نے لکھا ہے:

"اول کسے کہ در مقبرہ خواجہ عمارت کرد خواجہ حسین ناگوری بود" ص ۲۳	پہلے شخص جن کے مقبرہ پر عمارت بنائی گئی خواجہ حسین ناگوری تھے۔

اور ان ہی کے زیر اثر اس عجیب و غریب بادشاہ نے اس مقام میں جو نشیمن بن گیا تھا، خانقاہ اور خانقاہ کا دروازہ بنوایا، واللہ اعلم بالصواب۔

میری غرض تو اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ خواجہ حسین ناگوری اور غیاث الدین خلجی سلطان مالوہ کے تعلقات کو دکھاؤں، ان ہی تعلقات کی بنیاد پر میرا خیال ہے کہ شادی آباد مانڈو کے صرف شاہی محلسرا کی لونڈیوں میں ہزارہا عورتیں پورے قرآن کی حافظ تھیں۔

اب دنیا خواہ کچھ ہی خیال کرے لیکن غیاث الدین اور خواجہ حسین ناگوری کے جن تعلقات کا میں نے ذکر کیا ہے، ان ہی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر غیاث الدین کے اس قرآنی ذوق کو خواجگانِ چشت کے قرآنی شغف کا نتیجہ قرار دیا جائے تو اس کی تردید کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

خواجہ احمد مجد

خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کے طریقۂ چشتیہ کی حمیدیہ ناگوریہ کی شاخ میں سلطان شمس الدین التمش کے عہد سے کم از کم بابر کی آمد کے زمانہ تک مدارک کے درس کو طریقۂ سلوک کی حیثیت مسلسل بغیر کسی انقطاع کے حاصل رہی، وجہ اس کی یہ ہے کہ خواجہ احمد مجد جن کے تذکرہ میں شیخ محدث نے اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے، اجمیر شریف سے ہجرت کر کے ناگور آخر عمر میں چلے گئے تھے اور وہیں وفات ہوئی، شیخ محدث نے ان کی اس ہجرت کے متعلق لکھا ہے کہ۔

"چوں دراجمیر خلل شدہ، قلعہ را رانا سانگا کہ گبرے عظیم بود از دست مسلماناں بگرفت و اکثر مسلماں را شہید ساخت احمد مجد پیش ازیں حادثہ بہ ہفت روز بحکم اشارت خواجہ بزرگ خواجہ معین الحق والدین از شہر بر آمد	جب اجمیر میں تباہی مچی اور قلعہ کو رانا سانگا نے جو بڑا آتش پرست تھا مسلمانوں سے لے لیا اور بہت سے مسلمانوں کو شہید کر دیا، احمد مجد اس حادثہ سے سات دن قبل خواجہ معین الدین چشتی کے اشارہ پر شہر سے باہر آئے

و بہ مسلمانان خبر کرد کہ یک چندے بریں شہر نظر جلال ست فرمان بندگی خواجہ برین ست کہ مسلمانان از شہر برآیند و روز دوشنبہ ۹۲۳ھ باجماعہ از مسلمانانِ اجمیر برآمدہ و روز دوشنبہ دیگر کافراں بر سر اجمیر آمدند و آں دیار را زیر و زبر ساختند" ص ۱۸۵

اور مسلمانوں کو خبر کی کہ کچھ مدت اس شہر پر جلال کی نظر ہے حضرت خواجہ نے فرمایا ہے کہ مسلمان شہر سے باہر آ جائیں دوشنبہ کے دن ۹۲۳ھ اجمیر کے مسلمان شہر سے باہر آگئے اور دوسرے دوشنبہ کو کافر اجمیر میں داخل ہو گئے اور شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔

واللہ اعلم شیخ احمد مجد کو یہ اشارہ خواب میں ہوا' یا کوئی کشفی واقعہ تھا مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ یہ گبر عظیم رانا سانگا جس کا شیخ محدث نے ذکر فرمایا ہے' ظاہر ہے کہ یہ وہی رانا سانگا ہے جو بیانہ کے میدان میں حضرت بابر بادشاہ سے نبرد آزما ہوا اور خاص غیبی تائید نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں تیموری خاندان کا تخت بچھے گا' بد ترین شکست کے ساتھ رانا سانگا نے راہ گریز اختیار کی۔ شیخ احمد مجد کا انتقال ۹۲۷ھ میں ہوا ہے اور بابر نے ۹۳۳ھ میں پانی پت کا میدان ابراہیم لودی کے مقابلہ میں جیت کر کچھ ہی دن بعد رانا سانگا سے وہ مقابلہ کیا جس کی نظیریں دنیا کی تاریخوں[ل] میں کم ہی مل سکتی ہیں' اور یہی میری غرض تھی

لہ کہتے ہیں کہ پتھورا اجمیر کے راجہ نے "مسلمانے از پیوستگان خواجہ قدس سرہٗ را بسببے از اسباب رنجانید (اخبار) اسی ایک مسلمان کے ستانے کی علت نے راجہ پتھورا کو یہ سزا ملی کہ خواجہ بزرگ کی زبان مبارک سے یہ مشہور فقرہ نکل گیا "پتھورا را زندہ گرفتیم و دادیم"

شیخ محدث نے لکھا ہے اسی زمانہ میں شہاب الدین غوری کے مقابلہ میں پتھورا کو شکست ہوئی "و بدست معزالدین سام اسیر گشت" غور کرنے کی بات ہے کہ اس گبر عظیم رانا سانگا نے اجمیر کو لوٹا اور وہاں کے مسلمانوں کو شہید کیا' اگر اسی کی سزا میں بجائے شہاب الدین کے اندجان (پایہ تخت بابر در مرافد) سے بابر ہندوستان آیا' اور ابراہیم لودی جو لاکھوں لاکھ فوج کے باوجود مسلمانان اجمیر کی شہادت کا تماشا چپ چاپ دیکھتا رہا' اس کو بھی اور خود رانا سانگا کو بھی اپنے کیے کی سزا ملی' تو عقلاً یہ کیا مستبعد (باقی اگلے صفحہ پر)

کہ بابر کے عہد تک طریقۂ چشتیہ کی ناگوری حمیدی شاخ میں مسلسل تفسیر مدارک کے سلوک
کا طریقہ جاری رہا۔ اسی شاخ کے ایک بزرگ نے قرآن کی وہ ضخیم تفسیر لکھی اور اسی بزرگ
کے معتقد غیاث الدین خلجی کو ہم اس حال میں پاتے ہیں جس کا تذکرہ فرشتہ سے میں نے نقل
کیا ہے جس کے قرآنی شغف ہی کا نتیجہ تھا کہ صرف شاہی محل میں ہزارہا عورتیں قرآن کی
حافظات پائی جاتی تھیں۔ کیا ان واقعات کو پیش نظر رکھنے والوں کے لیے اب بھی میرے
دعوے کی تصدیق میں شک کی گنجائش ہے۔

شیخ شکر گنج اور سلطان المشائخ

اور یہ تو صرف چشتی شجرۂ طیبہ کے ایک پھل کا حال ہے۔ دوسرے دہلوی
خلیفہ حضرت قطب صاحب کا قرآن سے جو ذاتی تعلق تھا اس کا ذکر
تو گذر ہی چکا، لیکن اس شاخ میں بھی بات ان ہی تک ختم نہیں ہو گئی ہے۔ یاد ہو گا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۵ کا) ہے واقعہ تو یہ ہے کہ ظہیر الدین بابر جس شان کے ساتھ رانا سانگا سے
لڑا ہے وہ خود تاریخ کا ایک عجوبہ طراز واقعہ ہے کہتے ہیں کہ بابر کے پاس یوں ہی کل دس بارہ
ہزار فوج تھی، ہندوستان کی گرمی اس فوج کے لیے ناقابلِ برداشت بنی ہوئی تھی۔ رانا سانگا کی ٹڈی
دل فوج جو ایک لاکھ سے متجاوز تھی اس کو دیکھ کر افواج بابری کی ہمت چھوٹ گئی اور مقابلہ سے ہچکچانے
لگی۔ بابر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ شاہی خیمہ جس میں پینے پلانے کا سامان رکھا ہوا
تھا پہلے تو اس نے ایک ایک گلاس اور قرابۂ شراب کو توڑ پھوڑ کر برابر کیا، غسل کیا، نماز پڑھی، سجدہ میں گر
گیا، گڑگڑانے لگا، حکومت کے خیال کو سر سے نکالتا ہوں۔ خالص جہاد کی نیت کرتا ہوں۔ دل کو قرار آیا،
باہر نکل کر اس نے اعلان عام کر دیا۔ اب جنگ نہیں جہاد ہو گا! جو رہنا چاہے رہے، جسے جانا ہو چلا
جائے۔ بہت سے فوجی جو کرایہ پر آئے تھے چلے گئے بمشکل پانچ چھ ہزار فوج رہ گئی۔ ان ہی کے ساتھ
تکبیروں کے نعروں میں رانا سانگا کی فوج پر حملہ ہوا، کچھ ایسی صورت پیش آئی کہ رانا کی فوج کے پاؤں
اکھڑ گئے، رانا سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگا، اور تقدیر نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان کی حکومت صدیوں کے لیے
بابر کی اولاد میں رہے گی۔ نواب علامہ صدر یار جنگ کی کتاب ظہیر الدین بابر میں تفصیلات پڑھیے۔ ۱۲

قطب صاحب کے خلیفۂ برحق شیخ کبیر شکر گنج خود قرآن کا درس دیتے تھے سلطان المشائخ نے چھ پارے تجوید کے ساتھ انہی سے پڑھے تھے لیکن یہ پڑھنا اور پڑھانا تو دیکھ کر تھا' میر خورد نے سیر الاولیاء میں نقل کیا ہے کہ .

"سلطان المشائخ بقلم مبارک خود نوشتہ ست"	سلطان المشائخ نے اپنے قلم مبارک سے لکھا ہے۔

یہ چیز کیا تھی جسے سلطان المشائخ نے اپنے قلم مبارک سے ثبت فرمایا تھا میر خورد نے وہ عبارت بجنسہٖ نقل کی ہے میں بھی وہیں سے نقل کرتا ہوں. لکھتے ہیں:

"شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز کاتب حروف را بخواند"	شیوخ العالم فرید الحق قدس سرہ نے لکھنے والے کو بلایا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"بعد آدینہ (جمعہ) بعد از فراغ نماز بست وپنجم ماہ جمادی الاولی ۶۶۹ تسع وستین وستمائۃ لعاب زد ہن مبارک در دہن کاتب (سلطان المشائخ) کرد"	جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ ۵ جمادی اول ۶۶۹ھ (چھ سو انہتر) اپنے دہن مبارک کا لعاب کاتب (یعنی سلطان المشائخ کے دہن مبارک میں ڈال دیا

شیخ کبیر شکر گنج نے سلطان جی کے منہ میں دہن مبارک کا لعاب کس لیے ڈالا تھا' اسی کا ذکر مقصود ہے' اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"وصیت فرمود بحفظ کلام مجید رزقہ اللہ تعالیٰ" (کتاب مذکور ص ۱۲۳)	اور اس کے بعد قرآن پاک کے حفظ کرنے کا حکم فرمایا'

گو مجھے اب تک اس کی کوئی شہادت نہیں ملی ہے کہ خود شیخ کبیر شکر گنج کو زبانی قرآن یاد تھا یا نہیں لیکن قرآن کے ساتھ ان کا شغف اسی سے ظاہر ہے کہ پچانوے سال کی عمر تک تراویح کی نماز جو ظاہر ہے فرض نہیں ہے پڑھتے رہے' آخر عمر میں بیٹھ کر پڑھتے تھے' قرأت وتجوید کے ساتھ قرآن پڑھانے کا حال بھی سن چکے ہیں' سلطان المشائخ کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج کی خانقاہ حافظوں سے

بھری رہتی تھی میر خورد نے حضرت ہی کی زبانی نقل کیا ہے کہ جب پہلی دفعہ اجودھن میں
میری حاضری ہوئی اور شرفِ بیعت سے سرفراز ہوئے اس کے بعد شیخ کبیر نے خدام
خانقاہ کو مخاطب کر کے حکم دیا:

"بجہت ایں متعلم غریب در جماعت خانہ کھٹ راست کنید"	اس غریب طالب علم کے لیے جماعت خانہ میں پلنگ بچھا دیں۔

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب میں جماعت خانہ میں واپس آیا تو دیکھا کہ میرے
لیے پلنگ (کھٹ) بچھایا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ دل میں خیال کیا بلکہ ارادہ ہوا۔

"من بارے ہرگز بر کھٹ نخواہم خفت"	میں ہرگز پلنگ پر نہ سوؤں گا

اسی موقع پر "نخواہم خفت" کے خیال کی جو وجہ سلطان المشائخ نے بیان فرمائی تھی وہ
ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:۔

زیرا چہ چندیں مسافراں عزیزاں و حافظان کلامِ ربانی و عاشقانِ درگاہِ رحمانی می بینم کہ بر خاک می غلطند من چگونہ بر کھٹ بغلطم"	اس لیے کہ بہت سے مسافروں، حافظوں اور درگاہ رحمانی کے عاشقوں کو دیکھ رہا ہوں کہ فرش پر نیچے آرام فرما ہیں پھر میں کس طرح پلنگ پر دراز ہوں"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبان عزوجاہ (عزیزاں)، وعاشقان درگاہ رحمانی کے
ساتھ خانقاہ فریدیہ کا ایک حصہ خاص حافظانِ کلام ربانی کا بھی تھا۔

حفظِ قرآن کا اہتمام سلطان المشائخ ہی کا بیان ہے کہ شیخ کبیر عموماً لوگوں کو حفظ قرآن
کی ایک وردی تدبیر بھی بتایا کرتے تھے۔ یعنی فرماتے
تھے، غالباً حضرت والا کا خود تجربہ تھا:۔

بجہت یاد گرفتن قرآن اول سورۂ یوسف زحوے کہ یاد باید کرد تا بہ برکت آں حق تعالیٰ حفظ تمام قرآن روزی کند (سیر الاولیاء ص ۳۹۹)	قرآن پاک کے حفظ کے لیے پہلے سورۂ یوسف یاد کرنے کو فرماتے تاکہ اس کی برکت سے حق تعالیٰ پورے قرآن پاک کے حفظ کی توفیق عطا کرے

سنداً اس حدیث میں ممکن ہے بعضوں کو کلام ہو جس پر بحث کرنے کا یہ وقت نہیں ہے لیکن شیخ کبیر عموماً اپنے لوگوں کو یہ حدیث بھی سنایا کرتے تھے۔

ہر کرا نیت یاد گرفتن قرآن باشد دہاں	جس کی نیت قرآن پاک کے حفظ کی ہو اور کسی
نرسد وہم دراں نیت از جہاں سفر کند چوں اوا	حال میں اس کا انتقال ہو جائے تو جب اس کو قبر
بگور نہند فرشتہ بیاید و ترنج از بہشت آوردہ	میں اتار جائے گا فرشتے آئیں گے اور بہشت سے ایک
بدست او دہد آں کس آں ترنج ابتلاع (نگل جانا)	نارنگی لاکر اس مردہ کے ہاتھ میں دیں گے،
کند تمام قرآن او را محفوظ گردد فردا چوں حشر شود او	وہ اسے نگل جائے گا کل جب وہ حشر میں
حافظ مبعوث گردد (سیر الاولیاء ص ۳۴۹)	اٹھے گا تو اسے پورا قرآن یاد ہوگا۔

اور اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے وابستوں میں وہ قرآن سے کس قسم کا تعلق پیدا کرنا چاہتے تھے جس کا حاصل یہی ہوا کہ جس سے جتنا بھی ممکن ہو زندگی کا ایک حصہ اس کام میں وقف کرے، کامل قرآن محفوظ نہ ہو سکے تو جتنا بھی اپنے اندر قرآن کو اتارنے والا اتارے گا، یہی چیز دوسری زندگی میں اس کی تکمیل کی ضمانت بن جائے گی۔ گو پارے دو پارے سے بھی کم ہی محفوظ کر کے مرا ہو۔ لیکن اٹھے گا پورے قرآن کا حافظ بن کر۔ ظاہر ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج کی زبان مبارک سے اس مفت کی دولت کا حال سن کر حضرت والا کے دست گرفتوں میں کون ہوگا جس کے دل میں کم از کم اس نیت کی گدگدی نہ پیدا ہوتی ہوگی۔

سب کچھ پڑھنے پڑھانے دینے دلانے کے بعد آخری وصیت بابا صاحب کی اپنے

۱؎ مشہور حدیث ہے ان منزلتك عند اٰخر اٰیة تقرء (آدمی قرآن کی جس آیت کو پڑھتے ہوئے مرتا ہے وہی اس کا مقام ہوتا ہے) جو ابو داؤد و ترمذی کی روایت ہے اور ترمذی نے حسن صحیح سے اس کی توثیق بھی کی ہے اگر اس حدیث کے اول و آخر کے الفاظ پر غور کیا جائے تو جو مفہوم شیخ کبیر کی بیان کردہ روایت کا ہے اس کی نتیجۃً اس سے تصدیق ہوتی ہے۔

خلیفہ اکبر و محبوب (سلطان المشائخ) کو قرآن حا کر یاد کروڈ کی ہوا اور اس اہتمام کے ساتھ وصیت ہو کہ لعاب مبارک سلطان المشائخ کے دہن پاک میں ڈالا جاتا ہے اور جیسا کہ میر خورد نے سلطان جی کی اسی یادداشت سے جوان کے دست خاص کی لکھی ہوئی تھی، اسی کے بعد یہ نقل کیا ہے کہ کلام اللہ کے حفظ کی وصیت کے بعد شیخ کبیر شکر گنج نے فرمایا" نظام! میں نے "لبیک" کے ساتھ جواب عرض کیا۔ اس کے بعد سلطان المشائخ ارقام فرماتے ہیں :۔

• خواجہ گفت دین و دنیا ترا دادہ اند ۔۔۔۔۔ خواجہ نے فرمایا: تجھے دین و دنیا عطا کر دیا

کیا یہ اشارہ اسی قرآن کی طرف تھا؟ جس کے متعلق اجتماعی اور انفرادی تجربات تیرہ سو سال سے یہی ہیں، آگے ہے کہ شیخ کبیر نے فرمایا" ایں جا ہمہ این است" یہ بجنسہ الفاظ ہیں جو میں سیر الاولیاء سے نقل کر رہا ہوں، واقعی مطلب کیا ہے؟ بولنے والے اور بولنے والے کا خدا ہی اسے جان سکتا ہے، لیکن گفتگو جس مسئلہ میں ہو رہی ہے اس کا تو کھلا ہوا اقتضاء یہی ہے کہ" ہمہ این ست" سے وہی قرآن مراد ہے جس کے حفظ کی وصیت کے لیے خاص مجلس نماز جمعہ کے بعد آج قائم کی گئی ہے، بہر حال میرے نزدیک ہمہ این ست کے ایں کا مطلب اور مشار الیہ قرآن معلوم ہوتا ہے اور "ایں جا" کی ایں کا اشارہ خواجگان چشت کے اس طریقہ کی طرف ہے جو ہندوستان کے خصوصی حالات کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے اس ملک میں جاری کیا تھا۔

شیخ فرید الحق والدین کا فقرہ شیخ الاسلام فرید الحق والدین رحمۃ اللہ علیہ کا آخری فقرہ اس کے بعد یہ ہے :۔

" برو ملک ہندگیر" نظر ترمنت یکیفیی ۔۔۔۔۔ جا اور ہندوستان کی حکومت سنبھال،

قرآن حوالہ کیا جاتا ہے، اسی کو سب کچھ بتایا جاتا ہے، اور اسی کے بعد" ہندگیری" کی بشارت سنائی جاتی ہے، اگر اسے بشارت قرار دیا جائے، یا للکارا جاتا ہے، ایک ہتھیار دے کر جس

سے ہندگیری کی مہم میں کامیابی ہو سکتی ہے، آگے عربی فقرہ:

نظرۃ منك يكفيني — تمہاری ایک نگاہ میرے لیے کافی ہے۔

واللہ اعلم مرشد نے اپنے اس مرید اور خلیفہ کو جسے قرآن دے کر ہندگیری کی مہم پر بھیج رہا ہے، یہ کیا کہا؟ کیا یہ مطلب ہے، ایمان ویقین کی جو روشنی قرآن سے پیدا ہوتی ہے اس کی صرف ایک نظر ان لوگوں پر قابو پانے کے لیے کافی ہو سکتی ہے، جن کی پوری زندگی صرف شرک کے انگاروں پر لوٹتے کٹتی ہے یا کٹ رہی ہے، ایک دوسرے موقعہ پر سلطان المشائخ ہی کے حوالہ سے میر خورد ہی نے قرآن کے متعلق ایک عجیب بات نقل کی ہے۔ سوال کرنے والے وہی مولانا فخرالدین زرادی ہیں جن کے غیر معمولی علم وفضل کا ذکر آچکا ہے۔ مولانا زرادی نے عرض کیا،

"مشغول شدن بکلام اللہ فاضل تریا بذکر" — کلام اللہ کی تلاوت میں مشغول بہتر ہے یا ذکر الٰہی میں

تصوف جس کی بنیاد ہی ذکر واذکار پر سمجھی جاتی ہے اور جہاں جہاں ضرورت تھی یقیناً وہاں کے لیے ذکر اذکار، اشغال ومراقبات کے ذرائع مفید بھی ہوئے لیکن سوال ہندستان سے پوچھا جا رہا تھا "ہندگیری" کی مہم اپنے پیر کی طرف سے جسے سونپی گئی تھی اس سے دریافت کیا گیا تھا۔ جواب میں ارشاد ہوا۔

"ذاکر را وصول زود تر بود اما خوف زوال ہم بود و تالی را وصول دیر تر بود لیکن خوف زوال نہ باشد (ص ۲۴۶)

ذاکر کو وصول جلد ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ زوال کا خوف باقی رہتا ہے باقی قرآن تلاوت کرنے والا تو اس کے وصول میں دیر تو ہوتی ہے لیکن زوال کا خوف نہیں رہتا۔

وجہ ظاہر ہے کہ ذکر سری ہو یا جہری دونوں کی کثرت ومزاولت خصوصاً جب حضور قلب اور شعور معنی کے ساتھ ہو تو مذکور سے اشتیاق وانہماک، حب وانس کی نسبتوں کے پیدا ہونے میں دیر نہیں لگتی، جن ممالک کے باشندے مسلمان ہو چکے ہیں، اجمالاً ان کے پاس

سب کچھ ہوتا ہے۔ اسی مجمل کو مفصل کرنے کے لیے انھیں ذکر و فکر، مراقبہ اور مطالعہ کے مشاغل میں مشغول کیا جاتا ہے، ایمان کی حلاوت ان میں پیدا ہو جاتی ہے، مذکور کی محبت کی آگ جو ایمانی فطرت میں بہرحال دبی ہوتی ہے، وہ ذکر کے ضربات سے بھڑک اٹھتی ہے اور یہی ان کا مطلوب ہوتا ہے۔

ذکر کے فائدے

لیکن یہ سارے ذکری ذوق و شوق ولولے اور شورش اسی وقت تک ترو تازہ رہتے ہیں جب تک ذاکر، ذکری و فکری مشاغل کو بھی تازہ کرتا رہے۔ خدا نخواستہ اگر کسی وجہ سے ان میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے تو جیسی اور جتنے دن کی رکاوٹ ہوگی اسی نسبت سے ذکری کیفیات کی شدت میں بھی ضعف اور ذوق و شوق کی لذت کم ہوتی جاتی ہے، اسی لیے ارشاد ہوا کہ گو ذکر سے مقصد تک رسائی تو جلد ہو جاتی ہے، ایمان مجمل پر ایمان مفصل کے آثار تھوڑی محنت کے ساتھ مرتب ہونے لگتے ہیں بلکہ غلبۂ ذکر سے یکسوئی جو پیدا ہوتی ہے لبسا اوقات اس کی وجہ سے کشف و کرامات جیسی چیزوں کا صدور بھی ہونے لگتا ہے لیکن نتائج کا تعلق چوں کہ تجدید ذکر کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اس لیے مرض و حرج یا دوسرے اسباب کے تحت یہ بالکل ناممکن ہے کہ اس راہ پر چلنے والے اپنے آپ کو ان تمام حالات سے خالی پائیں، جنھیں اتنی محنت و مشقت سے انھوں نے حاصل کیا تھا اور یہی مطلب ہے "خوفِ زوال" سے۔

لیکن قرآن کا حال بالکل مختلف ہے۔ کچھ نہیں، ایک بات، اور صرف ایک ہی بات ہے جس پر اس کے افادہ کا دارومدار ہے، یعنی جس ذریعہ سے بھی ہو کسی طرح یہ طے ہو جائے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک العیاذ باللہ غلط بیانی کے الزام سے پاک و بری ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ سراسر ایک عقلی مقدمہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق کسی دوسرے غیبی عالم سے نہیں، اسی عالم محسوس و شہادت سے ہے وہ ہم انسانوں ہی میں پیدا

ہوئے، ہم ہی میں رہے، منٹ دو منٹ کے لیے نہیں، جیسے بعض دفعہ کسی غیبی ہستی سے سالک کا احساس متاثر ہو کر پھر اپنے سامنے کچھ نہیں پاتا، یہ حالت نہیں ہے سالہا سال تک وہ ہم ہی میں رہے، ہم ہی میں زندگی گذاری، گورے کالے مشرقی و مغربی، ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی ظاہر ہے کہ اس حیثیت سے آپ کو سب جانتے ہیں، آپ سب ہی کے جانے بوجھے دیکھے بھالے ہیں۔

اسی واضح، محسوس، بدیہی حقیقت کے متعلق ہمیں اپنی فطرت اور اپنے اندرونی احساسات کو صرف اس حیثیت سے ٹٹولنا ہے کہ العیاذ باللہ کیا وہ سچ نہیں بولتے تھے اس کے تصور کی بھی صلاحیت کیا ہم میں باقی ہے؟

ایسی بات جسے شاید اب کوئی غیر مسلم بھی برداشت نہیں کر سکتا، ظاہر ہے کہ ایک پیدائشی مسلمان کے سینے میں اس کی کیا گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔

ادھر یہ مقدمہ طے ہوا اور اچانک وہی درماندہ عقل جس کی آخری رسائی۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے　　پردہ چھوڑا ہے کچھ ایسا کہ اٹھائے نہ بنے

پر ختم ہو جاتی ہے، قرآن کی روشنی میں جگمگا اٹھتی ہے، اب اپنے آپ کو وہ اس علم محیط کی راہ نمائی میں پاتی ہے جس سے نہ ماضی غائب ہے نہ مستقبل، نہ شہادت پوشیدہ ہے نہ غیب اوجھل، ایسی روشنی جو ظاہر ہے کہ اپنی خالص ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک کیفیت کے ساتھ کسی دوسرے ذریعہ سے کسی کو اب کہیں میسّر نہیں آسکتی، اور یہ سب کچھ ایک حرف ایک "نظرۃ"

خراباتیاں مے پرستی کنید　　محمدؐ بگوئید و مستی کنید

سانچہ ہے ع بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

جسے اس ایک "نظرۃ" کی دولت حاصل ہو چکی ہے دراصل "معمۂ کائنات" کے وہ سارے اسرار جو دانش ماضی و حاضر کے کسی سرمایہ سے کسی پر کبھی کھل نہیں سکتے تھے

اس کے حل کی ایک ایسی راہ اس کے سامنے آگئی ہے جس پر چلنے والا اپنے ارد گرد پیش و پیش میں شک و شبہ ظن و تخمین کا کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا کیوں کہ ظاہر ہے کہ اب اس سلسلہ میں جو کچھ جانے گا جو کچھ سمجھے گا وہ محدود عقل رکھنے والے انسان کا کوئی تخمینی نتیجہ نہ ہوگا جس میں ہر تھوڑی دیر بعد دغدغہ ہوتا ہے اور اس دغدغہ کو ہونا چاہیے کہ بے جانے صرف قرائن و قیاسات سے جن لوگوں نے نتائج پیدا کیے ہیں کیا ضرور ہے کہ وہی واقعہ ہو خصوصاً جب آئے دن عقل کے تخمینی نتیجوں کے متعلق مسلسل تجربہ ہوتا چلا آرہا ہے کہ کل جس چیز کے واقعی قرار دینے پر عقل کو اصرار تھا آج وہی عقل بھی کے قہقہوں سے اسی کا مضحکہ اڑا رہی ہے۔ فکر انسانی کی ہزار ہا ہزار سال کی تاریخ بیجا اصرار اور بیجا تمسخر کی داستانوں سے لبریز ہے۔

علماء اور مشائخ میں امتیاز

حالاں کہ یہ سارا قصہ صرف اسی ایک "نظرۃ" کی تصحیح کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ آئندہ مسئلہ جو کچھ رہ جاتا ہے وہ راہ کا نہیں بلکہ راہ پر چلنے کا ہے۔ سلطان المشائخ نے علماء رسوم (علماء ظاہر) اور صوفیہ میں فرق بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ دونوں ہی دراصل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی "لاریب علمٌ القرآن الحکیم" اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی دعوت دیتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ:۔

"ہر چہ علماء بزبان دعوت کنند مشائخ بہ عمل دعوت کنند (سیر الاولیاء بحوالہ نوشتہ دست خاص سلطان المشائخ ص ۳۲۱)	علماء جس کی زبان سے دعوت دیتے ہیں مشائخ اپنے عمل سے اس کی طرف بلاتے ہیں۔

اور اتنے دھوم دھام سے آپ شیخ کبیر کو جو دیکھ رہے ہیں کہ آخری وصیت اپنے خلیفہ خاص کو حفظ قرآن کی کر رہے ہیں اس حفظ سے غرض وہی ہے کہ "ہندگیر دعوت" کی جس مہم پر سلطان المشائخ کا انھوں نے تقرر کیا تھا، ضرورت تھی کہ پہلے اس دعوت

کو وہ خود اپنی عملی زندگی بنالیں کہ ان کو زباں سے نہیں اپنے عمل سے دعوت دینی تھی۔ خواجگانِ چشت میں قرآن کے علم کو عمل بنانے کی کیا تدبیر کی جاتی تھی، تلاوت و حفظ کا توخیر الفاظ سے تعلق تھا لیکن اپنے الفاظ سے قرآن جن معانی کو عطا کر رہا ہے ان کو اپنے اندر ہضم کس طریقہ سے کرنا چاہیے۔ مشائخ چشت بیعت لیتے ہوئے پہلا معاہدہ جو یہ لیتے تھے جیسا کہ سلطان المشائخ سے منقول ہے کہ:۔

"پیر از راہ مرید را، تلقین کند دیدہ را نادیدہ کنی و شنیدہ را ناشنیدہ (سیر الاولیاء ص ۳۲۱)

پیر مرید کو تلقین کرتا ہے کہ دیکھے ہوئے کو نہ دیکھا ہوا اور سنے ہوئے کو نہ سنا ہوا بنا دو

اس کا یہی مطلب تھا کہ اپنے حسی و عقلی معلومات کو ان معلومات کے مقابلہ میں جو قرآن عطا کرے گا، جلا دینا پڑے گا۔ کیوں کہ بہر حال عقل و حواس کے معلومات جیسے کچھ بھی ہوں ان ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں جن کی رسائی محدود ہے اور محدود رسائی رکھنے والے ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوں گے ظاہر ہے کہ وہ ناقص ہوں گے، ناقص مقدمات سے جو نتائج پیدا کیے جائیں گے خواہ بظاہر جتنے بھی یقینی اور بدیہی معلوم ہوں لیکن ان معلومات مبتنہ قطعیہ کا تو مقابلہ نہیں کر سکتے جو حق تعالیٰ کے علمِ محیط کلی سے ماخوذ ہوں گے۔

ذرائع معلومات

سلطان المشائخ ہی سے فوائد الفواد میں منقول ہے کہ معلومات جن ذرائع اور طرق سے آدمی کو حاصل ہوتے ہیں ان کے تین اطوار ہیں، فرماتے ہیں:۔

یکے طورِ حس دوئم طورِ عقل سوئم طورِ قدس

ایک حس کے راستے سے دوسرے عقل سے اور تیسرے قدس سے

طورِ قدس سے اشارہ علم کے اس قطعی لاریب ذریعہ کی طرف ہے جو ہر قسم کے اندیشہائے مشکوک و شبہات سے مقدس اور پاک ہے، عقلی طور کے معلومات کی دونوں مشہور قسموں یعنی غور و فکر کے بعد آدمی جن نتیجوں پر پہنچتا ہے جنہیں منطق میں کسبی اور نظری کہتے ہیں اور غور و فکر کے بغیر جو معلومات ہر شخص کو حاصل ہوتے ہیں جنہیں بدیہی کہتے ہیں، سلطان المشائخ نے ان

دونوں قسموں کا ذکر کر کے ارشاد فرمایا کہ :

"بدیہہا علم قدس نیست تا کسی جگہ نہ باشد" (فوائد ص ۶۹)	بدیہی علم قدس ہدایۃً نہیں تو کبھی کس طرح ہو سکے گا۔

بہرحال یوں شنیدہ کو ناشنیدہ اور دیدہ کو نادیدہ بنا کر بزرگانِ چشت جیسا کہ معلوم ہوتا ہے، قرآنی معانی کو چوسنے کا حکم دیتے تھے۔

تلاوت کے قاعدے فوائد الفواد ہی میں تلاوت کے جن قاعدوں کا ذکر ہے ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مرتبہ اس کا یہ ہے :

"انچہ می خواند معانی آں بر دل گذراند"	جو کچھ پڑھیں اس کے معانی کا دل پر نزول ہو

دوسرا مرتبہ اس کا یہ ہے، کہ :

"در حالت قرآن خواندن، جلال و عظمتِ حق بر دل بگذراند"	قرآن پڑھتے وقت حق تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال کا دل پر نزول ہو۔

اور تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ :

وقت خواندن قرآن باید کہ دل خوانندہ را تعلق بحق باشد" (ص ۱۷)	قرآن پڑھتے وقت حال یہ ہونا چاہیئے کہ پڑھنے والے کا دل حق تعالیٰ سے وابستہ ہو۔

اس آخری عمل کا مطلب یہی ہوا کہ براہ راست حق تعالیٰ سے گفتگو اور مناجات کی سعادت اسے حاصل ہو رہی ہے، گویا وہی چیز ہے جس کی تلاش میں لوگ سرگرداں ہیں، مجاہدات و ریاضات برداشت کرتے ہیں کہ شاید غیب کی کوئی کرن چمک اٹھے، کسی ایماء اور اشارہ سے سرفرازی ہو، قرآن کے پڑھنے والے کو یہ سہولت تمام یہی مقام حاصل ہے سلطان المشائخ لوگوں سے فرماتے کہ قرآن پڑھتے ہوئے کم از کم اس شعور کو تو ہر شخص میں ہونا چاہیے کہ :

"این دولت چہ لائق منست ومرا چہ محل این"	یہ دولت مرے حق میں کیا ہی بہتر ہے

سعادت باشد" اور سعادت کا یہ عمل کیا خوب ہے۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس ناسوتی زندگی میں اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی بغیر کسی واسطہ کے حق تعالیٰ سے ان ہی کے الفاظ میں ان علوم کو حاصل کر رہا ہے، جن کے حاصل کرنے کا اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ اب باقی نہیں ہے۔

نعمت خداوندی

شیخ محدث دہلوی نے ملتان کے ایک بزرگ سید صدر الدین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے۔

"دو نعمت در عالم بالفعل موجود است کہ فوق جمیع نعمتہاست لیکن مردم قدر آں دو نعمت را نمی شناسند و بداں پے نمی برند و از تحصیل آں غافل اند"

دنیا میں بالفعل دو نعمتیں موجود ہیں جو تمام نعمتوں سے بڑھکر ہیں لیکن لوگ اس کی قدر نہیں کرتے اور اس کے ملنے کی سعی نہیں کرتے بلکہ اس کے حاصل کرنے سے غافل ہیں۔

پھر ان دونوں نعمتوں کی شرح کرتے ہوئے ایک تو اسی نعمت کا ذکر کرتے کہ:

"قرآن مجید کلام پروردگار ست روے سبحانہ تعالیٰ بے واسطہ بلا متکلم و خلق ازاں غافل اند"

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور وہ بلا واسطہ تکلم فرما رہا ہے اور مخلوق اس نعمت سے غافل ہے۔

اور دوسری نعمت یہ ہے کہ:

"وجود مبارک محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بصفت حیات در مدینہ موجود ست (انتہیٰ)"

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک ہے جو صفت حیات کے ساتھ مدینہ میں موجود ہے۔

اور اس سے ہندوستانی صوفیا کے اس نقطہ نظر کا پتہ چلتا ہے جو میرے نزدیک مشائخ چشت کی برکتوں میں ایک برکت ہے، سید صدر الدین کا زمانہ سلطان المشائخ کے بہت بعد کا ہے۔ لودیوں کے عہد میں ملتان میں رہتے تھے۔

سلطان المشائخ اور تلاوت قرآن

بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، میں تو خواجگان چشت کے

طرزِ عمل کا ذکر کر رہا تھا کہ اُنھوں نے اس ملک کے مسلمانوں میں کس قسم کا قرآنی مذاق پیدا کیا تھا، اور اس سے استفادہ کے طریقے ان کے یہاں کیا تھے، امیر خورد نے لکھا ہے کہ سلطان المشائخ کا عام حکم قرآن خوانی کے متعلق یہ بھی تھا کہ:

"یک سیپارہ بہ سکونت حرفاً بعد حرفٍ خواندن بہتر از پانزدہ سیپارہ بسرعت خواندن ست"	ترتیل کا ساتھ ایک پارہ پڑھنا پندرہ پارہ تیز پڑھنے سے بہتر ہے

فرماتے تھے کہ:

"درچنیں خواندن نور تلاوت بیشتر باشد اگرچہ درروال خواندن ہم از نور خالی نبود"	ترتیل کا ساتھ پڑھنے میں نور زیادہ ہوتا ہے گو تیز پڑھنا بھی نور سے خالی نہیں ہوتا،

خود آخر عمر تک جو اسّی سے متجاوز تھی، پوچھنے والے نے جب یہ پوچھا کہ:

"شما ہر روز چہ مقدار می خوانید، فرمود یک سیپارہ"	آپ ہر دن کس قدر تلاوت فرماتے ہیں فرمایا صرف ایک پارہ،

ظاہر ہے کہ اس "ایک سیپارہ" کے پڑھنے کا وہی مطلب تھا کہ "بہ سکونت حرفاً بعد حرفٍ خواندن" کے طریقہ پر حضرت والا کا عمل تھا، تلاوت کے اس طریقہ سے جیساکہ سلطان المشائخ ہی سے میں نقل کر چکا ہوں کہ:

تالی (قرآن پڑھنے) را وصول دیر تر بود۔

لیکن گو ذکر کے عام طریقہ سے یہ وصول دیر میں ہوتا ہو، لیکن واقعہ وہی ہے کہ:

"چناں خوف زوالی نبود"

اس لیے زوال کی صورت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ العیاذ باللہ کسی مسلمان کے دل میں خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خدانخواستہ "غلط بیانی" کا شبہ پیدا ہو لیکن جس شبہ کی گنجائش اب غیر مسلموں کے قلوب میں بھی اگر سچ پوچھیے تو باقی

نہیں رہی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا عام وزن نسل انسانی پر اتنا پڑچکا ہے کہ کھلے بندوں بغیر کسی جھجک کے اس کی ہمت کسی میں باقی نہیں رہی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہہ سکتا ہو کہ خاکم بدہن "آپ جھوٹ بولتے تھے" تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک مسلمان اپنے اندر اس شبہ کی گنجائش کہاں سے پا سکتا ہے، اور میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن سے استفادہ صرف ایک اسی مقدمہ پر مبنی ہے، میں نہیں جانتا کہ "وصول حق" کے لیے اس سے زیادہ مختصر قطعی اور یقینی راہ اور کیا ہو سکتی ہے، دنیا کی ساری قومیں مسلمانوں کے سامنے سب کچھ پیش کر سکتی ہیں لیکن قرآن ہی ایک دولت مسلمانوں کے پاس یقین کی ایسی دولت ہے جس کا مقابلہ نہ یورپ کا فلسفہ کر سکتا ہے اور نہ ہندوستان کا "اپنشدا"، نہ یہاں کے قصاصوں کے خوارق اور عجائب کا وہ طومار، صرف ایک مقدمہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹ نہیں بولتے تھے اچانک علم و یقین کے ایک ایسے دروازے کو قرآن کی صورت میں کھول دیتا ہے جس کے بعد علم کے سارے دروازے جن میں بہرحال کچھ نہ کچھ شک ہے بے اعتمادی اور عدم وثوق کے جراثیم ان کی بنیادوں میں بھرے ہوئے ہیں، خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔ عقلی تخمینوں کی تاریکیوں سے نکل کر آدمی براہ راست حق تعالیٰ کے علم کی روشنی میں آجاتا ہے، البتہ اس علم سے استفادہ کے جو مذکورۂ بالا طریقے مشائخ چشت میں مروج تھے، ان پر جب آدمی عمل کرنا شروع کرتا ہے اور جو ضابطے تلاوت قرآن کے ان بزرگوں نے اس ملک میں نافذ کیے تھے، جو ان کے نہیں بلکہ سلف ہی سے منقول تھے، جب ان کو اپنا دستور العمل سلوک بناتا ہے تو گو دیر ہی میں سہی، لیکن وصول کے نتائج اس کے سامنے اسی زندگی میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

تلاوت قرآن کے اثرات

سلطان المشائخ سے کسی نے دریافت کیا تھا کہ قرآنی راہ سے وصول کی جو سعادت اس زندگی میں میسر آتی ہے وہ کیا ہوتی ہے، آپ نے

اس کا جو جواب دیا تھا فوائد الفواد میں آپ ہی کے الفاظ میں وہ منقول ہے،

"فرمود در حالت تلاوت و سماع سعادتے	تلاوت اور سماعت قرآن کی حالت میں
کہ حاصل آید آں بر سہ قسم ست انوار	جو سعادت حاصل ہوتی ہے اس کی تین
ست احوال ست و آثار ست"	قسمیں ہیں انوار، احوال اور آثار۔

ظاہر ہے کہ یہ تینوں چیزیں تجربے سے تعلق رکھتی ہیں، الفاظ سے ان کی تعبیر مشکل ہے۔ تاہم سلطان المشائخؒ نے اس کی کچھ تفصیل بھی فرمائی ہے۔ آخری چیز یعنی "آثار" کا چونکہ تعلق اسی عالم حس سے ہے، یعنی آدمی کے جسم پہ آنکھوں پر یہ کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، اس لیے اس کو تو ہم آپ بھی سمجھ سکتے ہیں، سلطان المشائخ نے فرمایا تھا کہ گریہ آثار جہاں سے آتے ہیں، اس کا اصطلاحی نام "عالم ملک" ہے لیکن یہ انوار و احوال آثار میں سے آخری چیز چونکہ "جوارح" یعنی بدن اور اعضاء بدن پہ نازل ہوتے ہیں، اس لیے اس کا احساس دوسروں کو بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں کہ:

بکائے و حرکتے و جنبشے کہ ظاہر می شود آں	جو گریہ، حرکت اور جنبش ظاہر ہوتی ہے
را آثار می گویند و آں از عالم ملک ست	اسے آثار کہتے ہیں اور یہ اعضاء ظاہری
بر جوارح" (اعضاء ظاہری)(۲)	پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ سابقہ ضوابط کے تحت جب قرآن آدمی پڑھتا ہے تو آخر میں پڑھتے پڑھتے اس پر گریہ طاری ہوتا ہے بدن میں حرکت اور جنبش پیدا ہوتی ہے گویا قرآنی آیت۔

اللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا	اللہ ہی نے اتاری اچھی بات اس کتاب کی صورت
مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ	میں ...... جس کی آیتیں باہم ملتی جلتی
جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ	ہیں جو دہرا دہرا کر پڑھی جاتی ہیں جو لوگ
ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ	اللہ سے ڈرتے ہیں ان کے بدن کانپنے لگتے

اِلیٰ ذِکْرِ اللہِ — ہیں پھران کی بدلی اور قلوب نرم پڑ جاتے ہیں اللہ کی یاد کے لیے۔

[ک]ی کیفیت اس پر شروع ہو جاتی ہے، لیکن جوارح کے یہ آثار دراصل باطنی انقلابات کے [ث]مرات ہوتے ہیں، سلطان المشائخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عالم ملکوت سے [پ]ڑھنے والے کی روح پر انوار کا نزول ہوتا ہے، انوار کے بعد عالم جبروت سے قلوب [پ]ر احوال نازل ہوتے ہیں آپ کے الفاظ یہ ہیں :۔

"نخست انوار از ملکوت بر ارواح بعد آں احوال از جبروت بر قلوب بعد ازاں آثار از ملک بر جوارح" — تلاوت کے بعد پہلے (شروع شروع میں) انوار کا نزول ملکوت سے ارواح پر اس کے بعد احوال کا جبروت سے قلوب پر اس کے بعد آثار کا ملک سے جوارح پر۔

امیر خسرو — سلطان المشائخ کے مشہور "محبوب ترک" حضرت امیر خسرو جنہیں حضرت نے سلوک بالقرآن ہی پر لگا دیا تھا، اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا وہ سات [پ]ارے روزانہ تہجد میں پڑھا کرتے تھے، ایک دن مجلس مبارک میں حاضر ہوئے پوچھا گیا

ترک! حال مشغولیہا چیست؟ — ترک تمہاری مشغولی کا کیا حال ہے۔

حضرت امیر خسرو نے جواب میں فرمایا :۔

مخدوما! چند گاہ باشد کہ بوقت آخر شب گریہ مستولی میشود (سیر الاولیاء ص ۳۰۴) — مخدوم! بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آخری شب میں گریہ طاری ہو جاتا ہے

لہ بخاری میں ہے کہ بعض صحابہ یعنی حضرت سید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عالم حس میں بھی ان قرآنی انوار کا مشاہدہ ہوتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب انہوں نے قصہ بیان کیا کہ میں قرآن پڑھ رہا تھا کہ گھوڑی میری بھڑکی، آسمان کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ ایک "ظلہ" روشنی سے جگمگاتا ہوا آسمان کی طرف چڑھ رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ قرآن کے انوار تھے۔

یعنی اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ۔	جب سنتے ہیں وہ چیز جسے اُتارا اللہ نے رسول پر تو دیکھتے ہو تم اُن کی آنکھوں کو کہ بہہ پڑتی ہیں آنسوؤں سے کیونکہ "حق" کو انہوں نے پہچانا۔

کی علاوت امیر کو ملنے لگی، سلطان المشائخ نے سن کر فرمایا:

"الحمدللہ اندکے ظاہر شدن گرفت"	خدا کا شکر ہے کچھ ظاہر ہونے شروع ہو گئے

مشائخ چشت اور فہم قرآنی

آیات قرآنی کی تلاوت حرفاً بحرفاً اس طریقہ سے کہ ان کے معانی کو بھی دل پر گذارا جائے۔ اس سلسلہ میں مشائخ چشت کی فہم قرآنی کا کیا انداز تھا، ہم ان کے اس مذاق کا اندازہ مثالوں سے کر سکتے ہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ وہ قرآنی علم کو "جو عمل" کی شکل دیتے تھے اس باب میں ان کا نقطۂ نظر کیا تھا، اور عمل سے ان کی غرض کیا تھی۔

شیخ کبیر شکر گنج سے سلطان المشائخ راوی ہیں کہ حضرت والا نے ایک دن ارشاد فرمایا کہ:۔

"فقیر صابر بر غنی شاکر رجحان دارد"	صبر کرنے والا محتاج شکر گذار مالدار پر فوقیت رکھتا ہے

یعنی مفلس ہونے کے باوجود جو صابر ہو اس کو شکر کرنے والے آسودہ حال مسلمان پر ترجیح ہوگی۔ یہ تو دعوی تھا، دلیل میں شیخ کبیر نے جو بات پیش کی اسی سے اس کا سراغ ملتا ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک قرآن فہمی اور قرآنی آیات پر عمل کرنے کا کیا مطلب ہوتا تھا؟ سلطان المشائخ ہی راوی ہیں کہ شیخ کبیر نے دعوے کو پیش کر کے دلیل یہ بیان کی کہ:

زیرا کہ غنی شاکر را بر شکر وعدہ چیست؟	اس لئے کہ شکر گذار مالدار کے لیے شکر پر کیا وعدہ ہے

یعنی دیکھنا یہ چاہیے کہ تونگروں کو شکر پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے قرآن میں کس چیز کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اس کے بعد آیت:

وَلَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ	اگر تم شکر کروگے تو میں تمہیں بڑھاتا چلا جاؤں گا

تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ "وعدہ مزید نعمت" ہے لیکن:

"در صبر بشارت چیست؟ نعمت معیت"	اور صبر میں کیسی بشارت ہے معیت حق کی نعمت کی۔

اور ثبوت میں آیت قرآنی:

إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ٥	یعنی اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ شکر میں تو وہی نعمتیں جو آدمی کو ملتی ہیں، اُن ہی کے اضافہ کی بشارت قرآن میں دی گئی ہے، لیکن صبر میں تو نعمت ہی نہیں، صاحب نعمت کی رفاقت اور معیت کا مژدہ سنایا گیا ہے، شیخ کبیر نے اس کے بعد فرمایا:۔

"میاں ایں مرتبہ و آں مرتبہ بیں آں فرق از کجا تا کجا است"!	اس مرتبہ اور اس کے درمیان دیکھو کتنا فرق ہے۔

جس وقت سلطان المشائخ شیخ کبیر کے اس قول کو بیان فرما رہے تھے، حضرت کے ممتاز مریدوں میں سے قاضی محی الدین کاشانی بھی موجود تھے، انہوں نے دریافت کیا کہ:۔

هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ	وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو۔

کی آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صابر و غیر صابر ہر ایک کو معیت حق حاصل ہے، پھر صبر کی خصوصیت کیا ہوئی، سلطان المشائخ نے فرمایا کہ صبر میں:

"معیت با عنایت است یعنی بحب و برضیٰ"	معیت حق عنایت کے ساتھ ہے یعنی محبت و خوشنودی کے ساتھ۔

یعنی صرف "معیت" ذاتی یا علمی نہیں بلکہ محبوبیت کے ساتھ حق تعالیٰ کی یہ معیت صابر کو میسر آتی ہے، اور صابر کی محبوبیت کے اس مقام کا قرآن میں جتنی بار اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ (پیار کرتا ہے قطعاً اللہ صبر کرنے والوں کو) دہرایا گیا ہے یا اسی قسم کی آیتوں سے قرآن کے پڑھنے والوں میں اس سے کون ناواقف ہے، نص محکم قطعی کے رو سے صابر محبوب الٰہی بن جاتا ہے۔

اعمال عقاید کی روشنی میں

بہرحال یہی ایک مثال کافی ہو سکتی ہے کہ قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کا مطلب ان بزرگوں کے نزدیک کیا تھا، قرآن پر عمل کرنا چاہیے جو ایک عام بات ہے، جس کا چرچا خصوصاً اس زمانہ میں بہت زیادہ ہے، کیونکہ مغرب نے آج جو ذہنیت ملک میں پیدا کی ہے اس میں ایمان یا علم صحیح کی کوئی قیمت نہیں، آپ کا علم کچھ ہی کیوں نہ ہو، دشمن خدا کے آپ قائل ہوں، شرک جیسی بدترین بغاوت کا کوئی مرتکب ہو لیکن اگر اس کی زندگی کا کوئی عملی پہلو اگر اچھا ہے، تو اس زمانہ میں اس کے عقائد سے قطع نظر کر کے عمل کی صرف اسی خوبی کی وجہ سے اس کا شمار نیکوکاروں، بلکہ بعضوں کے نزدیک تو خدا رسیدوں میں کیا جاتا ہے، اور یہ سارا عارضہ اس کا ہے کہ الحیٰوۃ الدنیا کے بعد الحیٰوۃ الاٰخرۃ کے یقین میں ضعف پیدا ہو گیا ہے، جو منکر ہیں وہ تو خیر منکر ہی ہیں، لیکن بظاہر جو اپنے آپ کو مومن سمجھتے ہیں ان کے نزدیک بھی قیمت صرف ان ہی چیزوں کی ہے جن سے موجودہ زندگی میں کچھ فائدہ پہنچتا ہو، چونکہ علوم صحیحہ یا اعتقادات حقہ کے نتائج عموماً دوسری زندگی میں ظاہر ہوں گے اور اعمال کے نتائج یہاں بھی پیدا ہونے لگتے ہیں، جھگڑا فساد مٹتا ہے، امن حاصل ہوتا ہے، عافیت میسر آتی ہے، اسی لئے مذہب کا عملی پہلو اب بھی ان تنگ نظروں کو اپیل کرتا ہے اور یہی راز ہے اس بات کا کہ سارا زور اس زمانہ میں عمل ہی عمل پر دیا جا رہا ہے۔

بربادی و تباہی کے جتنے مراثی خواہ محراب و منبر پر پڑھے جاتے ہوں یا پنڈال و ڈائس پر، ہر جگہ عمل کا رونا رویا جاتا ہے، قرآن پر عمل جاتا رہا اس لیے مسلمان تباہ ہو گئے، حتی کہ بعض جوشیلوں کا غلو تو اس باب میں اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ یورپ کے ملاحدۂ فساق جن کی ساری زندگی جاہلیت کی زندگی ہے ان کو عموماً عمل بالقرآن کی سند دی جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ ان قوموں نے قرآن کو پکڑا، اس لئے آج حکومت و سلطنت کے مزے بھوگ رہے ہیں اور مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑا اس لیے افلاس و نکبت، خواری اور ذلت میں گرفتار ہیں یورپ عامل بالقرآن ہے، اب اس کا جواب میں کیا دے سکتا ہوں۔

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟

آنکھیں رکھتے ہوئے جو اندھے بنتے ہوں، انہیں کون دکھلا سکتا ہے، لیکن دوسری بات کہ مسلمانوں کا چونکہ قرآن پر عمل باقی نہ رہا اس لیے وہ تباہ و برباد ہو گئے، اس میں شک نہیں ہے کہ کہنے والے جس معنی میں یہ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن واقع کے لحاظ سے اس کا کون انکار کر سکتا ہے، اسی لیے میں تو عمل بالقرآن کے عصری مطالبوں کو؛

کلمة حق یراد بها الباطل | سچی بات ہے لیکن اس سے جو مقصد ہے

وہ لاحاصل ہے نتیجہ اور غلط ہے۔

کی ایک مثال سمجھتا ہوں، کچھ بھی ہو، اتنا ضرور ہے کہ قرآن پر عمل آج مسلمانوں میں نہیں ہو رہا ہے، مگر سوال یہ ہوتا ہے کہ قرآن پر عمل کیا کیا جائے، قرآن کی حالت تو یہ ہے کہ اسلامی اعمال کے امہات نماز و روزہ حج زکوٰۃ تک کے تفصیلات تو اس میں نہیں پائے جاتے[1] بلکہ قریب قریب سب کی حیثیت عنوان اور باب کی ہے،

[1] اور جن لوگوں نے قرآنی آیات ہی سے تفصیلات کے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

تفصیلات کا علم تو پیغمبر کی زندگی سے حاصل ہو رہا ہے۔

عمل بالقرآن کا مفہوم

اور جب نماز و روزہ جیسے امہات الاعمال کا قرآن میں یہ حال ہے تو پھر اسی پر دوسرے اعمال کو قیاس کرنا چاہیے، میں نے ایک دفعہ نہیں بسا اوقات عمل بالقرآن کے مطالبہ کرنے والوں سے پوچھا ہے کہ قرآن پر عمل کرنے کا کیا مطلب ہے، اس میں نہ زراعت کا طریقہ بتایا گیا ہے نہ صنعت کا، نہ حرفت کا، نہ تجارت کا، ان چیزوں کا اگر ذکر قرآن میں ہے بھی تو محض ضمنی طریقہ سے لفظ دو لفظ میں کسی دوسرے مقصد کے ذیل میں ان کا ذکر بھی آ گیا ہے، یہ تو ان اعمال کا حال ہوا، جن کا تعلق دنیا سے ہے۔ اور دینی اعمال کی کیفیت تو آپ سن ہی چکے کہ قریب قریب ان میں اکثر کے عنوانوں کا ذکر ہے، تفصیل جیسی کہ چاہیئے وہ ان کی بھی نہیں، اگر صرف قرآن ہی کو پیش نظر رکھ کر کوئی نماز کے اجزار کو مرتب کرنا چاہے تو اس میں شک نہیں کہ قیام، رکوع، سجدہ یہ مختلف اجزاء تو قرآن میں مل جائیں گے لیکن ان میں کس جزء کو مقدم رکھا جائے کس کو مؤخر کیا جائے۔ قرآن سے اس کا فیصلہ کیا ممکن ہے؟ جب تک کہ پیغمبر کی زندگی سے ہم اس کو نہ سمجھیں پھر عمل بالقرآن کا کیا مطلب؟ میں نے تو نہیں دیکھا کہ کسی نے اس کا کوئی معقول جواب دیا ہو۔

لیکن شیخ کبیر نے قرآن کی دو آیتوں "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ"، "إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِينَ" کو جس طرح سمجھایا ہے، اور عمل سے ان دونوں کا جو تعلق دکھایا ہے، اگر آپ اس طرح قرآن کو پڑھنا شروع کریں اور اپنے دیدہ کو نادیدہ اپنے شنیدہ کو ناشنیدہ بنا کر قرآن سے پھر علم لینا شروع کر دیں یعنی آپ سارے دیدوں اور شنیدوں کو باہر نکال کر ان ہی قرآنی علوم کو اپنی فطرت کی گہرائیوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵) اُن کی لوجھ بجھکڑی تفسیروں کا مطالعہ ان کے جنون کی کافی دلیل ہے جگر الو لیوں کی تفسیر پڑھیے زعفران زار کشمیر کی سیر سے آپ کو مستغنی کر دے گی ۱۲۔

یقین واذعان کی بنیادوں پر جمانا شروع کر دیں، صبر کے ساتھ حق تعالیٰ کے جو مواعید ہیں، توکل پر جن ثمرات کی بشارتیں سنائی گئی ہیں، ذاتِ حق کے ساتھ آپ کا تعلق تقویٰ کا جب قائم ہو جاتا ہے تو اس کے ثمرات و آثار قرآن نے جو بیان کیے ہیں اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر آپ قرآنی آیات کو سکون کے ساتھ حرفاً بعد حرفٍ پڑھنا شروع کیجئے تو یقین مانیے کہ ہر آیت آپ کو عمل کے لئے ایک نیا اور جدید علم دے گی، لیکن جو کچھ آنکھوں سے کانوں سے خود دیکھا یا سنا ہے، یا آپ ہی جیسے کسی آدمی نے دیکھ سن کر جو ناقص معلومات اپنے اندر جمع کیے ہیں۔ ان دیدوں اور شنیدوں کو دیدہ اور شنیدہ ہی باقی رکھتے ہوئے آپ قرآن سے اگر کچھ لینا چاہیں گے تو یقین مانیے کہ آپ کو کچھ نہ ملے گا، اور اس زمانہ کی محرومیوں کے نیچے دراصل تنگ نظری، دماغی اختلاط کا یہی زہر چھپا ہوا ہے، وہ پیغمبر کے پاس آتے ہیں کہ عقل و حس کے سوا ان کے ذریعہ سے کچھ جدید معلومات حاصل ہوں گے، لیکن جب پیغمبر آپ کے سامنے پیش کرتا ہے کہ عالم محسوس کے پیچھے غیب کے عوالم ہیں، ان عوالم میں ملائکہ ہیں، جنات ہیں، حوریں ہیں، قصور ہیں، نار ہے، نور ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ یہ چیزیں تو ہمیں پہلے سے معلوم نہ تھیں، میری آنکھوں نے تو ان کو نہیں دیکھا ہے، پھر ان کو میں کیسے مان لوں؟ آپ ہی غور کیجئے کہ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ جو کچھ آپ کو پہلے سے معلوم ہے اس علم پر آپ بال برابر اضافہ کرنا نہیں چاہتے، ظاہر ہے کہ جس شخص کی دماغی پستی اس حد کو پہنچی ہوئی ہو، کہ جو کچھ پہلے سے اسے معلوم ہے اس پر اضافہ کے نام سے کان میں انگلیاں ٹھونستا ہو، چیختا ہو، چلاتا ہو، کیا اس کو اس جدید علم کی راہ سے کچھ بھی مل سکتا ہے۔ ان مسکینوں سے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، کہ جب تمہارا یہی حال ہے کہ حس و عقل کے حدود کے آگے قدم رکھنے سے تمہارے پاؤں لڑکھڑانے

لگتے ہیں، بدن پر لرزہ طاری ہوتا ہے تو آپ پیغمبر کے پاس تشریف ہی کیوں لائے تھے، حسّی اور عقلی معلومات کے لیے تو آپ کے پاس پیغام پہنچانے کے لیے آپ کے حواس اور آپ کی عقل موجود ہی تھی۔ پیغمبر کی، پیغمبر کے جدید ذریعۂ علم وحی و نبوت کی ضرورت تو ہوتی ہی اس لئے ہے کہ حواس و عقل جہاں جواب دے دیتے ہیں وہاں سے علم کی ایک نئی راہ ہے، جو پیغمبروں کے ذریعہ، قدرت نے کھولی ہے لیکن حواس و عقل کی راہ سے جو کچھ جانا جا چکا ہے، اب مزید جاننے سے جو گھبراتا ہے، بھاگتا ہے، آپ ہی بتائیے کہ خدا کا کلام اُسے کیا دے گا۔ بہرحال اب دنیا جس طرح چاہے قرآن کو استعمال کرے لیکن ہندوستان کے جس عہد کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں ہندی مسلمانوں کو قرآن سے استفادہ کا جو طریقہ بتایا گیا تھا اس کی ایک معمولی مثال شیخ کبیر شکر گنج کی فرمودہ وہ مثال تھی۔ کتابوں میں ان بزرگوں کے جو اقوال اس سلسلہ میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر ان کو کوئی جمع کرے تو وہ اچھی خاصی ایک کتاب بن سکتی ہے، ظاہر ہے کہ میرے لیے یہاں ان سب کے ذکر کی کیا گنجائش ہے، تاہم خواجہ بزرگ اجمیری کے ایک سلسلہ یعنی قطبی سلسلہ کے بزرگ کا جب نقطۂ نظر آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہے۔ تو جی نہیں مانتا کہ طریقۂ چشتیہ کی دوسری شاخ حمیدیہ جس کے متعلق گذر چکا کہ صدیوں تک مدارس کا درس طریقۂ سلوک کے ایک حزب کی حیثیت سے انہیں جاری تھا۔

ذوقِ قرآنی کا ایک نمونہ

اس سلسلہ کے ذوقِ قرآنی کا بھی ایک نمونہ تو کم از کم پیش کر ہی دوں۔ شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں شیخ حمیدالدین کے ترجمہ میں ان کے بعض مکتوبات نقل کیے ہیں، ان ہی میں قرآنی آیات کی چند تفسیروں کے سلسلہ میں ایک دلچسپ چیز قرآن کی مشہور آیت ہے۔

اَلَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا — اپنے بندوں سے جن لوگوں کو ہم نے چنا تھا

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ	ان میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جو اپنے نفس کے لیے ظالم ہیں کچھ میانہ رو ہیں اور کچھ ان میں نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں اللہ کے فرمان کے تحت

کے متعلق ایک ملخص پیش کیا ہے، تفسیروں میں اس آیت کے مطلب میں لوگوں نے کیا فرمایا ہے، اس وقت مجھے اس سے بحث نہیں بلکہ شیخ حمید الدین نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے صرف اس کا خلاصہ پیش کرنا مقصود ہے، ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہے ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ (اپنے آپ کے ساتھ ظلم کرنے والا) مُّقْتَصِدٌ (میانہ رو) سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ (نیکیوں کے ساتھ آگے بڑھنے والا)

سوال ہوتا ہے کہ یہ تینوں قسمیں کیا ایسی ہیں جن میں مومن غیر مومن سب ہی شریک ہیں، یا اہل ایمان ہی کے اندر یہ تین طبقات پائے جاتے ہیں شیخ ناگوری نے اس قرینہ سے کہ ذکر ان لوگوں کا ہے جو "چنے گئے" یعنی اصطفینا من عبادنا (ہم نے اپنے بندوں سے جنہیں چن لیا ہے) ان ہی کی یہ تین قسمیں بتائی گئی ہیں، اس لیے غیر مومن عباد ان قسموں کے نیچے داخل نہیں ہو سکتے۔ شیخ نے اس کے بعد اہل ایمان کے ان تینوں طبقوں کی تعبیر اپنے الفاظ میں معذوران، مشکوران، قائمان سے کی ہے گویا ظالم لنفسہ والے ان کے خیال میں "معذوران اند" کے نیچے داخل ہیں یہ معذوران کون لوگ ہیں:

آنہا کہ بعد ایمان باللہ و اقرار ہم بالتوحید بحضرت حاضر نیایند، دیر آیند و آہستہ آیند و از خطاب سار غو غافل باشند	اللہ پر ایمان لانے اور توحید کا اقرار کرنے کے بعد دربار میں حاضر نہ ہوئے دیر سے گئے اور اس خطاب سے غافل رہے جس میں تیزی دکھاؤ کا حکم دیا گیا ہے۔

گویا ان لوگوں نے اپنے ان فرائض کو جو ان کے نفوس پر عائد ہوتے تھے ان میں ظلم کا ارتکاب کیا ان حقوق کی ادائیگی میں کمی کی، اس لیے وہ ظالم لنفسہ ٹھہرے۔

مشکوران یعنی مقتصد کون لوگ ہیں، ر" بایمان ہم عنان آیند و باقرار ہم رکاب" مقتصد (میانہ رو) کا مطلب شیخ کے نزدیک یہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے مانا تھا، جن باتوں کا اقرار کیا تھا، ان کے ساتھ ساتھ لگے چلے آرہے ہیں۔ اور یہ ہوا اقتصاد و ہمعنانی کا مطلب۔

فانیان یعنی سابق بالخیرات کون لوگ ہیں، شیخ نے لکھا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں، جن کی فطرت میں "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کے سوال کا جواب "بلیٰ" (کیوں نہیں) دے کر اپنے اقرار کو کھو نہیں چکا تھا، بلکہ اس کا شعور ان میں باقی تھا، اس لیے۔

"درین جہان پیش از دعوت بحکم خطاب ازلی وجواب لم یزلی، اجابت کردہ"

شیخ نے اس قسم کے تمام واقعات یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہم اصحاب سے جو یہ مروی ہے کہ بغیر کسی تذبذب کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سننے کے ساتھ ہی ایمان لے آئے، یا اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بے دیکھے پیغمبر کو مان لیا، یا سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ تلاش حق میں اس ملک سے اس ملک، اس راہب سے اس راہب کے پاس پھرے پھرتے تھے، تاآنکہ مدینہ منورہ پہنچے اور دولت ایمان سے مشرف ہوئے۔

شیخ نے ان تمام بزرگوں کے ابتدار اسلام کے قصوں کا اجمالاً ذکر کیا ہے، جس سے ان کی اس وسعتِ نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو معرفۃ الصحابہ کے فن میں انہیں حاصل تھی لیکن میرا مقصود اس وقت صرف خواجگانِ چشت کے قرآنی ذوق کا ایک دوسرا نمونہ پیش کرنا تھا میں یہ نہیں کہتا کہ شیخ نے جو مطلب آیت کا بیان

کیا ہے نا اس کی طرف دوسری تفسیروں میں اشارہ نہیں کیا گیا ہے، لیکن جس خوبی کے ساتھ انہوں نے اہل ایمان کے تینوں طبقوں پر ان تینوں لفظوں کو منطبق کیا ہے کم از کم میرے علم کی حد تک اتنی اچھی ستھری سلجھی ہوئی بات کسی اور تفسیر میں نہیں گذری ہے[1]۔

اور یہ تھا اس زمانہ میں قرآن کی تلاوت کا طریقہ جسے ہندوستان میں بزرگان چشت نے جاری کیا تھا، ان ہی بزرگوں نے جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ڈھول، سارنگی، ستار کے سوا اس ملک میں وہ اور کچھ نہیں لائے۔

گفتگو دراصل اس میں ہو رہی تھی کہ حضرت سلطان المشائخ کو شیخ کبیر شکر گنج نے قرآن کے حفظ کی وصیت فرمائی، اسی سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ مقصود تھا، یعنی کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حفظ سے ان بزرگوں کی غرض صرف الفاظ قرآنی کا یاد کر لینا تھی، اسی لیے مناسب معلوم ہوا کہ مشائخ چشت میں

---

[1] مدت ہوئی دلی میں کسی صاحب کے پاس سلطان التارکین ناگوری کی بعض چیزیں نظر سے گذری تھیں، ایک قرآنی لطیفہ کا خیال بھی آگیا، خواجہ بزرگ اجمیری نے ان کو خطاب کرکے کہا جب تک میں متاہل نہ تھا، بال بچے نہیں ہوئے تھے، یہ حالت تھی کہ دل میں کسی بات کا خیال آیا اور حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ پوری فرما دیتے تھے، لیکن بال بچوں کے قصوں میں پھنسنے کے بعد اب یہ حالت نہیں رہی ہے، دعا قبول تو ہوتی ہے لیکن کچھ تاخیر کے ساتھ، سلطان التارکین نے عرض کیا کہ مریم علیہا الصلوٰۃ کے متعلق بھی قرآن میں ہے کہ جب تک عیسیٰ علیہ السلام نہیں پیدا ہوئے تھے، من عند اللہ رزق ان کے پاس آجاتا تھا لیکن جب عیسیٰ علیہ السلام کی ماں بنیں تو اسی رزق کے لیے ان کو ھُزِّی اِلَیْکِ بِجِذْعِ النَّخْلَۃِ (ہلاؤ اپنی طرف کھجور کے درخت کو) کا حکم دیا گیا یعنی اسباب خواہ جیسے کچھ ہوں لیکن ان کی وہ حالت ختم ہو گئیں۔ اس سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان بزرگوں کا طریقہ

تلاوت قرآن اور تدبر قرآن کا جو طریقہ تھا اُس کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

اب میں پھر اُسی مضمون کی طرف واپس ہوتا ہوں مطلب یہ ہے کہ یہ تو شیخ کبیر کی وصیت تھی۔

وصیت کی تعمیل

میں نے عرض کیا تھا کہ سنہ ۶۶۹ ہجری ۲۵۔ جمادی الاولیٰ نماز جمعہ کے بعد شیخ کبیر نے سلطان المشائخ کو حفظ بالقرآن اور "ہندگیری" کی مہم کی خدمت سپرد کی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ خوش قسمتی سے اس سلسلہ کی بعض چیزیں میر خورد صاحب سیر الاولیاء کے ذریعہ سے ایسی مل گئی ہیں جو سلطان المشائخ کی خود نوشتہ یادداشت سے ماخوذ ہیں، جمادی الاولیٰ کا مہینہ تو گویا گذر ہی چکا تھا، دو مہینے بعد یعنی جمادی الثانیہ، اور رجب کے بعد پہلی شعبان کو سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ شیخ کبیر کی خدمت میں میری طرف سے دعا کی یہ درخواست پیش ہوئی۔ میر خورد نے ان ہی کے الفاظ نقل کیے ہیں۔

"از برائے آں کہ کاتب در بدر خلق نہ گردد" ص ۱۲۳	اس واسطے کہ کاتب کو در بدر مارا مارا پھرنا نہ پڑے۔

عجب درخواست! مہم اتنی بڑی سپرد کی گئی ہے، کہ سارے ہندوستان پر قبضہ کرنا پڑے گا، اور شرط یہ لگائی جاتی ہے کہ کسی مخلوق کے دروازے پر مارا مارا نہ پھرنا پڑے، آج اس کا تصور کون کر سکتا ہے، یہ تو ظاہر ہے کہ اس مہم میں مشغول ہونے کے بعد سلطان المشائخ کے لیے اس کا موقع تو کہاں تھا کہ اب کسی کی وہ ملازمت کرتے، ملازمت کی آمدنی ہو یا کسی اور ذریعہ کی انفرادی آمدنی کھلی ہوئی بات ہے کہ اتنی بڑی ہم خدمت کی سرانجامی کے لیے جسے بعد کو سلطان المشائخ نے انجام بھی دی

اس کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی، لیکن چند دل کا تو دروازہ کھلا ہوا تھا سلطان المشائخ اس کو بھی برداشت کرنا نہیں چاہتے، سب کچھ ہو جائے اور کسی مخلوق کے دروازے پر بھٹکنا بھی نہ پڑے، یہی ان کی درخواست تھی، فرماتے ہیں کہ شیخ نے درخواست قبول فرمائی۔

"باجابت و فاتحہ مقرون فرمود" قبول فرمایا اور سورۂ فاتحہ پڑھی،

"فاتحہ" یہ اس زمانہ کا دستور تھا، کہ جب کوئی کسی کے لیے دعا کرتا تھا تو سورۂ فاتحہ پڑھ کر دعا کی جاتی تھی، اسی بنیاد پر محاورہ ہو گیا تھا کہ کسی دوسرے سے جب کوئی دعا کی درخواست کرتا تو یہی کہتا کہ "برائے من فاتحہ بخوانید"

سلطان المشائخ کے لئے دعا

بہر حال یہ تو اس دن کا قصہ ہوا، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ایک خاص موقع پر شیخ کبیر نے یہ بھی فرمایا کہ:

"من از خدا خواستہ ام کہ ہر چہ از خدائے بخواہی بیابی" میں نے اللہ تعالیٰ سے خواہش کی ہے کہ تو خدا سے جو چاہے سو پائے۔

اور اپنی عصا بھی ان کے حوالہ کی، سلطان المشائخ کا بیان ہے کہ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ شیخ کبیر حجرہ میں چلے گئے۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ:

"در حجرہ سر برہنہ کردہ و بشرہ متغیر کردہ می گشت" حجرہ میں جا کر ننگے سر اور پریشان حال پھرنے لگے۔

یعنی سر سے ٹوپی اتار کر شیخ کبیر حجرہ میں ٹہل رہے تھے چہرہ متغیر تھا۔ فرماتے ہیں کہ اسی خاص حال میں سن رہا تھا کہ ایک خاص کیفیت کے ساتھ شیخ کبیر کی زبان مبارک پر یہ اشعار جاری ہیں:

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم	خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توئی	از بہر تو میرم از برائے تو زیم[1]

گویا آیت قرآنی؛

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔	میری نماز (عبادت) میری قربانیاں میری زندگی میری موت، اسی اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا پالنے والا ہے۔

کا ترجمہ ہو رہا تھا، سلطان جی فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ جب یہ اشعار ختم ہو گئے تو شیخ کبیر؛

"سر بسجدہ نہاد، چند کرت (بار) من مثل ایں دیدم"	سر بسجدہ ہوئے اور میں نے دیکھا کہ بار بار سجدہ کرتے رہے۔

جس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ کسی کے قدموں پر بار بار شیخ کبیر سر رکھتے تھے اور اٹھاتے تھے، یہ کیا ہو رہا تھا، کیا اس کے لیے جس نے دعا کرائی تھی کہ "در بدر خلق نہ گردد" اسی کو در بدر گردی کی جھنجھٹوں سے نجات کی تدبیر بتائی جا رہی تھی؟

توجہ الی اللہ سیر الاولیاء ہی میں دوسری جگہ سلطان المشائخ کے خلیفۂ اعظم حضرت چراغ دہلوی کے حوالہ سے شیخ کبیر کے ایک قول کا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ شیخ کبیر کے مشہور وابستوں میں شیخ جمال الدین ہانسوی تھے، انہوں نے کسی شخص کے ذریعہ سے شیخ کبیر کو کہلا بھیجا تھا کہ آج کل بڑا تکلیف اور ضیق میں گذر رہی ہے، شیخ کبیر نے جواب میں کہلا بھیجا تھا۔

---

[1] میری تمنا ہے کہ ہمیشہ آپ کی وفاداری میں زندہ رہوں۔ مٹی ہو جاؤں اور آپ کے قدموں میں زندگی گذاروں مجھ بدحال کا مقصد دونوں جہان میں آپ کی ذات ہے آپ کے واسطے مروں اور آپ کے ہی لئے زندہ رہوں۔

"چوں ولایت بکسے دادہ شود اورا — جب کسی کو حکومت دی جائے تو اس کا فرض
واجب ست استمالت آں ولایت" صنڈا — ہے کہ وہاں کے لوگوں کے لوگوں کی دلجوئی کرے

جس کا ظاہر مطلب تو یہ تھا کہ جہاں کی حکومت ملتی ہے، چاہیے کہ اس ملک کے باشندوں کی دل وہی کرے، اور ان کے قلوب کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرے۔

چراغ دہلوی سے کسی پوچھنے والے نے پوچھا کہ یہ تو دنیا کے بادشاہوں کی استمالت کا طریقہ ہے تو کیا دین کے بادشاہوں کو بھی یہی کرنا چاہیے۔ شیخ کبیر کے اس فقرہ کا جو واقعی مطلب تھا چراغ دہلوی نے اس کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

"استمالت ملوک آخرت توجہ القلب — آخرت کے بادشاہوں کی دلجوئی یہ ہے کہ
الی اللہ من کل الوجوہ" — دل کو پورے طور پر خدا کی طرف لگا دے

یعنی آخرت کے بادشاہوں کو بھی "استمالت" سے کام لینا پڑتا ہے لیکن وہاں کے باشندوں کے قلوب کو نہیں بلکہ قلوب جس کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں ہر طرف سے ٹوٹ کر اسی سے لو لگانا یہ ہے آخرت کے بادشاہوں کی استمالت کا طریقہ قرآن کا تاریخی بیان ہے کہ:

مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ — نہیں بھیجا ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول مگر یہ
رَسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَا — کہ ہم نے وحی کی اس رسول کی طرف اس بات کی "نہیں ہے
اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (سورۃ الانبیاء) — کوئی "الٰہ" مگر میں" تو مجھی کو پوجے چلے جاؤ۔

خاتم الرسل اور خاتم الرسل سے پہلے، جو بھی آخرت کی بادشاہت کا پیغام لے کر آئے یہی کہتے آئے کہ اللہ سوا کوئی نہیں ہے جسے "الٰہ" بنایا جائے۔ من کل الوجوہ قلب کی ساری توجہات کا ساری آرزوؤں کا، ساری تمناؤں کا مرجع خالق تعالیٰ جل مجدہٗ کی ذات مبارک ہی ہو، اپنی "ہندگیری" کی مہم میں سلطان المشائخ نے دراصل اسی قوت کی درخواست کی تھی، شیخ کبیر اپنے طرز عمل سے بھی بتا رہے تھے

کہ اس قوت سے کام لینے اور استفادہ کا کیا طریقہ ہے، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب میں نے شیخ کبیر شکر گنج کو دیکھا کہ بار بار وہ سجدے میں سر رکھتے ہیں اور اٹھاتے ہیں، ان پہ ایک خاص حال طاری ہے۔ تو مجھ سے رہا نہ گیا، اور بے اختیار مضطربانہ حجرہ میں داخل ہوگیا، اور حضرت کے قدموں میں لوٹنے لگا، ایک عجب جلال کا عالم تھا، اس وقت فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ میرے لیے دعا کی جائے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کس چیز کی دعا کی اس وقت درخواست کی تھی فرمایا۔

"استقامت خواستم" میں نے اپنی مضبوطی کی خواہش کی تھی

لا الٰہ الا اللہ پر استقامت ہی کا وہ نشہ تھا۔ جو شیخ کبیر کی صحبت نے سلطان المشائخ میں بھرا تھا۔

ہندگیری کی مہم پر اجودھن سے ہند کے دار السلطنت دلی کی طرف روانہ ہوتے ہیں جہاں نیچے سے اوپر تک بے شمار جھوٹے الٰہ پر اجمائے بیٹھے ہیں، ان میں وہ بھی ہے جس کی زبان کی معمولی حرکت لوگوں کے تن سے سر جدا کر رہی ہے، وہ بھی ہیں جن کی نیازمندی خاک سے اٹھا کر لوگوں کو امارت و دولت کے افلاک تک پہنچا رہی ہے گلی گلی میں عزت تقسیم ہو رہی ہے، مناصب بٹ رہے ہیں، روپے لٹائے جا رہے ہیں، گودیں بھر رہی ہیں، اور جن جن ذرائع سے یہ ساری چیزیں حاصل ہوتی ہیں، سلطان المشائخ سب سے لیس ہیں، آپ پڑھ چکے ہیں کہ اجودھن جانے سے پہلے دلی کی علمی محفلوں کی محفل شکنی بلکہ ان کی عام شہرت ہو چکی ہے کچھ نہیں تو قضاۃ کے عہدے سے لے کر شیخ الاسلامی اور صدر جہانی کے خدمات تک کی ساری راہیں اپنے سامنے کھلی پا رہے ہیں، لیکن اب خالق کی صورت میں جو الٰہ ان کو مل چکا تھا سینہ اسی کے وزن سے اتنا معمور تھا کہ کسی مخلوق کی کوئی گنجائش ان کے قلب میں باقی نہ تھی۔ قلب کی اسی کیفیت کی تعبیر تھی، جس کا اظہار وہی کبھی کبھی ان مشہور زرین الفاظ میں فرمایا

کرتے تھے:

"ایمان کسے تمام نہ شود تا ہمہ خلق در نزدیکی او ہم چو پشک شتر نماید" سیر الاولیاء ص ۵۵۱

مجلسِ مبارک میں دمشق کے ایک شخص کا ذکر ہو رہا تھا۔ جو شیخ الاسلامی کی خدمت کے لئے ساری ساری رات نمازیں پڑھتا تھا، اپنی ان ہی نمازوں کو نگاہِ خلق میں حصولِ عزت کا ذریعہ بنا رہا تھا، جامع ملفوظات راوی ہیں کہ:

"دریں میاں خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر چشم پر آب کردو بر لفظ مبارک راند کہ نبوز اول شیخ الاسلامی را وپس خانقاہ را بعد ازاں خود را" فوائد الفواد ص ۱۲۷	اس درمیان خواجہ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور فرمایا کہ پہلے شیخ الاسلامی خاکستر کو جلا ڈال پھر خانقاہ کو اور اس کے بعد خود اپنی ذات کو۔

الغرض اس شان کے ساتھ سب کچھ کو جلا کر بھسم کر کے وہ اجودھن سے روانہ ہوئے پہلے بداؤں پہنچے، والدہ اور ہمشیرہ، گھر میں اور جو لوگ تھے سب کو ساتھ لے کر جس علاقہ کی ولایت آپ کے سپرد ہوئی تھی اسی کے پایۂ تخت میں پہنچ گئے۔

نظام الدین اولیاء دلی میں

دلی میں جب آپ شروع شروع قیام کے ارادے سے پہنچے ہیں اور اس ارادے سے کہ سب کچھ ہو گا، لیکن کسی مخلوق کے دروازے پر جانا نہ پڑے۔ آخر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ

---

۱ میں نے بھی مختلف مقامات پر شیخ کبیر اور سلطان المشائخ دونوں حضرات کی طرف خانقاہ کا انتساب کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مشائخ چشت کی منجملہ خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اصلاحی صوفیوں والی خانقاہ کا نظام ان کے یہاں نہ تھا فوائد الفواد میں شیخ کبیر کا قول سلطان جی نے نقل کیا ہے "پیران ما را رسم خانقاہ نبود ص ۱۷۹" اس لیے جہاں جہاں میں نے خانقاہ کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے باضابطہ خانقاہ نہ سمجھا جائے ٹھیک جیسے اس چشتی لنگ ہندوستان میں باضابطہ مدرسہ کم تھے ۱۲

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ	کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے
وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا	اور تم سے پہلے جو گذرے ہیں ان جیسی باتیں
مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ	تم پر نہ آئیں گی ان کو سختی اور دکھ نے پہنچا،
وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ	وہ جھنجوڑے گئے، خوب اچھی طرح جھنجوڑے
الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا	ساتھ تا اینکہ بول اٹھے پیغمبر اور ایمان والوں میں
مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ	جو ان کے ساتھ تھے، کب اللہ کی مدد ہوگی

تفصیلات دیکھنا ہو، تو سیر الاولیاء میں دیکھیے جس میں میر خورد نے براہ راست اپنے والد میر مبارک کرمانی کے حوالہ سے اس زلزال شدید (سخت جھنجوڑ) کی ان تفصیلات کو نقل کیا ہے، جن سے حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کو گذرنا پڑا، خلاصہ یہ ہے کہ ابتداءً دلی میں "سرائے نمک" کے نام سے کوئی سرا تھی، وہاں کچھ دن ٹھہرے، پھر امیر خسرو کی کوشش سے ان کا ننھیالی مکان جو راوتؒ عرض کے مکان سے مشہور تھا، یہاں قیام رہا۔ یہ مکان آرام بخش تھا، میر خورد نے لکھا ہے کہ "سہ پوشش داشت" یعنی سہ منزلہ مکان تھا، درمیانی منزل میں سلطان المشائخ کا قیام تھا، باقی اوپر اور نیچے والے حصہ میں آپ کے وابستگان میں سے کچھ لوگ رہتے تھے، جن میں میر خورد کے والد کا خاندان بھی تھا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد راوت عرض کے لڑکے اضلاع سے آ گئے اور انہوں نے شباشب مکان خالی کرا لیا۔

لکھا ہے کہ ساج بقال کی دکان کے پاس کوئی مسجد تھی اسی مسجد میں کوئی علیحدہ مکان "چھپردار" تھا، غالباً سائبان ہوگا، وہاں رہنا پڑا، وہاں سے اٹھے تو رکابدار کی

لہ واللہ اعلم "یہ زاوت" کا لفظ کیا ہے۔ اعظم گڑھ بہار میں "روتاڑا" شیوخ کا ایک بڑا قبیلہ آباد ہے۔ "یہ تاڑا" کا لفظ اسی "راوت" سے بنایا گیا ہے۔ تاڑ اکو ہندی میں غالباً خاندان اور قبیلہ کو کہتے ہیں۔ ۱۲

سرائے میں کچھ دن قیام رہا، پھر کوئی محمد میوہ فروش کی دکانوں سے متصل کوئی شخص شادی گلابی کا مکان تھا، وہاں رہے، الغرض یونہی آج یہاں ہیں، کل وہاں ہیں، دلی میں قیام کی صورت تھی۔[۱] لیکن بااین ہمہ پراگندہ خاطری، سلطان المشائخ کس مشغلہ میں مصروف تھے، میر خورد نے لکھا ہے۔

"دراں ایام اتفاق ماندن در شہر نہ بود" ان دنوں شہر میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوتا تھا۔

پھر کہاں رہتے تھے، سیر الاولیاء اور فوائد الفواد دونوں ہی میں آپ کا یہی بیان لکھا

"برسر حوض قتلغ خاں بودم" قتلغ خاں کے حوض کے کنارے رہتے تھے،

شہر سے باہر قتلغ خاں کا کوئی تالاب تھا، اسی تالاب کے کنارے زیادہ وقت گذرتا تھا، کس چیز میں گذرتا تھا؟ خود فرماتے ہیں ا۔

"دراں ایام قرآن یاد می کردم" ص۱۰۱ اس زمانہ میں قرآن پاک یاد کرتا تھا۔

یعنی سب کچھ گذر رہا تھا، لیکن شیخ کبیر کی وصیت کی تکمیل کی دھن تھی، جو الہٰ آپ کو دیا گیا تھا، من کل الوجوہ قلب کو اسی سے متعلق کرنے میں "یقین" کے اس نسخہ سے زیادہ قوی نسخہ اور کیا ہو سکتا تھا، اور سچ پوچھیے تو گو اپنی جامعیت کے لحاظ سے قرآن میں وہ سب کچھ ہے جس کی تشریحی شکل کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، بار بار قرآن میں جن چیزوں کو دہرا دہرا کر بیان کیا گیا ہے۔

---

[۱] ان تفصیلات کا تذکرہ میں نے ایک اور مقصد سے بھی کیا ہے، اس زمانہ (یعنی ہندوستانی اسلام کی پہلی صدی) میں دلی اور دلی کی زندگی، طریقۂ بود و باش وغیرہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثلاً: سہ منزلہ مکانات بھی بن گئے تھے، چھپر کی مسجد بھی ہوتی تھی، مسلمان بھی بقالی، میوہ فروشی، گلاب فروشی وغیرہ کے پیشے اس زمانہ میں کرتے تھے، وغیرہ وغیرہ ۱۲۔

رسالت وتوحید کا یقین

ان میں سب سے زیادہ نمایاں یہی دو مقدمات ہیں۔
(۱) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رسالت کے دعوے میں سچے ہیں؛

(۲) اور دوسری بات یہ کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، وہی اِیَّاکَ نَعْبُدُ (ہم تجھی کو پوجتے ہیں) وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (تیری ہی اعانت ہم چاہتے ہیں) وہی معبود وہی ہر حاجت اور ہر ضرورت کا مستعان ہے۔

پہلے مقدمہ پر یقین اور وثوق کی بنیاد قائم ہے اور اس بنیاد پر جس علم کو بنی آدم کے لیے قدرت سب سے زیادہ یقینی قرار دینا چاہتی ہے وہ یہی ہے کہ ہمارا الٰہ ہمارا معبود و مستعان اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ جب ساری ضرورتوں ساری حاجتوں کا واحد مستعان کسی مخلوق کی ذات نہیں بلکہ خالق تعالیٰ جل مجدہٗ ہی کی ذات بے ہمتا ہے تو اس کو چھوڑ کر جو اپنی حاجتوں کے لیے جہاں بھی جاتا ہے قدرت کے قانون سے ٹکرا کر جا رہا ہے، قدرتی قوانین سے ہٹنا اور ٹکرانا اسی کا نام تو ظلم ہے، مقررہ حدود سے تجاوز ہے، یہی مطلب ہے تسبیح یونسی کا۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ	یعنی الٰہ آپ کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا، آپ کی الوہیت میں
سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ	کوئی دوسرا شریک ہو، اس سے آپ کی ذات پاک ہے، تو میں ہی
مِنَ الظّٰلِمِیْنَ	ظالم تھا کہ جو الٰہ تھا اس کو چھوڑ کر ادھر اُدھر بھٹک رہا جو الٰہ نہ تھے۔

اُف جن دلوں کو اپنے حقیقی الٰہ یعنی اپنی حاجتوں ضرورتوں اپنے رجحانات و میلانات سب کا مرجع حق تعالیٰ کی ذات پاک ہی نظر آتی ہے، انکے سارے فطری مطالبات کی تکمیل کا سرچشمہ صرف اسی علیٰ کل شیئٍ قدیر کی قوت بن جاتا ہے، ایسے قلوب میں طلب حق کی جو آگ بھڑکتی ہے، بقول سلطان المشائخ:

بایں آتش جمیع اخلاق رزیلہ وذمیمہ	اس آگ سے تمام برے اور رزیل اخلاق جل جاتے ہیں اور
سوختہ می شود، وصفا پیدا آید وشایان	صفائی پیدا ہوتی اور حق تعالیٰ کی محبت کے لائق
محبت حق گردد" (سیر۔ ص ۲۳۶)	ہو جاتا ہے۔

اسی لیے مشائخ چشت کو آپ جو پاتے ہیں، کہ اخلاق اور اس کے اقسام، ذمائم و فضائل مہلکات و منجیات اور ازیں قبیل تصوف کے دوسرے مسائل پر انہوں نے کتابیں لکھی ہی نہیں۔ یا لکھی ہیں تو مختصراً اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی بات کو طول دینے کی انہوں نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی "اِلٰہ" کے لفظ کو سمجھانا، یعنی جیسا کہ مولانا روم نے سیبویہ کے حوالہ سے الٰہ کے معنی۔

یولھون فی	یعنی "الٰہ" اس کو کہتے ہیں جس کی طرف انتہائی دلہ اور وارفتگی
حوائجھم الیہ	کے ساتھ لوگ اپنی حاجتوں میں رجوع کریں۔

نقل فرمایا ہے، بس اسی کا تحقق، اسی کی یافت کہ حاجتوں میں جس کی طرف گڑگڑا کر بلبلا کر آدمی ٹوٹ پڑے وہ ارحم الراحمین رب ودود، رحیم کے سوا کوئی نہیں ہے، جس نے اس کو پالیا، سب کچھ پالیا، اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ چشتیہ طریقہ کی بنیاد دلہ اور عشق پر مبنی ہے گویا ؏

سو علاجوں میں یہی ایک علاج اچھا ہے۔

امتحان کی گھڑیاں بہرحال دلی میں سلطان المشائخ کی گذر رہی ہے، قرآن ہے، قتلغ خان کا تالاب ہے اور وہ ہیں۔ آئندہ کیا ہوگا "ہندگیری"

۱؎ فوائد الفواد میں ہے کہ سلطان جی کے سامنے کسی نے ذکر کیا کہ اودھ میں ایک صاحب نے مجھے کتاب دکھائی اور کہا کہ حضرت والا کی لکھی ہوئی ہے فرمایا "من ہیچ کتابے نہ نوشتہ ام" عجب شان ہے نہ کتاب ہے نہ خانقاہ لیکن کام کتاب والوں اور خانقاہ والوں سے بھی زیادہ کیا گیا

کی مہم سر کرنے کے اسباب کیا پیدا ہونگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بجز ایک الٰہی تدبیر کے اور کسی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ ذِکْرِ ذٰلک شدید کا یہ زمانہ مہینوں اور دنوں کا تھا۔ سیر الاولیاء سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی سال اسی حال میں گذر گئے اور وہ گذارتے رہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ان دنوں میں ان پہ کیسی کیسی سخت گھڑیاں گذر گئیں۔ میر خورد نے آپ ہی کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے۔

"کہ در عہد غیاثی (غیاث الدین بلبن) کہ	غیاث الدین بلبن کے عہد میں کہ جب دو
دراں وقت در دو جیتلؒ منے خربزہ بود،	چیتل (دمڑی) میں ایک من خربوزہ
لیکن بیشتر از فصل گذشتہ بود کہ من	بکتا تھا مگر فصل کا بڑا حصہ گذر چکا تھا
خربزہ نہ چشیدہ بودم"	اور میں نے خربوزہ چکھا بھی نہ تھا۔

اور خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں سننے کی بات تو آگے کی ہے:۔

"بداں خوش می بودم و آرزو می بردم	اس پر میں خوش تھا اور آرزو تھی کہ
کہ اگر باقی فصل ہم خربزہ خوردہ نہ	بقیہ فصل میں بھی خربوزہ نہ کھایا جائے
شود نیکو باشد" [ص۱۳۱]	تو بہتر ہوگا۔

اور جب "ہر انچہ ساقی، من ریخت" میں کسی کو لطف آجاتا ہے تو پھر اس کا یہی حال ہوتا ہے توحید ادنی کرشمے میں جی موحد لذت گیر

اس سے بھی زیادہ دل دوز جگر خراش وہ واقعہ ہے جو آپ ہی کے حوالہ سے اسی کتاب میں درج ہے کہ:

"فرمود، یک شبانروز گذشتہ بود دو شب	ایک دن رات گذر چکے تھے اور دوسری رات بھی
دیگر آمدہ نصفے ہم گذشتہ کہ چیزے نخوردہ بودم" [ص۱۳۱]	آدھی وقت گذر چکا تھا اور میں نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔

---

[۱] شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے کسی جگہ میں نے جیتل کا ترجمہ دمڑی کیا ہے، اور دمڑی پیسہ کی چوتھائی کو کہتے ہیں۔ ایسی صورت میں اندازہ کرنا چاہیے کہ اس وقت کی چیزوں کا بھاؤ کیا تھا؟

اور یہ ارزانی کے کس زمانہ کی بات ہے خربوزوں کا حال تو سن چکے کہ ۲ جیتل میں ایک من کے حساب سے دلی میں بک رہے تھے، اب جو ایک دن ایک رات اور پھر دوسرے دن کی بھی آدھی رات اس شان سے گذری کہ "چیزے نخوردہ بودم" اس وقت کی ارزانی یہ تھی کہ:

"دراں ایام بہ یک جیتل دو سیر نان سیدہ می دادند" اھ	ان دنوں میں ایک دمڑی میں دو سیر گیہوں کا میدہ بکتا تھا۔

جس کے معنی یہ ہوئے کہ پکی پکائی گیہوں کی دو سیر میدہ کی روٹی ایک دمڑی میں ملتی تھی، لیکن اس ارزانی کے باوجود جو "ابناء" "والضراء" کی کسوٹی پر جو پرکھا رہا تھا، اس کا حال یہ تھا کہ:

"مرا یک دانگ ہم نبودے تا نان ہم بخورم"	مجھے ایک کوڑی بھی میسر نہ تھی کہ میں روٹی کھاتا۔

اور خود یہ کیفیت اکیلے تنہا آپ ہی کی ذات پر نہیں گذر رہی تھی، بلکہ خود فرماتے ہیں۔

"دو الدہ و ہمشیرۂ من و دیگر آدمیان خانہ کہ در مؤنت من بودند ایشاں راہم ہمیں حال بود" ۱۳	والدہ ہمشیرہ اور گھر کے دوسرے آدمیوں کا بھی یہی حال تھا جو مری پرورش میں تھے۔

اور ظاہر ہے جیسا کہ سلطان المشائخ سے ہی سیر الاولیاء میں ان کا یہ قول منقول ہے کہ درویشوں کی ایک قسم یہ بھی ہوتی ہے یعنی۔

"ہر درے معنوی کہ ظاہر خود را بطریق مشغولاں حق می نماید و باطن دربدری"	جو اپنے کو بظاہر حال کو حق میں مشغول ظاہر کرے اور باطن میں دربدر مارا

لہ عہد اسلامی میں ہندوستان نے کن ارزانیوں کا لطف اٹھایا ہے، میرے خیال میں اس سے بہتر شہادت کسی تاریخ میں نہیں مل سکتی ہے۔ شہادت ادا کرنے والے سلطان المشائخ ہیں۔ اور جس کتاب سے شہادت نقل کی گئی اس کے مصنف سلطان المشائخ کے مرید و ہم زمانہ ہیں ۱۲۔

گردو" پھرے۔

قلب کی اس کیفیت کے متعلق جس کا خیال ہو

"نعوذ باللہ کہ کسے را ایں معاملہ باشد" خدا کی پناہ اس سے کہ جس کا ایسا معاملہ ہو،

کیا ایک لمحہ کے لیے کوئی دوسرا خیال قائم کرسکتا ہے، بلکہ جہاں تک واقعات وحالات سے معلوم ہوتا ہے، یہ "عہد زلزالی" عام اوراد و وظائف کے ساتھ ساتھ زیادہ تر شیخ کبیر شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت کی تکمیل ہی میں گذرتا تھا، غالباً یہ اشتغال بالقرآن ہی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ آپ پر یہ حال طاری ہو گیا تھا جس کا ذکر بعد کو فرمایا کرتے تھے کہ

"در مبدء حال باخود جزم کردہ بودم کہ نہ کتابے بنویسانم ونہ بہا (قیمت) بستانم" شروع میں عزم بالجزم تھا کہ نہ کوئی کتاب لکھواؤں گا نہ قیمت سے لوں گا۔ [۱۴۵]

گویا قرآن کے سوا نہ کچھ پڑھنا چاہتے تھے نہ کسی سے کچھ سننا چاہتے تھے۔ شیخ نے یہی کتاب حوالہ کی تھی، اسی کو پی رہے تھے، پیتے جارہے تھے، بالآخر پیغمبر کے اس نسخہ کا تجربہ ان کے سامنے تھا، یعنی حدیث میں جو آیا ہے، حدیث قدسی ہے، ترمذی اور دارمی اس کے راوی ہیں۔

من شغلہ القرآن عن ذکری ومسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین "القرآن" میں مشغول ہونے کی وجہ سے اگر کسی کو ذکر یا دعا کا موقعہ نہ مل سکے، تو میں اس کو دعا کرنے والوں اور مانگنے والوں سے (بے مانگے ہی) بہت زیادہ کرکے دیتا ہوں۔

سلطان المشائخ نے اس حدیث کا ایسا زندہ تجربہ پیش کیا ہے کہ جس کے چرچوں سے سو سال گذر جانے کے بعد بھی ہندوستان کے گلی کوچے معمور ہیں، آج بھی ان کے دسترخوان کا تذکرہ لذت بخش کام و دہن بنا ہوا ہے، اور ایک دسترخوان کیا پھر خدا نے ان کو جس جاہ و جلال کے ساتھ اسی دلی میں رکھا، سب جانتے ہیں کہ سلاطین وقت کو بھی اس پر رشک آتا تھا، جس کی تفصیل کا نہ یہاں موقع ہے اور جس مقصد

میں نے ان کے حالات کے تذکرہ میں ایک خاص قسم کی تفصیل سے کام لیا ہے، اس مقصد کے رو سے نہ اس کی ضرورت ہے۔

بہر حال یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ حفظ بالقرآن کی وصیت کی تکمیل کا موقعہ آپ کو کتنے دنوں میں میسر آیا، تاہم اس کے تو بیسیوں قرائن ہیں کہ آپ نے کامل قرآن اسی عمر میں زبانی یاد کر لیا، فوائد الفواد میں بچپن کے استاد جن کی فیض بخشی مشہور تھی، ان کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ:

بہ برکت آں قرآن یاد شد" ص ۱۵۴ | اسی کی برکت سے قرآن پاک یاد ہو گیا۔

اگرچہ اس کے بعد آپ کا وہ ارادہ کہ نہ کوئی کتاب لکھواؤں گا اور نہ خرید وں گا باقی نہ رہا، اور نہ اس کو رہنا چاہیے تھا کہ وہ بہر حال ایک کیفیت تھی، جو آتی ہے اور گذر جاتی ہے،

سلطان المشائخ کا ادبی ذوق

سلطان المشائخ کا ادبی مذاق فارسی زبان کا طبعی تھا۔ اس لیے علاوہ دینی کتابوں کے کبھی کبھی ادبی کتابیں بھی دوسرے سے سنا کرتے تھے، اور امیر خسرو کی شاعری کے پیچھے تو سچ پوچھیے سلطان المشائخ ہی کی شعریت چھپی ہوئی ہے جس کا ظہور ان کے "ترک اللہ"[1] کے ذریعہ سے ہوا، امیر خورد نے لکھا ہے۔

"امیر خسرو در ایام آغاز شعر گفتن	امیر خسرو شعر گوئی کے ابتدائی زمانے میں جو
بود ہر نظمے کہ گفتے بخدمت سلطان المشائخ	کچھ کہتے سلطان المشائخ کی خدمت میں
گذرانیدے تا روزے حضرت سلطان	پیش کرتے یہاں تک کہ ایک روز حضرت نے
المشائخ فرمود بطرز صفاہانیاں بگوی"	فرمایا کہ صفاہانیوں کے طرز پر شعر کہو۔

[1] امیر خسرو کا یہ مشہور خطاب ہے جو اپنے پیر سے ان کو ملا تھا ۱۲۔

کہتے ہیں کہ اسی زمانہ میں امیر نے ایسی شاعری شروع کی جس میں حقیقت کا اظہار مجاز کے پردہ میں کیا گیا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ امیر خسرو نے :

دیوان مبتدا و منتہٰی بما بر قاضی عزالدین پا نچہ پدر مولانا فصیح الدین پا نچہ بخدمت سلطان المشائخ بتمام گذرانید و رموز اشارات آں را تحقیق کرد ص ۳۰۱

واقعہ یہ ہے کہ سلطان جی سے اگر ہندوستان کو اور کچھ نہ ملتا، صرف امیر خسرو ہی ملتے تو اس ملک کی سپاس گذاری اور منت شناسی کے لیے یہی کافی تھا۔ لیکن باوجود ان مشاغل کے بھی قرآن سے جو آپ کا تعلق تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ آپ جب کبھی حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر کے متعلق اس مشہور قصہ کا ذکر فرماتے کہ اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کو جن سے بے تعلق ہو چکے تھے ایک دفعہ اٹھا کر چاہا کہ مطالعہ کریں، غیب سے آواز آئی :

ابوسعید عہد نامہ باز دہ"	ابوسعید عہد نامہ واپس کرو۔

حضرت سلطان المشائخ اس قصہ کا ذکر فرماتے۔ علا سنجری راوی ہیں کہ :

چوں بریں حرف رسید بگریستند ایں	جب اس حرف پر پہونچے رو پڑے
دلو مصرعہ بر زبان مبارک راندے	اور یہ مصرعے زبان پر جاری ہو گئے۔
تو سایہ دشمنی کجا در گنجی	جائے کہ خیال دوست زحمت باشد (فوائد ص ۹۱)

قرآنی ذوق کا یہ حال تھا، کسی طرف سے ذرا خوش آوازی کے ساتھ قرآن پڑھنے کی آواز آئی رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے بقول امیر خسرو :-

"از شنیدن آں حالے وذوقے وشوقے پیدا شد" ص ۲۷۶	اس کے سننے سے ایک حال، ایک ذوق اور شوق ظاہر ہوتا تھا۔

اسی طرح آپ کے دست گرفتوں میں جن لوگوں کی موزوں طبیعتیں تھیں، آپ شعر گوئی سے ان کو منع تو نہیں فرماتے بلکہ آپ دیکھ چکے کہ امیر خسرو کی شاعری کو تو آپ ہی نے راہ پر لگا دیا۔ خود ان کے دواوین کو سنا اصلاح اور مشورے دیے،

لیکن اسی کے ساتھ اس کی کوشش فرماتے تھے کہ شاعری کا ذوق قرآنی ذوق پر جو طریقہ چشت کی خصوصیت خاصہ ہے، اس پر غالب نہ آئے حسن علا سنجری نے فوائد الفواد میں لکھا ہے کہ:

بندہ عرضداشت کرد کہ بارہا از لفظ	بندہ نے عرض کیا کہ بارہا مخدوم سے
مبارک مخدوم شنیدہ ام می باید کہ	سنا ہے کہ شعرگوئی پر قرآن خوانی کو
قرآن خواندن بر شعر گفتن غالب آید من[۲۹]	غالب رہنا چاہیے۔

میرا اپنی حالت عرض کی میری غرض تو یہ تھی کہ ادبی حوصلہ افزائیوں کے ساتھ ساتھ قرآن کے ساتھ جو خصوصی تعلق اپنے وابستوں کا حضرت رکھنا چاہتے تھے: اس کا ثبوت پیش کروں اور یہ بات "بارہا" کے لفظ سے ظاہر ہے۔

اسی "بارہا" اصرار ہی کا نتیجہ وہ تھا کہ حضرت امیر خسرو جیسا اکثر شاعر جن کی کتابوں کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ سو تک پہنچ گئی ہیں روزانہ تہجد میں سات پارے اس طریقے سے پڑھتے تھے جس سے ان پر تلاوت کے آثار طاری ہوتے تھے ایک غلطی جو غالباً صدیوں سے چلی آتی ہے اس کے ازالہ کے لیے کیا کروں مجبوراً مجھے طوالت سے کام لینا پڑ رہا ہے، ورنہ لوگوں کا مطالعہ اگر صحیح ہوتا اور حضرت نظام سلطان المشائخ ہی کے گرد و پیش کے واقعات، ان کی خانقاہ جو جماعت خانہ کے نام سے موسوم تھی، اگر اسی کا حال غور سے پڑھتے تو ان پر کھل سکتا تھا کہ اس کا سارا ماحول تلاوت قرآن سے بھرا ہوا تھا، بلکہ کوئی چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ ان کا جماعت خانہ دراصل ایک قسم کا مدرستہ الحفاظ تھا۔

سلطان المشائخ کا حال دل

واقعہ یہ ہے جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ سلطان المشائخ نے آخر وقت تک تجرد کی زندگی گذاری از رکن مصلحے نے ان کو اس مسلک کے اختیار کرنے پر آمادہ کیا تھا جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے

نزدیک تاہل سے افضل ہے، ظاہر ہے کہ میری بحث سے یہ اس وقت خارج ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بظاہر وہ تاہل کے جھنجھٹوں سے آزاد تھے لیکن جس کے دل کا حال یہ ہو جیسا کہ حضرت کے خادم خواجہ عبدالرحیم سحری کھلانے والے صاحب کا بیان ہے کہ باوجود عموماً روزہ رکھنے کے سحری برائے نام ہی آپ کے پاس آتی تھی، خواجہ عبدالرحیم کہتے ہیں کہ:

عرضداشت می کردم کہ مخدوم وقت افطار ہم طعام کمتر می خورد، اگر طعام سحر ہم اندکے تناول کند حال چہ شود وضعف قوت گیرد۔	میں نے عرض کیا کہ مخدوم افطار کے وقت تھوڑا کھاتے ہیں۔ اگر سحری بھی تھوڑی تناول فرمائیں گے کیا حال ہوگا ضعف بڑھ جائے گا۔

خواجہ عبدالرحیم کہتے ہیں کہ میری اس عرضداشت پر۔

دریں محل بگریستے وگفتے چندیں سکینان ودرویشاں در کنجہائے ساجد ودکانہا گرسنہ وفاقہ زدہ افتادہ اند ایں طعام در حلق من چگونہ فرو رود (سیرالاولیاء ۱۲)	شیخ رو پڑے اور فرمایا بہت سے مسکین اور درویش مساجد کے کونوں اور دکانوں میں بھوکے پڑے ہوئے ہیں یہ کھانا میرے حلق میں کیسے اترے۔

لہ عجیب بات ہے کہ دن کے روزے اور رات کے کھانے کا یہ حال افطار میں سبزی یا تلخ کریلے کے ساتھ روٹی آدھ روٹی پر کفایت لیکن باوجود اس کے عام طور پر لوگوں کا بیان ہے کہ۔

چوں روز شدے ہر کہ نظر بر جمال مبارک سلطان المشائخ افتادے تصور کردے کہ مستی لازم است وچشمہائے مبارک سرخ بودے از بیداری شب (سیرالاولیاء ص ۱۲۸)

کہتے ہیں کہ حضرت امیر خسرو کا مشہور شعر

تو شبانہ می نمائی بہ برے کہ بودی امشب	کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

اسی لاہوتی کیفیت کی تصویر ہے ۱۲۔

روتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے، خواجہ عبدالرحیم بیچارے سحری جیسی کی ویسی اٹھالیتے اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس کے سینہ میں ایسا دل رکھا گیا ہو، وہ اصطلاحی نااہل کے خرخشوں سے اگر آزاد بھی رہا تو کیا واقعی آسے آزادی میسر آسکتی ہے۔

سلطان المشائخ کا دسترخوان

خدا ہی جانتا ہے کہ دلی میں پچاس ساٹھ سال تک جس کا دسترخوان الوانِ نعمت ہزارہا ہزار انسانوں کو تقسیم کرتا رہا، اس تقسیم سے اس کی کیا نیت تھی، یقیناً اس زمانہ کے غربا تک سلطان المشائخ کے ذریعہ سے وہ نعمتیں پہنچائی گئیں جن کا وہ بیچارے تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، اور کیا معلوم کہ اللہ والوں کے کام کے پیچھے کس قسم کی نیتیں پوشیدہ رہتی ہیں، خیر یہ تو ایک طویل قصہ اور مستقل بحث ہے،

یتیم اور مسکین بچوں کی پرورش

مجھے اس وقت یہ عرض کرنا ہے کہ باوجود غیر متاہل ہونے کے علاوہ ان عام لوگوں کے جو روزانہ بعد مغرب سلطان المشائخ کے دسترخوان پر بیٹھتے تھے، جن کی تعداد کبھی کبھی سینکڑوں سے متجاوز ہو جاتی تھی، ان عام لوگوں کے سوا آپ کی خصوصی تربیت اور نگرانی میں مختلف خاندانوں کے بچے پرورش پاتے تھے، آپ ہی ان کے قیام و طعام و لباس و تعلیم اور دیگر ضروریات کے متکفل تھے، ان بچوں میں حضرت شیخ کبیر شکر گنج کے نواسے خواجہ محمدؒ، خواجہ موسیٰ، خواجہ عزیز الدین، شیخ کمال الدین وغیرہ تھے، جن کے والدین کا انتقال کم عمری ہی میں ہو گیا تھا اور سلطان المشائخ نے سب کو دلی بلا کر اپنے زیرِ پرورش فرما لیا تھا۔ یوں ہی آپ کے بھانجوں یعنی بہن کے بچوں کا ایک گروہ تھا جن میں خواجہ رفیع الدین ہارون خواجہ تقی الدینؒ خواجہ ابوبکر مصلی دار، مولانا قاسم، خواجہ عزیز الدین بن خواجہ ابوبکر مصلی دار اور ان کے سوا بھی بعض دوسرے شریف خاندان کے بچے تھے جن کا اقامت خانہ سلطان المشائخ کا جماعت خانہ تھا۔

میں نے جیسا کہ عرض کیا، ان سب کی تعلیم و تربیت بھی حضرت والا کی خاص

نگرانی میں ہوتی تھی، آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا، اور اس سے حضرت سلطان المشائخ کے قرآنی ذوق اور شغف کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ہر بچے کو التزاماً سلطان المشائخ نے قرآن مجید حفظ کرایا، خصوصیت کے ساتھ حفظ کے اس کام کو آپ نے مولانا علاء الدین اندپتی کے سپرد کیا تھا، میر خورد نے لکھا ہے۔

مولانا علاء الدین اندپتی کہ در غایت بزرگی بود و علوم بسیار و فضائل بے شمار داشت،	مولانا علاء الدین اندپتی جو بڑے بزرگ تھے اور بہت زیادہ علم و فضل کے مالک تھے۔
و حافظ کلام ربانی اقربائے سلطان المشائخ بیشترے ازاں بزرگ حافظ شدند	اور کلام ربانی کے حافظ سلطان المشائخ کے بیشتر اقربا نے ان سے حفظ ...... کیا تھا (سیر الاولیا ص ۳۱۶)

سلطان المشائخ کے چھوٹے بھانجے[1] تقی الدین نوح جب کبھی حضرت والا کی مجلس میں آجاتے تو لوگوں سے فرماتے :۔

---

[1] ان کے بڑے بھائی کا نام رفیع الدین ہارون تھا، میر خورد نے لکھا ہے کہ "بواسطہ شفقت سلطان المشائخ حافظ کلام ربانی گشتہ" ان کی ایک خاص خصوصیت میر خورد نے یہ بتائی ہے کہ "در تیر دکمان و سباحت اشناوری و کشتی ہوسے تمام داشت" لکھا ہے کہ ان کے اس رجحان کو پاکر سلطان المشائخ ان کو اس قسم کے ملاعب سے روکتے رہتے جیسا کہ کچھ دن پہلے مسلمانوں میں دستور ہوگیا تھا لیکن یہ دستور عہد موت کا تھا، زندگی کے دنوں میں سلطان المشائخ جیسی ہستی بجائے روکنے اور زجر و توبیخ کے ؛

"ازعاں ایں ہنرہائے پسندیدہ کہ شرعاً مشروع ست بہ پرسیدے بلکہ بخواصش ایں ہنرہا تلقین فرمودے"

سیر الاولیاء ص ۲۰۳ ۔ باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے

"یاماں ایں را عزیز دارید کہ ایں نیکو کسے ست" — احباب ان کو عزیز رکھتے تھے کہ اچھے آدمی تھے۔

مگر ان کی "نیک کسی" کی دلیل میں جو بات ارشاد فرمائی جاتی تھی وہ یہ تھی:

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں بزرگوں میں اس قسم کی خود ساختہ سختیاں جن کے پچھلے دنوں مسلمان تربیت کے مسئلہ میں عادی ہو گئے تھے بہت کم تھیں، میر خورد ہی نے لکھا ہے کہ ان کے چچا سید حسین کی جوانی کا زمانہ تھا اس خاص وضع میں جیسا کہ وہ لکھتے ہیں "درا وان جوانی دریں کامرانی موپاک (رومال) کشیدہ در سر بستہ و دستارچہ نازنین بر کتف مبارک انداختہ بطریق جمانان خراماں اندر آمد" لیکن نوجوانی کی اس ترنگ کو دیکھ کر جو عمر کا اقتضاء ہے، کیا سلطان المشائخ نے ان کو سامنے سے نکلوا دیا۔ لکھا ہے کہ:

"دریں حال سلطان المشائخ فرمود کہ سید بیا و بہ نشیں و سعادتے بہ بر"

پھر حسب دستور جس قسم کی باتیں فرمایا کرتے تھے ان سے اور خواجہ آغا دہلوی سے جو اس وقت سامنے بیٹھے تھے، کرتے رہے، میری غرض اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ بزرگوں نے نوجوانوں کو نوجوانی کے حقوق عطا کرنے میں بشرطیکہ حدود شرع سے تجاوز نہ ہو، عموماً سامحت برتی ہے، اصلاح کا یہی طریقہ مفید تھا، یہی صاحب سید حسین کا ایک زمانہ فیشن کا وہ تھا کہ صرف پان خوری کی حالت یہ تھی۔ "یک ساعت از تنبول دہن خالی نہ بودے یعنی متواتر تنبول خوردے اگرچہ یک برگ بدہ تنگ رسیدے" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنبول خوری کی عادت مسلمانوں کو ہندوستان پہنچ کر ابتدائی صدیوں میں پڑ گئی تھی، سی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج بھی پان کھاتے تھے (ص ۱۹۴) سلطان جی بھی عادی تھے (ص ۱۲۴) بلکہ آپ کے پان کا نام ہی ابوالیاس رکھ دیا تھا، فرماتے تھے کہ پان کھانے کے بعد پھر کسی چیز کے کھانے کی امید باقی نہیں رہتی، نمک کا نام آپ کے دسترخوان پر ابوالفتح تھا، دستور تھا کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے لوگ نمک دانوں سے ایک انگلی نمک پہلے مزہ در چکھ لیتے تھے تب کھانا شروع ہوتا تھا۔

"ایں قرآن یاد دارد، و ہر شب آدینہ (جمعہ) ختم می کند" (سیر الاولیاء، ۲۰۲) (فوائد الفواد) — یہ قرآن پاک یاد رکھتے ہیں اور ہر شب جمعہ ختم کرتے ہیں۔

کھانا شروع کرنے سے پہلے تلاوت

سلطان المشائخ کے قرآنی ذوق کی یہ حالت تھی کہ آپ کے دستر خوان کا یہ دستور تھا کہ قبل کھانا شروع کرنے کے قرآن مجید کی کچھ آیتیں خوش الحانی سے کوئی قاری سناتا، عموماً یہ خدمت شیخ کبیر شکر گنج کے نواسوں حافظ محمد و حافظ موسیٰ کے سپرد تھیں، یہی دونوں بھائی نماز میں بھی عموماً امامت کرتے تھے، آواز میں بلا کا درد تھا، لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے جب قرآن پڑھا جاتا تو مسلسل سلطان المشائخ کی زبان مبارک سے "رحمت باد، رحمت باد" (ص ۱۹۹) کے الفاظ بے اختیار نکلتے رہتے، آپ نے ان وابستگان دامن کے اندر قرآن کا وہ راسخ مذاق پیدا فرمادیا تھا کہ میر خورد کا بیان ہے کہ ان کے پھوپی زاد بھائی خواجہ عزیز الدین جن کی تعلیم و تربیت بھی سلطان المشائخ نے فرمائی تھی، اور دستر خوان کی قرأۃ جس کا نام ہی "دعاء مائدہ" تھا کبھی کبھی یہ بھی فرمایا کرتے جیسا کہ قاعدہ تھا کہ سلطان المشائخ کی زیر نگرانی تعلیم پانے والے بچوں کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا، اُن کو بھی قرآن حفظ تھا میر خورد کی شہادت ہے کہ جب مرض الموت میں خواجہ عزیز الدین بیمار ہوئے تو۔

"دو سہ روز کہ زحمت (بیماری) بود یک ساعت لب مبارک از تلاوت کلام اللہ بے کار نماندہ ہمدرین زحمت برحمت پیوست" ص ۱۹۹ — دو تین دن بیمار رہے لیکن ایک لمحہ بھی لب مبارک تلاوت کلام اللہ سے بند نہ رہتا اسی بیماری میں بھی رحمت آشنا رہتا۔

حفظ قرآن کا اہتمام

واقعہ تو یہ ہے کہ سلطان المشائخ کو قرآن کے ساتھ جو غیر معمولی شغف پیدا ہو گیا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو اپنے ہر ایک مرید پر حفظ قرآن کے مسئلہ کو لازمی قرار دے دیتے،

لیکن ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لیے یہ کام آسان نہ تھا تاہم آپ کی کوشش یہی تھی کہ جس سے جتنا ممکن ہو، سلوک بالقرآن کے لیے قرآن زبانی یاد کرلے، خیال تو کیجیے حسن علاء سنجری جو علاوہ شاعر ہونے کے ایک بڑے فوجی افسر تھے، اور اسی فوجی سلسلہ میں ان کو دیوگیر (دولت آباد) آنا پڑا جہاں ان کا اب مزار ہے، عمر ان کی کافی ہو چکی تھی، جب شرف بیعت سے سرفراز ہوئے، شاعری کا جنون الگ سر پر مسلط تھا لیکن آپ پڑھ چکے ہیں کہ حسن علاء کو حکم تھا کہ شعری ذوق کو کم کرکے قرآنی مذاق کو اپنے اوپر غالب کریں، جب یہ مذاق ان کا غالب ہوگیا: تو پھر ان ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اس معمر سن رسیدہ مرید کو بھی آپ نے حفظ قرآن میں لگا دیا تھا، آپ ان سے دریافت فرماتے رہتے کہ "چہ قدر یاد کنی؟" حسن کہتے ہیں کہ اس وقت تک ایک ثلث قرآن یاد کر چکا تھا۔ "ثلثی یاد گرفتہ ام" ارشاد ہوا

"دیگر ہا اندک اندک یاد گیرو یاد گرفتہ پیشینہ — دوسرے حصہ کو بھی تھوڑا تھوڑا یاد کرو
را مکرری کن" فوائد الفواد ص ۹۳۔ — اور دور کرتے رہو۔

اور اس سے اس طریق کا بھی پتہ چلتا ہے جو حضرت والا نے سن رسیدہ ہونے کے بعد قرآن کو یاد کیا تھا۔ یہی واقعہ بھی ہے کہ اگر ایک ایک دو دو آیتیں بھی روزانہ آدمی یاد کر لیا کرے اور آن ہی کے معانی کو اپنے اندر چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، گھلاتا رہے تو حق تعالی کے اس علم مقدس سے بتدریج سینہ میں جو روشنی پیدا ہوتی ہے، شاید کسی ذریعہ سے ممکن نہیں، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ آدمی کا دماغ بھی سلجھنے لگتا ہے، قرآن کی جو خاص منطق ہے: ذہن کو اس سے مناسبت ہونے لگتی ہے۔ ہر بات میں جو واقعہ ہے توازن کو قائم کرتے ہوئے آدمی اس میں غور کرنے کا عادی ہو جاتا ہے، البتہ وہی بات جس کا صحیح حدیثوں میں بھی ذکر آیا ہے کہ محفوظ حصہ کی اگر نگرانی نہ کی جائے تو وہ فوراً نکل بھی جاتا ہے۔ اس لیے "یاد گرفتہ پیشینہ" کو مسلسل مکرر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے حساب کیا ہے کہ اگر "اندک اندک یاد گرفتن" کے اصول کے تحت

کوئی روزانہ ایک آیت بھی یاد کر لیا کرے تو سات سال میں پورا قرآن اس کو محفوظ ہو جائے گا۔ بہر حال کچھ میر حسن ہی کے ساتھ یہ خصوصیت نہ تھی، حضرت والا کے دست گرفتوں میں ایک بڑی جماعت حفاظ کی نظر آتی ہے، بعضوں کا تو عمر بھر یہی پیشہ رہا کہ وہ قرآن لکھ کر زندگی گذارتے رہے، مولانا فخرالدین مروزی کے ذکر میں پہلے بھی اس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔

امیر خسرو کا تہجد میں معمول

خود امیر خسرو جو تہجد کی نماز میں روزانہ سات پارے پڑھتے تھے ظاہر ہے کہ حفظ کے بغیر یہ ممکن نہ تھا لیکن مجھے اب تک ان کے کامل حافظ ہونے کی سند نہیں ملی ہے، بعض قرائن سے جن کی تفصیل کا موقعہ نہیں ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بلوغ کے بعد ہی اپنے محبوب شیخ کی اتباع میں قرآن یاد کیا تھا، ان کا تو عہدہ ہی شاہی دربار میں مصحف برداری کا تھا، گویا قرآن ہی میں معاش اور معاد دونوں کی فلاح حق تعالیٰ نے ان کی بلند قسمت کے لیے مقدر فرمائی تھی۔ امیر خسرو تہجد کی نماز میں سات سات پارے پڑھتے تھے، اسی سے خیال گذرتا ہے کہ سلطان المشائخ کے متعلق جو بیان کیا جاتا ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں۔

چہار صد و پانصد رکعت نمازی گذاردی ؎ چار پانچ سو رکعتیں ادا کرتے تھے

گو صراحۃً اس کا ثبوت تو ابھی دستیاب نہیں ہوا ہے، لیکن خیال گذرتا ہے کہ جس قرآن کو سلطان جی نے یاد کیا تھا، اسی کو

"یاد گرفتہ پیشینہ را مکرر کن" پہلے یاد کئے ہوئے کو دوبارہ پڑھتے رہو۔

کے اصول کے تحت تھوڑا تھوڑا کر کے ان سیکڑوں نفلوں میں روزانہ پڑھ لیا کرتے ہوں گے، اس سے نمازوں کے ساتھ ساتھ قرآن کی تازگی کا موقعہ بھی آپ کو مل جاتا ہوگا، واللہ اعلم بالصواب۔

حفاظ قرآن کی کثرت

بہر حال اب کوئی مانے یا نہ مانے لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے

سلطان المشائخ کے عہد میں دلی قرآن ہی قرآن سے بھر گیا تھا، بڑے بڑے شاہی عہدہ دار مقربان بارگاہ حکومت ہمیں اس زمانہ میں حافظ نظر آتے ہیں، امیر خسرو، حسن علاء سنجری آخر یہ کون لوگ ہیں؟ انتہا یہ ہے کہ اس زمانہ میں دلی کے کوتوال (کمشنر پولیس) بھی حافظ تھے، میر خورد نے لکھا ہے:۔

"مولانا ظہیر الدین کوتوال شدہ کہ حافظ کلام ربانی" (ص ۱۷)	مولانا ظہیر الدین کوتوال شدہ حافظ قرآن ہے۔

اس عہد کے شاہی ولاۃ وحکام چونکہ زیادہ تر حضرت سلطان المشائخ ہی سے ارادت وبیعت کا تعلق رکھتے تھے، تو کیا تعجب ہے اگر طریقہ چشتیہ کا قرآنی مذاق ان حکام وارباب مناصب امراء تک بھی متعدی ہو گیا ہو۔

حضرت چراغ دہلوی

اور یہ ذکر تو ان لوگوں کا تھا جو سلطان المشائخ کے عہد میں تھے، حضرت کے بعد یوں تو آپ کا سلسلہ بیسیوں وسائط اور ذرائع سے پھیلا لیکن آپ کے خلیفہ اعظم سب جانتے ہیں کہ حضرت مولانا نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے ان کے متعلق تو پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں کہ کتاب اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی چیز کے آگے سر جھکانے کے لیے وہ تیار نہیں تھے خود سلطان المشائخ کے زمانہ ہی میں لوگوں نے ان پر بھی الزام لگایا مشہور بات ہے کہ کسی مجلس میں مزامیر کے ساتھ سماع شروع ہوا، چراغ دہلوی اٹھ کھڑے ہوئے، لوگوں نے بیٹھنے پر اصرار کیا، فرمایا "خلافِ سنت است" لوگوں نے یہ خیال کرکے کہ مطلق سماع سے آپ کو انکار ہے، یہ اعتراض کیا کہ

"پیر برگشتی، آپ نے سماع کا انکار فرمایا اور پیر کے مشرب سے برگشتہ ہوئے اخبار الاخیار میں شیخ محدث نے نقل کیا ہے کہ اس وقت حضرت نے فرمایا کہ

"دلیل از کتاب وحدیث می باید (ص ۸۲)	دلیل کتاب وسنت سے ہونی چاہیے

لوگوں نے یہ خبر سلطان المشائخ تک شکایۃً پہنچائی لیکن اپنا سا منہ لے کر رہ گئے، جب وہاں سے بھی جواب ملا کہ:

راست می گوید "   درست فرماتے ہیں۔

بہرحال چراغ دہلوی کی زندگی تو اتنی عالمانہ تھی کہ ان پر لوگوں کو خشک ملّا ہونے کا شبہ اس وقت بھی تھا، اور شاید اب بھی ہو، لیکن آپ کے خلیفہ اعظم حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ صاحب گلبرگہ نے تو صاف لفظوں میں اس مسلک کی تصریح فرمائی ہے، جو طریقہ چشت کی خصوصیت ہے، مولانا آزادؒ نے اپنی کتاب

لہ مولانا غلام علی آزاد جن کی زندگی کا ایک بڑا حصہ دکن ہی میں گذرا ہے حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق دکن کے عوام جن میں ہندو اور مسلمانوں کی خصوصیت نہیں ہے ان کی عقیدتمندیوں کا ذکر کرتے ہوئے دو عجیب باتیں نقل کی ہیں، ایک تو یہ ہے کہ "شخصے بہ یکے از اہل دکن پرسید کہ رسول اللہ بزرگ تر است یا سید محمد گیسو دراز جواب داد کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پیغمبر خدا است اما سبحان اللہ مخدوم سید محمد گیسو دراز چیزے دیگر ست ص ۲۲۔ دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ گلبرگہ کے نواح میں کوئی تالاب ہے از حضرت سید نقل می کنند کہ فرمود کسے کہ درین تالاب غسل کند سعید می شود یعنی نیک بخت واز گناہاں پاک می گردد" بہرحال روایت جیسی کچھ ہو، لطیفہ میر صاحب نے یہ درج کیا ہے کہ سعید کے لفظ کو بگاڑ کر عوام سادہ لوح گویند کہ حضرت سید فرمود کسے کہ دریں تالاب غسل می کند سید می شود و بہ نیت تحصیل سیادت غسلہا بجا می آرند ص ۲۴۔ اب بھی لوگوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے یا نہیں، مجھے معلوم نہیں۔ دکن میں عموماً ایک عجیب بات یہ پائی جاتی ہے کہ مسلمانوں کا ادنیٰ ترین طبقہ جس کا کام عموماً خدمتگاری کرنا جھلکے ہنکانا ہے ان کی اکثریت سے جب پوچھیے تو اپنے نام کے ساتھ سید کے لفظ کا اضافہ کرتے ہیں، حالانکہ اعلیٰ طبقوں میں بہت زیادہ احتیاط پائی جاتی ہے۔ مشکل ہی سے ان میں کوئی اپنے کو سید کہتا ہو۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس طبقہ کی سیادت غالباً اسی تالاب کی کرامت کا نتیجہ ہے میر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے جس علاء سنجری جو خلد آباد میں مدفون ہیں لوگ حسن شیر کہتے ہیں حالانکہ صحیح تلفظ اس کا حسن سنجری ہوگا ۱۲۔

روضۃ الاولیاء میں حضرت والا کا یہ فقرہ نقل کیا ہے:

فتح کار من بیش تر از تلاوت قرآن و سماع بود (روضہ ص ۲۴)	مرے کام کی ابتدا عموماً تلاوت یا سماعت قرآن سے ہوئی ہے۔

یہ بھی اسی کتاب میں آپ ہی کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت سیدؒ کا معمول تھا کہ:

وقت چاشت و بعد از نماز ظہر درس می گفت و بیش تر درس در علم تفسیر و حدیث سلوک می گفت و گاہے علم کلام" (ص ۲۴)	چاشت کا وقت اور بعد نماز ظہر درس دیتے تھے اور عموماً علم تفسیر و حدیث اور تصوف کا دیا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی علم کلام کا،

قرآن سے آپ کا کتنا گہرا تعلق تھا اس اعتراف کے علاوہ کہ ان کا فتح کار ہی قرآن کی تلاوت سے اور ان اشعار سے ہوا جن کے متعلق جیسا کہ آئندہ ان شاء اللہ معلوم ہو گا کہ فی الحقیقت نظم کی صورت میں قرآنی آیات کے وہ ترجمے ہیں، ان ہی ترجموں کو نغمہ کے ساتھ سننا یہی ان بزرگوں کا سماع تھا۔ اسی لیے میں "قرآن و سماع" کی ترکیب میں معطوف کو معطوف علیہ سے کوئی الگ چیز نہیں قرار دیتا، اور اس پر تھوڑی بہت بحث بقدر ضرورت آئندہ بھی شاید آئے۔

حضرت گیسو دراز

بہرحال اس اعتراف کے سوا، حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز نے ایک ہی نہیں بلکہ قرآن مجید کی دو دو تفسیریں لکھ کر اپنے اس خاندانی مذاق کا ثبوت پیش کیا ہے جو اکابر چشت سے منتقل ہو کر ان میں پیدا ہوا تھا۔ مولانا آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"تصانیف حضرت سید ملتقط تفسیر قرآن بطور سلوک و تفسیرے دیگر بطریق کشاف بن جز و" (ص ۲۴) یعنی حضرت سید کی تصانیف قرآن کی تفسیر سلوک کے انداز میں اور پانچ جز تفسیر کشاف کے طرز پر تھی۔

مولانا زین الدین شیرازی

دکن تک میں جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، سلطان المشائخ کے متوسلین و خلفاء میں ایک حضرت برہان الدین غریب قدس

سرہ صاحب خلد آباد ہیں، ان کے براہ راست خلیفہ اور جانشین مولانا زین الدین شیرازی کے متعلق مولانا غلام علی نے جس قرآنی ذوق کی روئداد لکھی ہے، وہ عجیب وغریب ہے، لکھا ہے کہ محمد تغلق نے دلی اجاڑ کر دکن میں دولت آباد کو بسایا، لیکن جب دولت آباد میں اسماعیل مخ نے بغاوت کی اور سلطان اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے خود دولت آباد آیا، اپنے ساتھ دولت آباد سے لوگوں کو پھر دلی لے گیا تو ان میں مولانا زین الدین بھی تھے۔ دلی میں آپ کو چھوڑ کر خود سندھ چلا گیا، اس زمانہ میں مولانا زین الدین کا مشغلہ دلی میں یہ تھا جیسا کہ ان ہی کا بیان ہے۔

"دو ماہ شد کہ ہر روز یک ختم کلام اللہ بروضۂ پرفتوح سلطان المشائخ می کنم" — دو ماہ ہوئے کہ روزانہ ایک قرآن ختم کا میں نے (حضرت) سلطان المشائخ کی روح کو ثواب بخشا۔

اس واقعہ کے بعد ہی بادشاہ جو سندھ (ٹھٹھہ) میں تھا، خدا جانے کیا احساس اس کو ہوا اس نے مولانا زین الدین کے متعلق فرمان بھیجا کہ وہ جہاں رہنا چاہیں رہ سکتے ہیں، لیکن ابھی وہ دلی سے روانہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بادشاہ کے مرنے کی

لہ اب کوئی اسے مانے یا نہ مانے لیکن سلطان المشائخ کی روح کو مولانا زین الدین کی اس قرآن خوانی سے کتنا سکون حاصل ہوا تھا، اس کے متعلق مولانا آزاد ہی کی کتاب میں شیخ زین الدین شیرازی کے حوالہ سے یہ بیان درج ہے کہ جن دنوں میں اس طرح قرآن خوانی میں ان کے روضہ پر مصروف تھا۔ ایک گوشہ سے یہ شعر میں نے سنا۔

بیاسائے زحسن خود کہ جانم از تو آسودست — تو حسن من برافزودی خدا حسنت بیفزاید

یعنی تم اپنے حسن کے ساتھ آسودہ رہو کہ میری روح کو تم سے آسودگی حاصل ہوئی ہے، تم نے میرے حسن کو بڑھایا خدا تمہارے حسن کو بڑھائے مولانا زین الدین کے الفاظ یہ ہیں۔ "این بیت از مرقد مطہر سلطان المشائخ استماع نمودم" ص ۲۷۶

خبر سندھ سے آئی اور اسی کے ساتھ فیروز تغلق بھی دلی پہنچ گیا۔ اس نے مولانا پر اصرار کیا کہ دلی ہی میں قیام کریں، لیکن وہ راضی نہ ہوئے اور فرمایا۔

"مرا بگذار بر آستانہ ... خواجہ خود یعنی بربان بمیرم"	مجھے چھوڑ دیں کہ اپنے خواجہ کے آستانہ برہان پور جا کر مروں۔

فیروز نے زیادہ اصرار مناسب نہ خیال کیا، اور سامان زادِ راہ نیز بہت کچھ دے دلا کر اس نے دلی سے رخصت کر دیا، لیکن آپ کو خیال ہوا کہ دکن جانے سے پہلے اپنے دادا پیر بابا فرید شکر گنج کی قبر شریف پر فاتحہ پڑھ آؤں، اس لیے اجودھن روانہ ہو گئے۔ اجودھن میں ان کا قیام جس شان سے رہا ہے، اسی کا تذکرہ مقصود ہے مولانا غلام علی آزاد کے الفاظ یہ ہیں :۔

"در گنبد شیخ فرید الدین در بستہ مشغول ماند غیر از اوقات نماز بر نمی آمد و شبانہ روز چہار قرآن ختم می کرد و در عرصہ سہ روز مجموع دوازدہ قرآن ختم کرد"	شیخ فرید الدین روضہ میں بند مشغول رہتے نماز کے سوا کسی وقت نہیں نکلتے اور دن رات میں چار ختم قرآن پڑھتے اور تین دن میں بارہ ختم فرمائے۔

وہاں سے رخصت ہو کر دکن کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں اجمیر[1] میں ٹھہرے اور

---

[1] اجمیر شریف کے بعد مولانا زین الدین خلد آباد پہنچ گئے یہاں اس زمانہ میں محمد شاہ بہمنی کی حکومت تھی، لکھا ہے کہ چونکہ شراب نوشی کا عادی تھا اس لیے بھی اور ملک میں امن و امان قائم کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہ تھی، اس لیے باوجود سخت آرزو کے آپ نے اس کی ملاقات سے انکار کر دیا، اور غائبانہ طور پر اس نے چاہا کہ اپنی تحریری بیعت بھیج دیں، اس سے بھی آپ نے انکار کیا، کہلا بھیجا۔

"سزاوار ریاست خلق کسے ست کہ در حفظ شعار ملت محمدی کوشیدہ سزاد علانیۃ پیرامون شاہی نگردد"

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۰۰ پر)

وہاں بھی وہی "یک ہفتہ در روضہ مقدسہ خلوت گزیدہ روزے چہار ختم مجموع بسبعہ
وہ ہفت قرآن ختم کرو" چونکہ مولانا زین الدین نے قرآن حفظ فرمالیا تھا، اس لیے
ان کو پڑھنے میں آسانی ضرور ہوتی ہوگی لیکن روزانہ چار ختم کرنا پھر بھی میں نہیں سمجھتا
کہ اسے معمولی بات سمجھی جائے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی | اب لوگوں کو کیا کہیے، طریقہ علیہ چشتیہ کی ایک دوسری شاخ صابریہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۹)

سلطان بار بار آدمی شیخ کے پاس بھیجتا رہا آخر میں قاضی القضاۃ کو بھیجا کہ بیعت نامہ پر شیخ کے دستخط کرالاؤ مگر
وہ کسی طرح راضی نہ ہوتے۔ یہ قصہ کہلا بھیجا کہ کسی کافر بادشاہ نے ایک مسلمان عالم و سید و ہیجڑے کو
گرفتار کر کے بت کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، عالم اور سید دونوں نے اس کو اکراہ قرار دے کر بظاہر سجدہ کی
صورت بنائی جب ہیجڑے مخنث سے کہا گیا تو اس بیچارے نے کہا "تمامی عمر من دراز کار ملتا گذشت" بوالکہ بھی نہ ہیں عالم ہوں نہ سید سرمایہ من لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ است اگر
ایں اہم زندست دہم لمرد احال کس چہ با شد اگر سرازتن جدا کنند من بت را سجدہ کردنی نیستم"
شیخ زین الدین نے اس قصہ کو بیان کر کے فرمایا کہ من مخنث بلکہ بتر از مخنث اگر
مجلس حاضر شوم یا بخلاف تو اقرار نمائم، بادشاہ پھر بھی جبر و اکراہ کرتا رہا، مگر آخر میں خدا نے اس کے
دل میں شیخ کی ہیبت ڈال دی اور پشیمانی کا خط لکھا حضرت نے کہلا بھیجا کہ سلطان محمد شاہ غازی
شریعت محمدی کے مطابق شراب کی دکانیں ممالک محروسہ میں بند کرادے اور اپنے علماء و قضاۃ و صدور
کو حکم دیں کہ لوگوں کو دین محمدی پر قائم کریں تو زین الدین فقیر دوست تر کسے نخواہد بود "غازی"
کے خطاب پر سلطان بہت خوش ہوا، اور تمام ملک سے یک قلم شراب نوشی کو حکماً بند کرادیا۔ ملک میں
ڈاکہ اور چوری کے وار دات بکثرت ہو رہے تھے۔ سب کا انسداد سختی سے کیا لکھا ہے کہ چھ سات مہینوں
میں اتنے چور ڈاکو ٹھگ مارے گئے کہ بیس ہزار سر گلبرگہ میں جمع ہوگئے اور شہر کے کنارے ان سروں
سے ایک چبوترہ بنایا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ اور شیخ میں بہترین تعلقات پیدا ہوگئے اور شیخ خوشحال شدہ مکلمہ
افضل بہ کلم ... آورد۔

ہے اصابریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے متعلق ان کے صاحب زادے مولانا رکن الدین کے مناقب للعارفین میں یہ روایت منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے۔

"پدر بزرگ من از اولیا بودند تلاوت قرآن وظیفہ داشتند و مسائل شرعی ہمیشہ مطالعہ کردند۔ ص، ۳۵۔

میرے والد بزرگوار اولیاء اللہ تھے تلاوت قرآن ان کا ہمیشہ کا معمول تھا اور ہمیشہ مسائل شرعیہ کے مطالعہ میں منہمک رہتے

بتایا جائے کہ چشتیہ طریقہ کا اب کونسا سلسلہ باقی رہ گیا جس کا قرآن سے وہ تعلق ثابت نہیں ہوتا جس کا میں دعویٰ کرتا چلا آرہا ہوں۔ بہرحال کچھ بھی ہو اب اسے کوئی خوش اعتقادی قرار دے یا وجوہات بھی سمجھی جائے مختلف قرائن وقیاسات منتشر معلومات نے مجھ میں یہ حسن ظن پیدا کر دیا ہے کہ حفظ قرآن کی دولت ہندوستان میں جو عام ہے، اتنی عام کہ شاید ہی کسی دوسرے اسلامی ملک میں حافظوں کی اتنی تعداد پائی جاتی ہو جتنی بوقت واحد ہندوستان میں نکل سکتی ہے، ہوسکتا ہے کہ ان میں کچھ دوسرے اسباب کو بھی دخل ہو، لیکن ایک بڑی وجہ اس کی میرے نزدیک خواجگان چشت ہی کا وہ مذاق ہے جو حفظ قرآن کے متعلق ہم ان میں پاتے ہیں۔

ان مثالی اور جزئی شہادتوں کے سوا جن کا ایک ذخیرہ آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہے، ایک عجیب وغریب شہادت اس باب میں ایک غیر چشتی بزرگ حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ

لہ آپ کا ذکر پہلے بھی مختلف سلسلہ میں آیا ہے بقول شیخ محدث از مشاہیر مشائخ ہندوستان ست چہ احتیاج کہ کسے ذکر مناقب او کند۔ اخبار۔ ص ۷، ۱۱ لیکن یہاں اتنی بات بتانی ہے کہ آپ طریقہ سہروردیہ کی ایک شاخ فردوسیہ سے تعلق رکھتے تھے، یہ یاد رکھنے کی چیز ہے کہ حضرت والا کے پیر طریقت شیخ نجیب الدین فردوسی تھے اور ان کے پیر شیخ رکن الدین فردوسی۔ شیخ رکن الدین حضرت نظام الدین اولیاء کے معاصر ہیں، کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین مبارک بھی جب سلطان المشائخ ثانی اگلے صفحہ پر

منیری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، آپ کے ملفوظات "معدن المعانی" نامی میں براہ راست حضرت والا کا ایک بیان درج ہے، میں بجنسہ ان ہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں

مخدوم فرمود کہ من از شیخ زادہ شنیدہ ام	مخدوم نے فرمایا کہ میں نے شیخ زادہ سے سنا ہے کہ وہ
کہ می گفت پدر مرا ہزار ختم قرآن بود	کہتے تھے میرے والد نے قرآن مجید کو ہزار دفعہ ختم
سہ صد در خارج صلوٰۃ و ہفت صد در صلوٰۃ۔	کیا تھا، تین سو تو نماز سے باہر اور سات سو ختم نماز کے اندر

معدن المعانی" ہی کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ "شیخ زادہ" کے لفظ سے مراد خاندان چشت کے ایک بزرگ ہیں، ملفوظات میں متعدد جگہ ان کا تذکرہ کیا گیا ہے نام کا تو ان کے پتہ نہ چل سکا، لیکن شیخ زادہ چشتی سلمہ اللہ تعالیٰ کے عنوان سے ان کا ذکر مختلف مقامات میں پایا جاتا ہے۔ ملفوظات کے ۲۴۹ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے یہ آخر میں بہار پہنچے، اور حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ سے وہیں ملاقات ہوئی، یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔

رنیہ حادثہ جو گزشتہ سے برسر پرخاش ہوا تو اس نے حضرت شیخ رکن الدین کو ان کے مقابلے میں کھڑا کر دیا، ظاہر ہے کہ بزرگوں میں تو کیا مقابلہ ہوتا لیکن عام مریدوں کو شیخ رکن الدین کے طریقہ چشتیہ سے کوئی رقابت پیدا ہو گئی تھی، اسی غلط فہمی کا ازالہ مقصود ہے جو آپ کو شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے ملفوظات میں نظر آئے گا، کہ وہ سلطان جی کو اپنی مجلس میں مختلف طریقہ سے ستائش فرماتے، فردوسیوں میں خواہ مخواہ جو ایک غلط خیال پیدا ہو گیا تھا جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کو مٹانا چاہتے تھے، تعجب اس پر ہے کہ حضرت شیخ شرف الدین کو جن لوگوں نے بہار کے قیام پر مجبور کیا، ان میں زیادہ تر حضرت نظام الدین اولیاء ہی کے خلفاء ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام میں اگر کچھ لوگوں میں رقابت ان مختلف سلاسل و طرق کے متعلق پیدا بھی ہو جاتی تھی تو اکابر ہمیشہ اس کے ازالہ کے درپے ہوتے تھے کہ سب ایک راستے اللہ کی طرف لیجاتے ہیں۔ چونکہ مذکورہ بالا شہادت چونکہ کسی چشتی کی نہیں ہے اس لیے اس کو زیادہ وقعت بھی ملنی چاہئے ۱۲۔

جیسا کہ ان ہی کی زبانی یہ فقرہ منقول ہے :۔

"من چندیں زبانہا مے دانستم از ترکی و فارسی و عربی"	میں کئی زبانیں جانتا تھا ترکی فارسی اور عربی۔

بہر حال کچھ بھی ہو، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ان ہی شیخ زادہ چشتی سے ان کے والد کے طریقہ ختم کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں،

"و ہمہ خواجگان چشت را رحمہم اللہ ہم بریں منوال است" ص ۱۸۶	تمام خواجگان چشت اسی طور پر رہیں۔

اس کے سوا اور کیا مطلب اس کا لیا جا سکتا ہے کہ شیخ زادہ چشتی کے پدر بزرگوار کا جو دستور ختم قرآن کے متعلق تھا، وہی دستور "ہمہ خواجگان چشت" میں مروج تھا اور اسی شہادت کا پیش کرنا میرا مقصود تھا۔

بلکہ اسی کتاب کے دوسرے مقام میں ایک اور دلچسپ چیز ملتی ہے، جامع ملفوظ ارقام فرماتے ہیں کہ :

"بندگی مخدوم بحاضرانِ مجلس روئے مبارک آورد و پرسید کہ کسے را ایں آیت یاد ست کہ در کدام سورہ ست کسے را یاد نہ بود"	حضرت مخدوم نے مجلس سے خطاب کر کے فرمایا کہ کسی کو یہ آیت یاد ہے کہ کس سورت میں ہے؟ کسی کو یاد نہ تھی۔

حضرت نے اس وقت عجب حسرت کے لہجہ میں فرمایا کہ :

"آنچہ مرا یاد می باید ہماں یاد نیست"	جو مجھے یاد ہونا چاہئے تھا وہی یاد نہیں ہے۔

پھر اپنی ابتدائی تعلیم کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا،

در ایام خوردگی چندیں کتابہا مارا یاد کنانید، چنانکہ مصادر و مفتاح اللغات وجز آں کتابہا، مفتاح اللغات	بچپنے میں بہت سی کتابیں یاد کرائیں جیسے مصادر و مفتاح اللغات اور ان کے علاوہ، مفتاح کی ایک

جزدے بستے خواہد بود مقدار یک جلد یاد کرانیدند و ہر بار یاد تمام می شنیدند"	جلد یاد کرائی اور ہر مرتبہ پوری کی سنی۔

اس سے کم از کم مجھے تو ہندوستان کی آٹھویں صدی کے مکتبی نصاب کے بعض اجزا کا سراغ ملتا ہے، مصادر سے مراد غالباً کوئی اس قسم کی کتاب ہے جس کو مکاتب میں آج کل بھی "آمد نامہ" یاد کرتے ہیں جسے "آمدن نامہ" کہتے ہیں، صفوۃ المصادر یا "مصدر فیوض" وغیرہ مختلف ناموں سے لوگوں نے فارسی کے مصادر ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں، بچوں کو ابتدا میں وہی کتاب یاد کرائی جاتی ہے، اور کوئی شبہ نہیں کہ آئندہ زندگی بھر بچپن کی یہ محنت لوگوں کو کام آتی ہے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں علاوہ مصادر کے لغت کی کوئی کتاب بھی زبانی یاد کراتے تھے، جس کا اب رواج باقی نہیں رہا "ہر بار یاد تمام شنیدند" سے آموختہ سننے کا جو قاعدہ تھا اس کا بھی پتہ چلتا ہے، خیر یہ تو ایک ضمنی بات ہے، حضرت نے مندرجہ بالا فقرہ کو ختم کر کے پھر ارشاد فرمایا۔

یالیت بجائے ان قرآن آنے کاش یادمی کرانیدند" (ص ۲۳۱)	کاش اس کی جگہ قرآن یاد کرایا ہوتا۔

حفظ قرآن کا شوق

اور اس سے میرے اس خیال کی توثیق ہوتی ہے کہ حفظ قرآن کا مذاق چشتی طریقہ سے کوئی خاص خصوصیت رکھتا ہے، اور آئندہ ملک میں اس کا جو عام مذاق پھیل گیا۔ وہ ان ہی بزرگوں کے انفاس طیبہ کی برکت ہے۔ اس کے بعد سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ایک اور جزء کا اضافہ آپ نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ جو عام طور پر مخدوم الملک کے نام سے کم از کم صوبۂ بہار میں مشہور رہیں، ان کی ابتدائی تعلیم سنار گاؤں (بنگال) میں ایک عالم علامہ شرف الدین توامہ سے ہوئی تھی، جو دلی سے بنگال بھیجے گئے تھے کہتے ہیں

جہاں پر آج ڈھاکہ شہر کی آبادی ہے، اسی کے قریب کسی جگہ یہ سنار گاؤں آباد تھا حفظ قرآن کا ذکر جب چھڑا تو آپ کو اپنے ان ہی اُستاد شرف الدین توامہ کے حلقہ درس کا قصہ یاد آگیا، فرمانے لگے،

در سنارگاؤں برادر مولانا یعنی شرف الدین توامہ زین الدین نام داشت او قرآن نیکو یاد بود، در وقت سبق خواندن اگر در سبق کسے آیتے برائے تمسک جستے آمدے در آں محل مولانا شرف الدین توامہ محتاج می شد کہ در کدام سورہ است و مولانا زین الدین نشستہ بود سند یافتے کہ مولانا تتبع می کند ایں آیت در کدام سورہ است

سنارگاؤں میں مولانا شرف الدین کا بھائی جن کا نام زین الدین تھا ان کو قرآن اچھا یاد تھا، سبق پڑھانے وقت اگر کوئی آیت آتی تو مولانا پوچھتے کہ کس سورت میں ہے اس وقت مولانا شرف الدین توامہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ یہ کس آیت میں ہے مولانا زین الدین موجود ہوتے اور آپ بار بار دریافت کرتے کہ بتاؤ کس سورت میں ہے۔

مخدوم الملک فرماتے ہیں کہ مولانا کے بھائی زین الدین ایسے موقعہ پر

۱؎ اس موقع پر حضرت الاستاذ الامام مولینا انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کا خیال آتا ہے، ان کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا اتنا قوی کہ لاکھوں میں شاید کسی ایک کا ہو، کم از کم اب تک اس قسم کے قوی حافظہ کے آدمی سے میری ملاقات نہیں ہوتی، ہزار ہا ہزار اشعار عربی فارسی کے زبانی یاد تھے، جس کتاب پر ایک دفعہ نظر پڑ گئی گویا ان کے حافظہ کی الماری میں بند ہو جاتی تھی جب جی چاہتا اندر ہی اندر کھول کر پڑھ لیتے، لیکن اسی کے ساتھ قرآن کی کسی آیت کی ضرورت اس قسم کے مواقع میں جیسا کہ مخدوم نے فرمایا درس میں پیش آتی تو طلبہ کی طرف رخ کر کے دریافت فرماتے "پوری آیت کیا ہے؟" فقیر نے ایک دن عرض بھی کیا کہ آپ کا حافظہ تو قرآن کو شاید چند دنوں میں یاد کر سکتا تھا، پھر یہ کیا بات ہے؟ جواب میں فرمایا کہ قسمت! بجز ت، واللہ اعلم کیا بات تھی۔ ۱۲

"برائے طیبت ہر کت زبانے خاموش | خوش مزاجی کے طور پر تھوڑا خاموش رہتے
ماندے و دوم نہ زدے ویاراں راچشمک | اور ساتھیوں کو اشارہ کرتے کہ
دادے کہ اکنوں کی خوار گفت۔ | اب کہو

(گویا سارا مجمع ایسے موقعہ پر اپنے عجز کے اعتراف پر مجبور تھا، فرماتے ہیں کہ تب:

"مولانا شرف الدین توامہ بروئے | مولانا اپنا چہرہ ان کی طرف کرتے اور
مبارک سوئے اومی آورد ومی گفت کہ | فرماتے کہ بس کرو اور اب بتاؤ کہ
بس کنید اکنوں بگوئید کہ درکدام سورہ است" | کس سورۃ میں ہے۔

جب مولانا بھائی کو اس لہجہ میں حکم دیتے تب:

"گفتے کہ درفلاں سورت است" | وہ کہتے کہ فلاں سورت میں ہے۔

خاندان چشت کا کارنامہ

میری غرض اس تفصیل کے نقل کرنے سے ایک تو یہ ہے کہ کچھ اس زمانہ کے درس و تدریس کے طریقہ کا پتہ اس بیان سے چلتا ہے، اور دوسری بات وہی ہے کہ حفظ قرآن کے ساتھ طریقۂ چشت کے بزرگوں کو جو وابستگی تھی ان واقعات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ کوئی خصوصی مذاق تھا، آج ان بزرگوں کو جس نظر سے بھی دیکھا جاتا ہو، جو باتیں بھی ان کی طرف منسوب کی جاتی ہوں لیکن اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ اسلام و ایمان کی روشنی اس کفرستان میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ پھیلانے میں جن بزرگوں کا سب سے زیادہ حصہ ہے، وہ خانوادۂ چشت ہی کے اکابر ہیں، اسلام کی جڑیں جب اس ملک میں مضبوط ہو گئیں اس وقت تو یقیناً اوروں کو بھی یہاں کام کرنے کا موقعہ ملا، اور بڑی ناشکری ہوگی اگر دوسرے طرق و سلاسل کے بزرگوں کی عظیم الشان خدمات اور قربانیوں کو بھلا دیا جائے

دوسرے سلسلۂ تصوف کی خدمات

قادریہ، سہروردیہ اور آخر میں جب مغل آئے تو ان کے بعد نقشبندیہ سلسلہ کے جاں فروشوں نے محمد رسول اللہ صلعم

کے دین کے پرچم کو سر بلند رکھنے میں جو مجاہدات کیے ہیں یقیناً وہ بڑے قیمتی ہیں، علی الخصوص عہد اکبری کے فتنہ ایمان سوز کے مقابلہ میں سرہند کے فقیر بے نوا نے جو کام کیا ہے، یہ واقعہ ہے کہ ہماری پچھلی ڈلیس بحمداللہ اسی جہاد اکبر کی بدولت آج اسلام صحیح، اور ایمان واقعی سے قریب ہیں، ورنہ اکبری عہد میں اسلام کو مسخ کرکے جس خود ساختہ نئے قالب میں ڈھالنے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ اگر نام کے ہم مسلمان باقی بھی رہتے، تو کیا واقعی ہمارا اسلام وہ اسلام ہوتا جو اللہ کے آخری رسول علیہ السلام نے ہمیں سونپا ہے۔

لیکن گفتگو آخر میں نہیں اول کار میں ہو رہی ہے اور اسی لیے ذرا درازنفسی بلکہ تلخ نوائی پر مجھے مجبور ہونا پڑا کہ بعض خاص مؤثرات وعوامل جن میں بڑا حصہ مغربی دسیسہ کاریوں کا بھی ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ بزرگان چشت کی جانب سے قلوب میں عام سرد مہری بڑھتی جارہی ہے، ان کے کارناموں کی اہمیت گھٹا کر لوگ شدید قسم کی محسن کشی کا ارتکاب کر رہے ہیں، ان بزرگوں کے کام تو کام ہند ریگ ناموں تک کے بھلانے کی غیر شعوری کوششیں ہو رہی ہیں، ارادہ تو ایک زمانہ سے تھا اور جو کچھ اس سلسلہ میں میں کہنا چاہتا ہوں اس کا عشر عشیر بھی نہیں کہا ہے لیکن ہندوستان کے تعلیمی نظام کے سلسلہ میں چونکہ ان بزرگوں کا ذکر ناگزیر تھا جن کے دینی اور روحانی دباؤ کے نیچے اس ملک کے خواص وعوام صدیوں دبے رہے ہیں، اس لیے صرف ایک پہلو یعنی ان کا قرآن سے جو تعلق تھا محض اس کے متعلق ذرا طویل گفتگو سے مجھے کام لینا پڑا، ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے مجھ پر اپنے موضوع سے ہٹ جانے کا الزام بھی قائم کیا جائے۔ لیکن ہر لکھنے والا اپنے لکھنے کی ایک غرض سامنے رکھتا ہے، مجھے نہ ریسرچ کرنا ہے، نہ اپنی تحقیق کی داد لینی ہے۔ اپنا ایک فقیرانہ خیال تعلیم کے متعلق جو ہے، جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے اسے بیان کر رہا ہوں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا خواجگان چشت کے

متعلق مختلف دائروں میں چونکہ طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلی ہوئی ہیں، اور اب وہ بتدریج اتنی گہری ہوتی چلی جارہی ہیں کہ تفصیل سے اگر کام نہ لیا جاتا اور چند سرسری حوالوں کو دے کر گذر جاتا، تو اسے میری ایک نری خوش اعتقادی کے سوا شاید اور کچھ نہ قرار دیا جاتا بلکہ اس جملہ سے تو اب بھی اپنے آپ کو میں محفوظ و مصئون نہیں پاتا، مگر جو واقعات آپ کے سامنے معتبر حوالوں سے پیش کیے گئے ہیں، ان کے بعد اب بھی کیا یہ صرف میری خوش اعتقادی ہی باقی رہتی ہے۔

خاندان چشتیہ

کتنا بڑا ظلم توڑا گیا کہ جن لوگوں نے اس ملک میں قرآن کو پھیلایا، اسی کو اپنے طریقہ کا اہلاک کا قرار دیا، بے دیکھے، بے پڑھے، محض افواہی روایات سُنے سنائے قصوں، اسلاف کی راہ چھوڑنے والے اخلاف کے غلط نمونوں کو دیکھ کر آج یہ رائے قائم کرلی گئی ہے کہ چشتی طریق کے بزرگوں نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ اسلام جیسے متین اور سنجیدہ باوقار دین میں انھوں نے طبلہ اور سارنگی کو داخل کردیا، یہ الفاظ ہیں جو میرے سُنے ہوئے ہیں۔ اور اسی زمانے سے دماغ کھول رہا تھا، قلم جب ہاتھ میں آیا تو اختصار پر صبر نہ کرسکا، افسوس ہے کہ بات بہت طویل ہوچکی ورنہ اس "چنگ وچغانہ" کے قصہ پر بھی تفصیلی گفتگو ہوسکتی تھی جس کا الزام چشتیوں کے اکابر اسلاف پر بے دردی کے ساتھ لگایا جارہا ہے۔

کیسی عجیب بات ہے، اتنے معتبر ذریعہ سے جس سے زیادہ قابل اعتماد ذریعہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ حسن علا سنجری براہ راست حضرت سلطان المشائخ سے راوی ہیں کہ ایک دن آپ نے اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے، یعنی امام کو جب نماز میں سہو ہوجائے تو یاد دلانے کا طریقہ جیسا کہ فقہ کا مشہور مسئلہ یہ ہے کہ اگر مرد یاد دلانا چاہتا ہو تو چاہیے کہ وہ سبحان اللہ کہے، لیکن یاد دلانے والی اگر عورت ہو تو مسئلہ یہ ہے کہ بجائے زبان کے وہ تصفیق سے کام لے یعنی بجائے سبحان اللہ کہنے کے

"دستک" سے کام لے، مگر فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ دستک کا جو عام طریقہ ہے وہ صورت اختیار نہ کرے، مطلب یہ ہے کہ "کف دست بر کف دست نزند" سلطان المشائخ نے اس کے بعد اس امتناعی حکم کی توجیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "آں بہ لہو می ماند" یعنی، ہتھیلی کو ہتھیلی کے ساتھ جوڑ کر پیٹنے میں ایک قسم کے کھیل اور لہو کی صورت پیدا ہو جاتی ہے" اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ بجائے اس کے "پشت دست بر کف زند" ایک ہاتھ کی پشت پر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پیٹے گویا اس شکل میں لہو اور کھیل تماشے والی تالیوں سے یہ صورت جدا ہو جاتی ہے،

سماع میں تالی بجانے کی ممانعت

میر حسن کا اس کے بعد بیان ہے کہ سلطان المشائخ نے اس فقہی مسئلہ کا ذکر کر کے فرمایا کہ:

"تا این غایت از ملاہی کھیل تماشے، و امثال آں احتراز آمدہ ست پس در سماع بطریق اولیٰ کہ ازیں بابت نہ باشد"	اس قدر کھیل تماشے اور اس طرح کے دوسرے مشاغل سے پرہیز کا حکم آیا ہے پس سماع میں تو بدرجۂ اولیٰ یہ نہیں ہونا چاہیے

آگے اپنے مقصد مبارک کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"یعنی در منع دستک چندیں احتیاط آمدہ ست در منع مزامیر (باجہ وغیرہ) بہ طریق اولیٰ"	اس قدر تالی پیٹنے سے احتیاط کا حکم آیا تو باجہ وغیرہ کی ممانعت بدرجہ اولیٰ ہو گی۔

یہ تھا خیال مزامیر و چنگ و چغانہ، وغیرہ میں، طریقۂ چشتیہ کے ایک معمار اعظم کا وہی جسے آج اس مسئلہ میں سب سے زیادہ بدنام کیا گیا ہے، اللہ اللہ جس کے نزدیک ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر پٹک کر تالی کی صورت بنانی بھی ناجائز ہو، ہمیں باور کرایا جاتا ہے کہ اس کی مجلس سماع میں ڈھول اور طبلے ٹھنکتے تھے، ستار اور سارنگی، بانسری اور نفیری بجایا جاتا تھا

مزامیر کی ممانعت

ان ہی حسن علا سنجری نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت والا سے کسی نے آ کر عرض کیا کہ آج فلاں مجلس میں مزامیر کے ساتھ سماع سنا جا رہا تھا، سننے کم

ساتھ ہی حضرت کا چہرہ بدل گیا اور فرمانے لگے۔

"من منع کردہ ام کہ مزامیر و محرمات درمیاں نہ باشد"[۱] — میں نے روک دیا ہے کہ باجے وغیرہ ناجائز چیزیں نہ بجنے پائیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں، مزامیر کو جو محرمات قرار دے رہا ہو، کیا ایک لمحہ کے لیے کوئی تصور کر سکتا ہے کہ وہ خود ان محرمات میں مبتلا تھے، امیر حسن نے اسی کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ

"در ایں باب بسیار غلو می فرمود" فوائد ص ۹۵ — اس میں بہت غلو فرماتے تھے۔

میں اس وقت مزامیر کے مسئلہ کو نہیں بیان کر رہا ہوں، بلکہ صرف اس ظلم کو دکھانا چاہتا ہوں جو مشائخ چشت کے ساتھ روا رکھا گیا ہے آپ کو بجائے خود اختیار ہے، جو چاہے کیجیے، اور جس قسم کا مسلک اپنے اجتہاد سے یا کسی مجتہد کے اجتہاد سے اختیار کیجیے، لیکن خدارا جھوٹ تو نہ بولیے، جس سلسلہ کے اساطین کا مزامیر کے باب میں اتنا غلو ہو، اسی سلسلہ کی آڑ لے کر تو ان چیزوں کو جائز نہ قرار دیجیے، امیر علاء حسن ہی نے ایک دوسرے موقعہ پر لکھا ہے کہ کسی نے حضرت والا سے یہ عرض کیا کہ مزامیر کے ساتھ جو لوگ سماع سن رہے تھے، ان سے جب پوچھا گیا کہ آپ نے یہ کیا حرکت کی تو ان لوگوں نے جواب دیا کہ:

"ما چناں در سماع مستغرق بودیم کہ ندانستیم کہ ایں جا مزامیر ہست یا نہ" — ہم سماع میں اس قدر مستغرق تھے کہ ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مزامیر ہیں یا نہیں۔

امیر حسن کہتے ہیں کہ:

۱؎ اصل یہ ہے کہ ایران و خراسان سے ہندوستان میں ایک فرقہ قلندروں کا بھی آدھمکا تھا جو ٹاٹ پہنے چار ابرو کا صفایا کیے ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا۔ ان کو حیدریان بھی کہتے تھے، غضب یہ کہ ان کے مرشدوں میں یہ فرقہ بھنگ بھی پیتا تھا، بے قید تھا، ڈھول ڈھکے میں رہنا ان کی عام عادت تھی، مشائخ چشت نے ہمیشہ ان کو بری نظر سے دیکھا ہے ۱۲۔

"خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر چوں آں سخن شنید فرمود کہ ایں جواب ہم چیزے نیست"	خواجہ ذکر اللہ نے جب یہ جواب سنا فرمایا یہ جواب کچھ نہیں (غلط ہے)

صرف یہی نہیں کہ "ہیچ چیزے نیست" بلکہ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ:

ایں سخن در جملہ معصیتہا باید نوشت[۲۲۶] کہ ان سب کو گناہ میں لکھنا چاہیے۔

یعنی ایک گناہ تو مزامیر ہی میں مبتلا ہونے کا تھا اور اس قسم کی لغو توجیہ دوسرا گناہ ہوا جو سب لکھا جائیگا، یہی میں بھی عرض کر رہا ہوں کہ مزامیر کا سننا تو سننا یہ الگ مسئلہ ہوا، لیکن اس کو سننا بھی، اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہنا کہ مشائخ چشت کا یہ طریقہ ہے، کیا اپنے گناہ میں مزید گناہ کا اضافہ نہیں ہے، یہ خوب توجیہ ہوئی کہ "ہمیں مزامیر کے ہونے یا نہ ہونے کا پتہ نہ چلا" کیا شراب اس لیے حلال ہو جائے گی کہ پینے والے یہ کہیں کہ ہمیں پینے کے وقت پتہ نہیں چلتا کہ شراب پی رہا ہوں۔ یا شربت پی رہا ہوں سلطان المشائخ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا جیسا کہ اسی مجلس کے ملفوظات کے شروع میں امیر حسن نے نقل کیا ہے کہ:

"خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ حرام است بحکم کسے حلال نہ شود و چیزے کہ حلال ست بحکم کسے حرام نشود" (ص ۲۲۶)	خواجہ فرماتے ہیں کہ جو چیز حرام ہے کسی کی وجہ سے حلال نہ ہوگی اور جو حلال ہے وہ کسی کی وجہ سے حرام نہ ہوگی۔

درحقیقت یہ ہے کہ ایک مزامیر ہی کا مسئلہ کیا، بلکہ ان لوگوں کو جو حضرت والا سے دینی عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کو طریقہ چشتیہ کا یہ کلیہ یاد رکھنا چاہیے کہ شریعت نے جس چیز کو حرام کیا ہے، کسی امتی کو خواہ وہ کوئی ہوں، صحابی ہوں یا مجتہد ہوں، امام ہوں یا ولی ہوں کسی کو اختیار نہیں ہے کہ اسے حلال ٹھہرائے، اور جو چیزیں حلال ہیں، کسی کو کوئی حق نہیں ہے کہ آئے وہ حرام کرے۔ نوٹ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پر ختم ہو چکی، شریعت اسی دن کامل ہو چکی جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "اِنَّ الدِّین
عِندَ اللّٰہِ الْاِسْلَام" مسلمانوں کے سپرد کر کے رفیق اعلیٰ تشریف لے گئے۔ بالفرض اگر کسی امتی کی طرف
ایسی بات کسی نے منسوب بھی کی ہے تو ہم یا اس انتساب ہی کو غلط ٹھہرائیں گے اگر اسمیں کا
انتساب کسی ایسے بزرگ کی طرف کیا گیا ہے جس کی امانت و دیانت، اخلاص و للہیت
پر طبقۃً بعد طبقۃٍ مسلمانوں نے اتفاق کیا ہے، یا اس کی تاویل اگر ممکن ہوگی تو کی جا
اور ان باتوں کا بھی امکان نہ ہو تو یہی سمجھا جائے گا کہ ان سے غلطی ہوئی، کیونکہ مسلمان
بہرحال مسئول اسی شریعت کا ہے جس کی تعمیل کا مطالبہ حق تعالیٰ نے محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے کیا ہے، قیامت کے دن شریعت کے کسی مسئلہ کی
خلاف ورزی کے متعلق یہ جواب قطعاً قابل شنوائی نہیں ہوگا کہ خاتم النبیین محمد رسول ا
صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کا ہر طرز عمل یا قول تھا۔ اب کوئی
نبوت نہیں کر سکتا خدا کی جدید رسالت اب قیامت تک کوئی نہیں لا سکتا، محمد رسول ا
صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو چھوڑ کر حق تعالیٰ کی مرضی کی یافت کا دعویٰ کرنا آنحضر
صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے ختم نبوت کی تکذیب ہے۔ کیا تماشا ہے لوگ کچھ الفاظ بو
ہیں، ان کے معنی سے بے تعلق ہو کر بولتے ہیں مگر سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ سمجھ رہے ہیں، کہا جا
کہ فلاں مسئلہ شریعت کے رو سے درست نہ ہو لیکن طریقت میں اس کی اجاز
ہے حالانکہ ان دیوانوں کو یہی معلوم نہیں کہ طریقت سے مراد کیا ہے، کیا محمدؐ کی نبوت
سوا ان کے لائے ہوئے قرآن کے سوا وہ کوئی اور چیز ہے، طریقت کا مادہ طریق ہے
شریعت کی راہ پر جو عملاً چلنے لگتا ہے۔ اسی کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ وہ طریق ا
پر لگ گیا، شریعت تو ان علوم کے مجموعہ کا نام ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم
کو عطا کیا ہے ان ہی علوم کے مطابق عمل کرنے کا نام طریقت ہے۔

شریعت و طریقت | آخر یہ لفظ بولنے والوں کا تو بنایا ہوا نہیں ہے یہ صوفیہ کی اصط

ان ہی سے پوچھنا تھا کہ آپ کی کیا مراد ہے؟ سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ نے مزامیر ہی کے مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا

اگر کسے از مقامات بیفتد بارے در شرع افتد	کوئی شخص اگر طریقت کی کسی منزل سے گرے
بارے اگر از شرع بیروں افتد کیں چہ ماند"	تو شریعت ہی میں گرتا ہے، اگر شریعت کے دائرہ
فوائد الفواد۔ ص ۵۹	سے نکل گیا پھر باقی ہی کیا رہ گیا۔

مطلب وہی ہے کہ طریقت تو شریعت ہی پر اخلاص اور صداقت سے چلنے کا نام ہے، فرض کیجئے کہ کسی بیچارے کو یہ چلنا جس راستبازی، صداقت، اخلاص، جوش و ولولہ کے ساتھ چاہیے میسر نہ آیا تو کم از کم وہ ان چیزوں کو جو شریعت میں حلال ہیں انہیں حلال ہی مانتا ہے، جو حرام ہیں انہیں حرام ہی سمجھتا ہے۔ لیکن جس نے اس ماننے سے بھی بغاوت کی، تو طریقت تو خیر دور کی چیز ہے، وہ شریعت اور اسلام ہی کے دائرہ میں کب باقی رہا۔

بہرحال یہ واقعہ بھی ہے، اور یہی "شرب ناب" ہمارے خواجگان چشت کا تھا آپ دوسروں کے تصریحات میں تو ممکن ہے شاخسانے نکال سکتے ہیں لیکن خدا کا بڑا کرم ہندوستان کے مسلمانوں پر تو یہ ہوا کہ اس ملک میں اسلام جن بزرگوں کے ذریعہ پہلی دفعہ داخل ہوا، ان ہی میں سے ایک مسلم الثبوت ہستی نظام الاولیاء کے ملفوظات نے تقریباً ہند ہو کر تواتر کی شکل اختیار کر لی، کہ آج اسی کے ذریعہ سے بیسیوں غلط فہمیوں کے متعلق جو اصل واقعہ ہے اس کا سراغ لگانا ہمارے لیے آسان ہو گیا اور مزامیر کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ اس کے متعلق صرف حسن علاء سنجری ہی کی یہ روایتیں نہیں ہیں، بلکہ میر خورد جن کی کتاب ظاہر ہے کہ اعتماد و وثوق میں فوائد الفواد کی ہم وزن نہیں ہے بلکہ بعض خاص حالات کے تحت اس کی بعض چیزیں محل غور بن گئی ہیں میر خوردؒ کی

لہ چونکہ اپنے مقالہ میں میر خورد کی کتاب کے حوالے میں نے بکثرت نقل کیے ہیں، اس لیے باقی اگلے صفحہ پر

بعض تعبیریں بھی موحش ہیں ،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۳) میر صاحب کے متعلق یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ سادات کے ایک شریف گھرانے کے صاحب علم بزرگ ہیں۔ میں بتا چکا ہوں کہ حضرت سلطان المشائخ سے براہ راست شرف بیعت بھی ان کو حاصل ہے، اور حضرت کی خانقاہ کے متصل ہی ان کے والد کا مکان تھا، تعلیم بھی ان کی سلطان جی کے خلفاء سے ہوئی ہے، خود لکھتے ہیں کہ نعمت دیدار و مشاہدہ آں بزرگوار (سلطان المشائخ) بھی ان کو مسلسل حاصل ہوتی رہی اور ذوق مجلس ارادت و مساس دست مبارک سلطان المشائخ سے مشرف ہوتے رہتے تھے (ص ۲۵) اسی لیے میں ان کے بیان کو عام تذکروں کے بیان سے خصوصاً سلطان جی اور ان کے خلفاء کے متعلق ایک ایسا تاریخی بیان قرار دیتا ہوں جس کا مقابلہ دوسری تاریخی کتابوں سے مشکل ہے، مگر اسی کے ساتھ اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ حضرت والا کی بیعت ان کو ایسے زمانہ میں حاصل ہوئی کہ بقول خود "درک معانی دراں ایام چنداں" بود" ص ۳۵۱:- اور صرف یہی نہیں بلکہ حضرت والا کی وفات کے بعد خود ہی لکھتے ہیں کہ معاملہ نفس کہ دشمن دینی ست برحسب مطلوب آنحضرت (سلطان المشائخ) نہ بود" اور اس کی وجہ بیچارے سنگوری لکھ دی ہے کہ یہ جو کچھ ہوا "از غلبہ جوانی چنانکہ افتد دانی فراہم شد" ص ۳۶۲ یہ بھی لکھا ہے کہ اس زمانہ میں سلطان جی کو خواب میں جب دیکھا تو میں قدموں کی طرف بڑھتا لیکن "کسانیکہ بودند مانع ایں دولت می شدند" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر حضرت والا کا وہ پختہ چشتی گہرا رنگ نہیں چڑھا تھا جو سلطان جی کے خلفاء اور مریدوں کی خاص شان ہے، اسی لیے بعض مواقع میں ان کی تعبیریں حدود احتیاط سے متجاوز نظر آتی ہیں، کچھ ان میں ایک رنگ تعصب کا بھی ہے، یعنی حضرت بابا فرید شکر گنج کے دوسرے خلفاء خصوصاً سلسلہ صابریہ کے شیخ حضرت علی صابر صاحب کلیر شریف کا ذکر کچھ ایسے انداز میں کیا ہے کہ گویا ان کو باوا صاحب کے یہاں چنداں اہمیت حاصل نہ تھی، اگرچہ یہ الفاظ بھی لکھے ہیں "شیخ علی صابر درویشے بود ثابت و نفسے گیرا داشت ساکن تعصبر (؟) گیری بود" سے ہو پیوند بخدمت شیخ شیوخ العالم داشت و از حضرت شیخ شیوخ العالم اجازت بیعت بود" یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ سے شیخ علی صابر نے کچھ چاہا تو فرمایا "بھوگتا گاہی کرد" بھگتا کا ترجمہ کیا ہے مطلب خوش خواہد گشت" (باقی صفحہ ۲۱۵ پر)

سماع اور شرائط سماع

لیکن باوجود اس کے سماع و شرائط سماع کے متعلق حضرت سلطان المشائخ کے مسلک کو ان الفاظ میں درج کرتے ہیں:

"چندیں چیزے می باید کہ تا سماع مباح	تنی چیزیں ہونی چاہئیں کہ سماع مباح
شود مسمع مستمع مسموع آلۂ سماع	ہو، سنانے والا، سننے والے کیسے لوگ ہیں، جو چیز سنائی
پھر ہر ہر جزو کی خود تفصیل کرتے ہیں،	جا رہی ہے وہ کیا ہے، کن آلات سے سماع ہو رہا ہے۔
مسمع (سنانے والے کی شرط یہ ہے) کودک	سنانے والے کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ نابالغ
نباشد، عورت نباشد، مستمع (یعنی سننے	نہ ہو عورت نہ ہو اور سننے والوں کے لئے شرط یہ ہے
والوں کے متعلق یہ شرط ہے) از یاد حق خالی نہ	کہ اللہ کی یاد سے خالی نہ ہو اور جو چیز سنائی
باشد، مسموع (جو چیز سنائی جائے اس کی	جائے اس کے لیے شرط یہ کہ فحش اور مسخرگی
شرط یہ ہے کہ) فحش و مسخرگی نباشد"	نہ ہو۔

آخر میں "آلۂ سماع" کے متعلق لکھتے ہیں:

"آلۂ سماع مزامیر است چوں چنگ و رباب	اور آلۂ سماع باجے ہیں جیسے چنگ و رباب وغیرہ
و مثل آں می باید کہ درمیان نباشد" (ص ۴۹۲)	اس کے مثل دوسری چیز بیچ میں نہ ہونی چاہئیں

میر خورد نے حضرت سلطان المشائخ سے نقل کیا ہے کہ گانا سننے والوں کا۔

"اگر میل بکلی طرف مجاز است آں حرام است"	"اور ان اگر صرف مجاز کی طرف ہے تو وہ حرام ہے"

یعنی مزامیر ہوں یا نہ ہوں، لیکن جن لوگوں کے قلوب مادی حسن و جمال سے مالوف ہیں، ان کے لئے تو ہر قسم کا گانا سننا "حرام" ہے۔ یہ سلطان جی کا فتویٰ ہے جو انہوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) اگر شیخ کا جو مقام ہے اس لحاظ سے اتنے الفاظ ناکافی خیال کیے جانے میں یا شیخ محدث بھی متنبہ ہوئے ہیں، لکھا ہے کہ یہ طرز تحریر "خالی از غرابت نیست" بلکہ ان کو یہ شبہ ہے کہ کسی دوسرے علی صابر کا تو یہ تذکرہ نہیں ہے۔ (اخبار، ص ۶۹)۔

نقل کیا ہے، لیکن آج ان مسلمانوں کو کون جا کر سنائے، جو علانیہ بے دھڑک اپنے
نوجوان بچوں اور عورتوں تک کو سینماؤں میں بھیجتے ہیں، خود ہر قسم کے گیت جو جنسی جذبات
میں ہیجان پیدا کرتے ہیں، لوگ سنتے رہیں؟ اپنے لڑکوں لڑکیوں، بیویوں کو سنواتے ہیں،
اور اس طور پر مسلمانوں میں یہ عمل جاری ہو گیا ہے کہ گویا ان کے مذہب کا اس باب میں
کوئی حکم ہی نہیں ہے۔

آج ہمارے صوفیہ اس پر تو آستین چڑھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں، جو ان کے سماع
پر معترض ہوا، اور جواب میں بزرگوں کا فعل یا قول پیش کیا جاتا ہے لیکن جن بزرگوں
کے قول سے آپ سماع کا جواز ثابت کرتے ہیں اور ان کی نصرت و تائید کی حمیت آپ
کو آپے سے باہر کر دیتی ہے، بندگانِ خدا! ان ہی بزرگوں کا تو یہ فتویٰ بھی ہے کہ آج
جن خصوصیات کے ساتھ تھیٹروں میں سینماؤں میں گانا گایا جاتا ہے، یہ گانا "حرام"
ہے، پھر آپ میں اس فتوے کی تعمیل کا کیوں جوش پیدا نہیں ہوتا؟ اس میں حمیت کی
رگ کیوں نہیں پھڑکتی، کچھ نہیں تو جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں ان ہی سے
جہاں اور امور کا معاہدہ لیا جاتا ہے حرمت غنا کے اس صوفیانہ فتوے کا بھی معاہدہ
لیا جاتا۔ یہ نہیں تو جو لوگ آپ کے زیر اثر ہیں ان کو کم از کم یہ بھی بتا دیا جاتا کہ غنا کی یہ شکل
جو سینماؤں میں مروج ہے، یہ صرف فقہاء اسلام ہی نہیں بلکہ صوفیاء اسلام خصوصاً
ہندوستان کے طریقہ چشتیہ میں بھی حرام ہے۔ آخر کچھ تو لوگوں پر اس کا اثر ہوتا اب تو
کچھ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ سینماؤں کی شرکت ایک قسم کا غیر شریفانہ فعل
ہے اور وہ بھی ان لوگوں میں جن میں اسلام کا دباؤ کچھ نہ کچھ ابھی باقی ہے، حالانکہ آپ
یہ دیکھ رہے ہیں کہ گانے بجانے کے مسئلہ کو جن بزرگوں کی آڑ لے کر ایک حد تک جائز
ٹھہرایا جا رہا ہے ان کے نزدیک بھی "سینمائی گانے" حرام ہیں، آج اسلام کے اس
حکم کی قیمت لوگوں کو نہیں معلوم ہو رہی ہے، لیکن انسانی فطرت کی خصوصیات پر جن

کی نظر ہے، جو جانتے ہیں کہ "گانا" اور "نغمہ" کا تعلق آدمی کے جذبات کے ساتھ کیا ہے، خصوصاً جب ہیجان انگیز قصوں کی جیتی جاگتی تصویروں کے ساتھ اس کا میل کیا گیا ہو، انسان کی نقل اتارنے والی فطرت ان تماشائیوں سے کن خطرناک عناصر کو چراتی ہے، اور اپنی عملی زندگی میں اس کو شریک کر کے لوگ اپنے آپ پر، اپنی آئندہ نسلوں پر جن کے وہ امین و محافظ ہیں، ان پر کیا کیا مظالم ڈھاتے ہیں اور ڈھائیں گے اس کا اندازہ ابھی نہیں، اس ملک کو اس وقت ہو گا، جب علاج کا بھی وقت باقی نہ رہے گا

موجودہ یونیورسٹیوں کا نظام تعلیم

اور بوالعجبی تو یہ ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں ہمارے بچوں کی تعلیم و تربیت کی جو یونیورسٹیاں آج ٹھیکہ دار ہیں جن جوامع و کلیات و مدارس و معاہد کے متعلق دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ "انسانی اخلاق" کے نشو و نما اور بالیدگی کے وہ واحد ذرائع ہیں، ان میں خود نوجوان بچوں سے تمثیلی تماشے فنون لطیفہ کی سرپرستی کے نام سے علانیہ کرائے جا رہے ہیں، خام عمر کے ان بچوں کو جن کی شبابی زندگی بالکلیہ اس وقت جذبات، عواطف کے زیر اثر رہتی ہے، عقل کی خوابیدگی کے ان دنوں میں ان کو تباہی کے، جن غاروں میں ڈھکیلا جا رہا ہے اس کی فریاد کس سے کیجئے۔

یقین مانیے کہ اس کا بھی واحد علاج صرف نظام تعلیم کی وحدت ہے؛ کاش! اس مسئلہ کی اہمیت کو جتنا میں سمجھ رہا ہوں، دوسروں کی سمجھ میں بھی یہ بات آجاتی تو مسئلہ کچھ زیادہ مشکل نہ تھا آخر اتنا مشکل تو نہیں ہے، جتنا حکومت خود اختیاری کا مطالبہ، لیکن زمانہ کو اختیار ہے، جس چیز کو چاہے اہم قرار دے اور جسے چاہے بے معنی لغو، فضول کہہ کر ٹال دے لوگ "فرعون" سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ اس سے زیادہ ضرورت ہے کہ "فرعونیت" سے نجات پانے کی کوشش کی جائے۔ یعقوب کی اولاد اور اسرائیل کے بچوں کو فرعون کے پنجہ سے رہائی مل چکی تھی

شاعروں نے اپنی کثرتِ مشق سے مسلمانوں کو ان الفاظ سے اتنا مانوس کر دیا ہے کہ حقیقی معانی کی طرف ذہنوں کا منتقل ہونا گویا اب دشوار ہو گیا ہے۔ اس کے سوا بھی، صوفیہ اسلام نے اس کے دائرہ کو یوں وسیع کر دیا کہ بولنے والے کی خواہ کچھ ہی مُراد ہو، ہمیں اس سے بحث نہیں، انہوں نے ان الفاظ کا جو عام طور پر شعراء استعمال کرتے ہیں خاص خاص مطلب طے کر لیا تھا، اور ان مطالب کے ساتھ ان کی مشق اتنی بڑھ گئی تھی کہ گویا وہی مطالب ان کے نزدیک ان الفاظ کے حقیقی مطالب اور معانی ہوتے تھے، اور یہ کوئی چھپی ڈھکی راز کی بات نہ تھی، سلطان المشائخ کی مجلس کے محدث و عالم مولانا فخرالدین زرادی نے تو صاف لفظوں میں لکھ دیا ہے کہ:

"اگر مستمع (سننے والا) سماع حمل کند،	اگر سننے والے اشعار کو معین یا غیر معین
بر صورت مخلوق معین یا غیر معین این	طور پر حقیقی معنیٰ پر محمول کریں تو یہ سماع
سماع جوانان ذی شہوت بود"	اُن جوانوں کی ہوگی جو شہوت والے ہیں۔

الغرض سماع میں بڑی شرط یہ تھی کہ الفاظ کو ان معینہ مطالب پر محمول کرنے کی صلاحیت و مشق پیدا ہو چکی ہو، جو صوفیہ میں معین ہیں مثلاً:

"مستمع سماع را حمل کند بر احوال نفس	سننے والا سماع کو اپنے نفس کے احوال پر محمول
خود، بہ تقلیب احوالے کہ با خدا تعالیٰ دارد"	کرے ان احوال سے بدل کر جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ رکھتا ہو

کیونکہ ظاہر ہے کہ ایک بندے کا تعلق اطاعت و نافرمانی کے حساب سے حق تعالیٰ کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے، جس کا احساس خود اس شخص کو ہو سکتا ہے، جس کا خدا سے معاملہ ہے، اسی لیے صوفیہ اشعار کو۔

"در سلوک احوالے کہ پیش آید انہ قبول و رد و	راہ سلوک میں جو حالتیں پیش آتی ہیں
وصل و ہجر و طمع و نو میدی"	جیسے قبول و رد و وصل اور ہجر و امید و ناامیدی

ان ہی باتوں پر عمل کرتے ہیں، اور سلطان المشائخ سے اشعار کے محمول کرنے کے متعلق جو بیان سیر الاولیاء میں منقول ہے، یعنی۔

از لف قرب خواہد بقولہ تعالیٰ ۔لیقربو نا

الی اللہ زلفیٰ وازلون جنت وارچشم رنظر رحمت

علیٰ عینی ۔ دکفر پوشیدن باشد۔ یعنی تا ہستی واعمال

و صدق بر تو پوشیدہ نشود دعوی عشق از تو درست

نیا ید ص ۴۹۴۔

اور یہی میرا خیال ہے کہ دراصل قرآنی آیات کے ترجموں کو ایک خاص طریقہ سے یہ حضرات خوش الحانی کے ساتھ کبھی کبھی سُن لیا کرتے تھے، میں نے کسی جگہ شیخ کبیر کا حال نقل کیا ہے کہ حجرۂ مبارک میں ٹہلتے اور کبھی کبھی سربسجود ہو کر یہ اشعار پڑھتے۔

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم ۔۔۔ خاکے بشوم و بزیر پائے تو زیم

مقصود من خستہ ز کونین توئی ۔۔۔ از بہر تو میرم از برائے تو زیم

میں چاہتا ہوں کہ ہمیشہ آپ کی وفا میں زندہ رہوں مٹی بن جاؤں اور آپ کے پاؤں کے نیچے زندگی بسر کروں۔

مجھ ناچیز کا مقصد دونوں جہاں سے بس یہی ہے کہ آپ کے ہی واسطے مروں اور آپ کے ہی لیے زندہ رہوں۔

میں نے بتایا تھا کہ یہ آیت قرآنی اِنَّ صَوْتِی وَنُسُکِی کا حاصل ہے، جسے نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے میر خورد نے بعض ان اشعار کو بھی نقل کیا ہے، جس سے سلطان المشائخؒ کبھی کبھی بہت متاثر ہوگئے تھے مثلاً:

رُخ بجلہ را نمود و مرا گفت تو مبیں ۔۔۔ زیں ذوق مست بے خبرم کیں سخن چہ بود

آپ ہی بتائیے کہ اگر اس شعر کو سن کر کسی کا ذہن۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰی	کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے
رَبِّهَا نَاظِرَةٌ	رب کے نگراں . . . . یا
كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ	ہاں! وے لوگ اس دن اپنے رب سے
يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ۔	حجاب میں ہوں گے۔

کی طرف منتقل ہو جائے۔ اور اسی کیفیت میں وہ ڈوب جائے۔ تو وہ قرآن میں ڈوبا یا کسی اور چیز میں ڈوبا۔

جائز سماع کا منشا واقعہ یہ ہے کہ اس ذریعہ سے وہ اپنے ان تعلقات کو جو قرآن نے عبد و معبود یا امتی و رسول میں پیدا کیے ہیں اسی کو ذرا بیدار و زندہ کرنا چاہتے تھے، اور وہ بھی اس طریقہ سے کہ خاص احباب کا مجمع ہو، ہم مذاق لوگ لے چلے بیٹھے ہیں، کسی نے چند اشعار گا کر سنا دیے، اس میں کچھ خاص پیشہ ور قوالوں کی بھی حاجت نہ تھی، بہ کثرت آپ کو واقعات سلطان المشائخ ہی کے حالات میں ملیں گے کہ امیر خسرو نے یا ان کے صاحبزادے امیر حاجی نے پڑھنا شروع کیا کبھی شیخ نلی الدین پانی پتی جو قوال نہ تھے۔ وہ سناتے تھے، انتہا تو یہ ہے کہ حضرت شیخ کبیر کے حقیقی نواسے خواجہ محمد جو سلطان المشائخ کے باضابطہ پنجوقتہ نماز کے امام بھی تھے وہی سنا دیتے، کچھ اشعار کی بھی ضرورت نہ ہوئی، اگر ان میں لطف نہ آتا تو فرما دیتے کہ:

لہ شیخ الاسلام سیدنا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مروی ہے فرماتے تھے کہ دھمکی بھی کو اسی چیز کی دی جاتی ہے جس کا خواہشمند ہو، قرآن کی ایسی دھمکیاں کہ حق تعالیٰ اس کی طرف نگاہ نہیں کریں گے یا تجلیات سے دن اپنے محبوب سے محجوب ہوگا یہ بھی اسی وقت ہو سکتی ہے جب مانا جائے کہ آدمی کی فطرت میں اس کی تڑپ موجود ہے، فرماتے تھے اوروں کا حال تو معلوم نہیں لیکن میرے لیے تو جہنم اور اس کے عذاب کی دھمکیوں سے لا ینظر الیھم کی دھمکی زیادہ زہرہ گداز ہے۔ ۱۲

"سماع را بدایۂ و بہ حکایات و آخر بگاں	سماع ختم کریں اور بزرگوں کے قصوں اور
مشغول شوید" ص ۲۰۱ سیر الاولیا۔	واقعات میں مشغول ہوں۔

اور اب تو اس کا دستور نہ رہا،

خواجہ ممشاد کا خواب لیکن خواجگان چشت کے ایک مشہور رکن رکین خواجہ ممشاد علوم دینوری کے زمانہ سے یہ روایت چلی آتی تھی، ان کا بیان تھا، کہ خواب میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کو زیارت ہوئی تھی، اس وقت انہوں نے سماع کے متعلق دریافت کیا کہ حضور کو ہمارا یہ (لقہ) اشعار سننے کا ناپسند ہے کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ نہیں میں ناپسند تو نہیں کرتا لیکن۔

قل لھم یفتحون قبلہ بالقرآن و	لوگوں سے کہو کہ وہ قرآن سے آغاز کریں
یختمون بعدہ بالقرآن (سیر الاولیا، ص ۴۹۲)	اور قرآن ہی پر ختم کریں۔

لیکن افسوس کہ بہ تدریج یہ رسم غالباً مٹ گئی، اور اب تو سماع کی مجلسوں کا جو حال ہے، اچھا ہی ہوا کہ قرآن کو ایسی مجلسوں سے الگ کر دیا گیا۔

پہلے زمانہ میں سماع کے قواعد بہر حال جس قسم کے سماع کا رواج خواجگان چشت کے معماران اولین میں تھا، اس کی نوعیہ حالت تھی اور مقصود اس کا وہی تھا، جو میں نے عرض کیا، حسن علا سنجری نے سلطان المشائخ کی زبانی نقل کیا ہے کہ:

"مردم را ہر روز حضور کجا میسر است اگر	لوگوں کو ہر دن حضور کہاں میسر ہوتا ہے
روزے وقتے خوش وقت دیافت ہمہ اوقات	اگر کسی دن کوئی اچھا وقت آگیا تو تمام
متفرقہ آں روز پناہ آں وقت باشد"	متفرقہ اوقات اس دن اس وقت کی پناہ
فوائد الفواد۔ (ص ۹۶)	بنا رہے،

اسی کے ساتھ ظاہر ہے کہ خوش الحانی کے ساتھ اشعار سننے کو صرف جائز سمجھتے تھے نہ کہ

فرض وواجب، یا سنت ومستحب آپ کا یہ ضرور خیال تھا کہ جو لوگ اس طریقہ سے بھی اشعار سُننے کو حرام سمجھتے ہیں، تو ان لوگوں کو بھی اس پر اتنا اصرار نہ کرنا چاہیے، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ:

"خود نشنود اما با دیگراں خصومت نہ کند"	خود نہ سنیں مگر دوسروں کے ساتھ جھگڑا
فوائد ۔ص ۲۲۸	بھی نہ نکالیں۔

اور یہ منافع تو وہ تھے جو اشعار سننے سے ان بزرگوں کے پیش نظر تھے، لیکن اوروں کا تو میں نہیں کہتا،

سلطان المشائخ کے اشعار سننے کی وجہ

البتہ سلطان المشائخ نے جس طریقہ سے اس سماع کو سُنا ہے، جو کیفیت ان پر طاری ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان ہی تک محدود نہیں رہتی تھی، واللہ اعلم بالصواب کیا حال تھا، اور لوگوں کا بیان ہے کہ:

"دراں ایام ہر بیتے وصوتے کہ حضرت سلطان	ان دنوں میں جو شعر یا آواز کہ حضرت سلطان المشائخ
المشائخ را در سماع ذوق دادے آں	جس سے دلچسپی لیتے تھے وہ آواز اور وہ شعر ایک
صورت وآں بیت مدتے مدید درمیان	زمانے تک لوگوں کے درمیان مشہور رہتا، چھوٹا بڑا
خلق مشہور شدے، خورد بزرگ وضیع	شریف ورذیل، مجمعوں میں، محلوں اور گلیوں میں
وشریف در مجمعہا ومحلتہا وبخلہا د	اس سے حظ حاصل کرتے تھے۔
کوچہا ذوقہا می گرفتند"	

اسی کے بعد لکھا ہے کہ:

"کار محبت وعشق را وز بازادے در جہاں	عشق ومحبت کے کام کے لئے ہزاں دنیا
پیدا آمدے" (سیر الاولیار ص ۵۰۱)	میں ایک بازار پیدا ہوتا۔

یہ اس شخص کا بیان ہے جو اس زمانہ میں خود موجود تھا،

سلطان المشائخ سے مرید ہونے والے

آپ اس کے ساتھ علاء الدین خلجی کے اس مشہور فقرہ کو ملائیے جس کے ناقل بہت سے لوگ ہیں،
یعنی سلطان المشائخ کی دن دونی مقبولیت کو دیکھ کر گو دوسروں کے اشارے سے سہی لیکن اس کو خطرہ ہوا کہ سلطان المشائخ کی موجودہ مقبولیت عامہ روز بروز افزوں ہے۔ کوئی سیاسی کروٹ نہ لے علاء الدین کے یہ الفاظ نقل کیے جاتے ہیں۔

• مقربان ملازم وجوانب تخت من وسائر خلق بندہ و مرید او (سلطان المشائخ) شدہ اند حیلہ باید انگیخت تا از ضمیر او چیزے ما را روشن شود" (سیر الاولیاء ص ۱۴۳)

علاء الدین نے اس کے لیے جو حیلہ کیا مجھے اس سے بحث نہیں ہے، بلکہ بتانا یہ ہے کہ عہد علائی کے اکثر امراء وملوک وعمائد سلطان المشائخ کے مرید ہو گئے تھے، حتی کہ خود علاء الدین کا ولی عہد خضر خاں جسے دیول رانی کے قصہ کی وجہ سے امیر خسرو نے ذکر دوام کی سند دے دی ہے وہ بھی حضرت کے خاص مریدوں میں تھا، میر خورد اسی زمانہ کے آدمی ہیں، ان کی بھی یہی شہادت ہے :۔

"خلقے از علماء ومشائخ وامراء وملوک	علماء ومشائخ اور امراء وملوک میں
مرید آں حضرت گشتند"	بہت سارے آپ مرید ہو گئے۔

بہرحال اتنا تو سب ہی کو مسلم ہے کہ عہد علائی وہ زمانہ ہے جس میں حق تعالیٰ کی طرف سے سلطان المشائخ کے حسن قبول کا آفتاب سمت الراس پر پہنچ چکا تھا، مسلمانوں کا عام رجحان ان ہی کی طرف تھا، ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کا پیشہ فوجی خدمت ہی تھا، حضرت والا کے دونوں مشہور شاعر مرید امیر خسرو اور امیر حسن علاء ان دونوں بزرگوں کو بھی ہم مختلف فوجی مہموں میں شریک پاتے ہیں

سلطان المشائخ کے عہد میں فتوحات

ان واقعات کے بعد ایک تاریخی سوال ہے جو آج ہی نہیں جب سے واقع ہوا ہے اٹھایا گیا ہے، میرا مطلب

یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ پڑھنے والوں پر یہ مسئلہ مخفی نہیں ہے اجیسا کہ طباطبائی نے بھی لکھا ہے :-

فتوحاتیکہ در اطراف ممالک سندھ و دکن سلطان را میسر آمد و احداث عمارات و آذخار خزائن در کمال وفور در عہد او صورت گرفت ہیچیک از سلاطین ہند را دست نداد صفحہ ۱۱۹

ممالک سندھ اور دکن میں جو فتوحات سلطان کو حاصل ہوئیں اور اسی طرح عمارات کی ترقی اور خزائن کا وافر طور پر جمع ہونا جو اس کے عہد میں ہوا یہ چیز کسی اور بادشاہ کے زمانہ کو میسر نہ ہوئی۔

جمع کرنا ۱۲

واقعہ یہ ہے کہ علاء الدین ہی کے زمانہ میں اسلام کی راہ دکن میں کھلی، اسی نے چتوڑ، رنتھنبور کے ناممکن التسخیر قلعوں کو فتح کیا، جنوبی ہند میں، نہ صرف دیوگڑھی کے مشہور قلعہ کو اس نے فتح کیا، بلکہ ورنگل کی حکومت بھی اسی کے ہاتھ سے مسخر ہوئی، اور بقول بداؤنی،

در ۷۱۰ھ ولایت معبر مدراس تا دہور سمند[1] در حوزہ تصرف اہل اسلام در آمد جلد ۱ صفحہ ۱۹۶

۷۱۰ھ میں مدارس و دہور سمند تک اہل اسلام کے قبضہ میں آیا۔

حتیٰ کہ اپنی اسی فوجی قوت پر اس کو اتنا ناز ہوا کہ پہلے تو دماغی فتور میں مبتلا ہوا کہ کوئی نیا مذہب ہی جاری کرے، لیکن جب علاء الملک نے اس کی تفہیم کی تو اس سے باز آیا، پھر اس کا خیال جمانے لگا کہ:

مانند سلطان سکندر رومی بہ تسخیر اقالیم سبعہ پرداز د و فرمود تا او را سکندر ثانی در خطبہ خوانند و در سکہ نیز ہمیں لفظ داخل کرد (نبر المتاخرین ص ۱۱۷)

سکندر رومی کی طرح اقالیم سبعہ پر قبضہ کرے اور اس نے حکم دیا کہ خطبہ میں اس کو سکندر ثانی کہا جاتا اور سکہ میں بھی یہی لفظ لکھا جائے۔

---

[1] اب میسور کا ایک غیر مشہور قصبہ "دہور سمند" کا شہر ہے کسی زمانہ میں اس علاقہ کا یہی مرکزی مقام تھا ۱۲

گو علاء الدین اس ارادہ سے بھی باز آ گیا، اور اسی کے مقابلہ میں ہندوستان کے باقی ماندہ حصوں کے فتح کا عزم کیا جس میں وہ کامیاب ہوا، لیکن علاء الدین تو خیر مر گیا، اور اس کی موت کے بعد حکومت کا نظام کچھ درست نہ ہو سکا لیکن علاء الدین کی موت کے کل نو سال بعد اسی فوجی قوت کے بھروسہ پر جو اس زمانہ میں ہندوستان میں مہیا ہو گئی تھی، محمد تغلق بھی وہی:

"چوں سکندر رومی اقالیم سبعہ را تسخیر نماید" (ص ۱۲۵) — سکندر رومی کی طرح اقالیم سبعہ کی تسخیر کرے۔

کا قصد مصمم کرنے لگا۔

عہد علائی کی فتوحات کی وجہ

یقیناً سوال ہوتا ہے کہ آخر ہندی فوجیوں میں یہ بے نظیر طاقت جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے، اور نہ اس زمانہ کے بعد اس کے اسباب کیا تھے، واقعہ یہ ہے کہ اگر ہندی حکومت کی قوت اس زمانہ میں اتنی قوی نہ ہوتی۔ تو تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ تاتاریوں کے مسلسل حملوں کی مدافعت ناممکن تھی، ہر برس دو برس کے بعد ٹڈی دل کی شکلوں میں چنگیز خانی تاتاری کفار ہندوستان کے اسلامی ملک میں سر نکالتے تھے، لیکن ہر بار ان کو بری طرح ہزیمت اٹھا کر واپس جانا پڑا، تاتاریوں کا یہ ہجوم جب آتا تھا تو لاکھ دو لاکھ سے کم نہ ہوتا تھا۔ تفصیلات کے لیے اس عہد کی قدیم تاریخیں پڑھیے، میں نے جیسا کہ عرض کیا، یہ سوال نیا نہیں بلکہ پرانا ہے، ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں بھی اس کا ذکر کیا ہے یعنی عہد علائی کے حیرت انگیز فتوحات اور مدافعات دونوں کے متعلق جو توجیہیں کی جاتی تھیں وہ یہ تھیں، ملا صاحب کے بجنسہ الفاظ یہ ہیں۔

"ایں فتوحات را بعضے حمل بر استدراج — ان فتوحات کو بعض استدراج پر

(یعنی ظالم کی خدا نے رسّی دراز کی ہے)

وبعضے برکرامات سلطان علاء الدین
می کردند وبعضے امن وامان عہد راز برکات
بے نہایت سلطان المشائخ نظام الاولیاء
قدس سرہٗ می دانستند

حمل کرتے ہیں اور بعض سلطان علاء الدین
کی کرامت شمار کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس زمانہ
کے امن وامان کو سلطان المشائخ کی بے
پایاں برکات کا ثمرہ قرار دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ علاء الدین نے اپنے مربی وسرپرست چچا وخسر سلطان جلال الدین[1] خلجی
جیسے نیک، دیندار بادشاہ کو انتہائی سفاہت کے ساتھ ضرور قتل کیا تھا لیکن

لیس ھٰذا اول قارورۃ انکسرت
فی الاسلام

لیکن یہ پہلا شیشہ نہ تھا جو اسلام میں
ٹوٹا تھا۔

کوئی پہلا آبگینہ نہیں تھا، جو اسلام میں ٹوٹا تھا، پھر علاء الدین ہی کے ساتھ

---

[1] اصل قصہ تو تاریخ میں پڑھیے لیکن اس لیے کہ بسا اوقات معمولی عورتوں کے خاندانی جھگڑے کہاں تک پہنچ جاتے ہیں، اتنا ذکر کر دینا چاہتا ہوں کہ سلطان جلال الدین خلجی جو بڑے دیندار سلمان تھے، انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی علاء الدین اپنے بھتیجے سے کر دی تھی، لیکن علاء الدین کی ساس اور اس کی بیوی دونوں کی علاء الدین سے نہیں بنی تھی، اسی خانگی زندگی کی تلخیوں سے مجبور ہو کر اپنے علاقہ کڑہ مانک پور سے گویا اچانک تھوڑی سی فوج لے کر جنوبی ہند کی طرف غائب ہو گیا، جس کی جلال الدین کو بھی خبر نہ تھی (اب خدا شرے برانگیزد کہ خیرے بادراں باشد) علاء الدین کے ساتھ جو فوج تھی وہ سرفروشوں کا ایک مجمع تھا، دکن میں جو بھی ان کے سامنے آیا، ٹھہر نہ سکا اس غیر متوقع کامیابی کے بعد علاء الدین پھر اپنے علاقہ میں واپس آیا اور خانگی تلخیوں کے مٹانے کی کوئی تدبیر اس کے سامنے بجز اس کے نہ تھی کہ اس نمک حرامی اور سنگدلی پر آمادہ ہو جائے جس کا ذکر عام تاریخوں میں ہے یعنی سلطان جلال الدین کو بڑی بے رحمی کے ساتھ اس نے قتل کر دیا، اور خود تخت ہند پر متمکن ہو گیا۔ ۱۲۔

استدراج کے کیا معنی ہو سکتے تھے، نیز فوجی طاقت کا یہ ناز تو محمد تغلق تک باقی تھا، اگر قوت محسوس نہ ہوتی تو ہفت اقلیم کی فتح کا غلط ارادہ بھی کیوں پیدا ہوتا، رہی علاء الدین کی کرامت سو ظاہر ہے کہ گو بعد کو وہ تائب ہو گیا تھا، شراب بھی اس نے چھوڑ دی تھی لیکن با ایں ہمہ ایک معمولی دنیادار بادشاہ سے زیادہ حیثیت اس کی کبھی نہ رہی۔

مسلمانوں میں جاں فروشی کا جذبہ اور اس کی وجہ

پھر آپ کو خود ہی سوچنا چاہیے کہ اس عہد کے مسلمانوں میں جاں فروشی، جانبازی کی ایسی بے پناہ قوت کہاں سے آگئی تھی، کہ بڑے سے بڑے قلعے جو برسوں میں فتح نہیں ہو سکتے تھے، ہفتہ دو ہفتہ میں ان کا سقوط ہو جاتا تھا، حوصلوں کی وہ بلندی کہ آج دلی میں ہیں، کل لکھنوتی، پرسوں دیوگڑھ میں، چوتھے دن کھمبائت معبر اور نگل کے قلعوں کے نیچے ان کے گھوڑے ہنہنا رہے ہیں، رعب کی یہ حالت کہ آنکھ ملانے کی ہمت بھی دشمنوں کو نہیں ہوتی، ایک طرف یہ حال ہے، دوسری طرف تاتاریوں کا سیلاب آتا ہے اور سرحد ہی پر یا جس مقام پر وہ ظاہر ہوتے ہیں وہیں روک دیئے جاتے ہیں۔

یہ واقعات ہیں خیالات نہیں ہیں، پھر انقلاب کی وجہ کیا ہوئی؟ یہ قوت مسلمانوں میں کس سرچشمہ سے بھری گئی۔

بات یہ ہے کہ یوں کہنے کو تو جو کچھ کہا جائے اور کہنے والوں نے جب علاء الدین کی کرامت ہی کا دعویٰ کیا ہے تو ظاہر ہے اور جو توجیہہ بھی کی جائے گی وہ اس سے زیادہ کیا تعجب انگیز ہوگی؟

سلطان المشائخ کی برکات

جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس میں سلطان المشائخ کے وجود کو جیسا کہ اس زمانہ میں بھی محسوس کیا گیا تھا ہندوستان

کی "فوجی قوت" کی اس خاص کیفیت کے پیدا کرنے میں ان کو بالکل بے تعلق نہیں کہا جا سکتا، اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جسے ہم ماورائے عقل قرار دیں، بلکہ واقعہ وہی ہے، جس کا ایک دفعہ نہیں، متعدد بار تجربہ کیا گیا ہے اور جس کا جب جی چاہے۔ تجربہ کر لے۔ وہ قرآنی آیات اور اس کی تعلیمات کا بے پناہ زور ہے، آپ سن چکے کہ سلطان المشائخ جس شعر سے خاص ذوق و مستی کی حالت میں آجاتے تھے اور وہ زیادہ تر۔

فاعلم انہ لا الٰہ الا اللہ　　　　پس جان لے کہ نہیں ہے "الٰہ" مگر اللہ ہی

کا فارسی ترجمہ ذرا شاعرانہ رنگ میں ہوتا تھا، اسی وقت وہ شعر سارے شہر بلکہ بلکہ میں مشہور ہو جاتا تھا، گلیوں میں کوچوں میں لوگ اسی کو دہراتے پھرتے تھے، سلطان المشائخ کے جن حالات کے ساتھ ان خاص اشعار کی شہرت مسلمانوں میں ہوتی رہتی تھی کیا یہ ممکن تھا کہ جس دل میں ایمان کا حبہ خردل بھی ہوتا ہوگا، اس کا سینہ سلطان المشائخ کی اس بھڑکائی ہوئی آگ سے بھڑک نہ اٹھتا ہوگا، سلطان المشائخ کے زمانہ میں قرامنائے ہند کے قدیم جغرافیہ میں جو عظیم انقلاب برپا ہوا، ایک مستقل کتاب کا مضمون ہے، کاش! اس پر کچھ لکھا جاتا،

چندیری کی فتح

صورت حال کے اندازہ کے لیے میں "چندیری" کی فتح کے سلسلہ میں اس واقعہ کا ذکر کرتا ہوں، جسے میر خورد نے خود سلطان المشائخ کی زبانی نقل کیا ہے، یعنی۔

در عہد علائی والی از بادشاہ برائے فتح چندیری با لشکر بسیار متعین شد و او (والی) از معتقدان حضرت سلطان المشائخ بود"	عہد علائی میں بادشاہ کا ایک گورنر چندیری کی فتح کے لیے ایک بڑے لشکر کے ساتھ متعین ہوا اور یہ گورنر حضرت سلطان المشائخ کے معتقدوں میں سے

میر خورد نے لکھا ہے کہ والی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، اور التماس کیا۔

"اگر یارے (خلفائے خاص میں سے کوئی خلیفہ) از حضرت سلطان المشائخ نیز بر ما نامزد شود"

اگر حضرت سلطان المشائخ کا کوئی خصوصی خلیفہ بھی اس مہم میں ہمارے ساتھ کر دیا جائے تو بہت بہتر ہے

حضرت والا نے مولانا وجیہ الدین یوسف کو لشکر کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔

"بعد ولایت چندیری رواں کرد" ولایت چندیری میں ان کو روانہ کیا۔

اب خدا ہی جانتا ہے کہ حضرت کے یہ خلفاء فوج میں کس قسم کے جذبات پیدا کر لیے تھے کہ:

"در اندک روز فتح آں مقام شد" بہت کم دنوں میں وہ مقام فتح ہو گیا،

آج اس غریب چندیری کا تو بہتوں کو نام بھی معلوم نہ ہوگا، لیکن جس زمانہ میں مسلمانوں کو اس علاقہ پر کشمکش کرنی پڑی تھی اس کا حال تاریخوں میں پڑھیے ہر ہر پرگنہ جس کا سنگین اور خشتین قلعوں سے پٹا ہوا تھا، ابوالفضل نے صرف اس علاقہ کا جس کا نام اس زمانہ میں بارہ تھا، لکھا ہے:

"محل[1] و ہزنج پرگنہ قلعہ دارند، ازاں جملہ چہار سنگین و پرگنہ مال خشتین"

چندیری اور اس کا علاقہ

خود چندیری خاص اور اس کے قریب للت پور جھنوارہ ہر جگہ "قلعہ سنگین" بنے ہوتے ہیں، لیکن اس علاقہ کی قلعہ کشائیوں کا جو کام برسوں میں بھی انجام نہیں پا سکتا تھا، بلبن کی قاہرہ حکومت بھی چندیری کی فتح سے مایوس ہو چکی تھی، آپ سن چکے کہ "در اندک روز فتح آن مقام شد" اور کیا صرف فتح کر کے ہی یہ سرزمین چھوڑ دی گئی؟ مجھے ذاتی علم تو نہیں ہے لیکن ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس علاقہ کے صرف ایک مرکزی شہر چندیری کے متعلق لکھا ہے کہ

[1] محل اور پانچوں پرگنے میں قلعے تھے، ان میں سے چار پتھر کے تھے اور پرگنہ مال پکی اینٹ کا۔

فارسی	اردو
از بزرگ شہرہائے باستانی زقدیم ہندا	قدیم ہندوستان کے بڑے شہروں میں سے
قلعہ سنگین دارد چہار دہ ہزار سنگین	یہ بہت مضبوط قلعہ ہے چودہ ہزار سنگین
خانہ بزرگ و سہ صد ۳۸ و ہشتاد بازار و سہ	مکان، تین سو اسّی بازار تین سو ساٹھ سرائیں
صد و شصت ۳۶ فراخ سرا و دوازدہ ہزار ۱۲	اور بارہ ہزار مسجد یں اس شہر
مسجد ص ۳۰۹	میں ہیں۔

آپ چودہ ہزار سنگین کوٹھیوں اور تین سو اسّی بازار تین سو ساٹھ سراؤں کے متعلق جو چاہے رائے قایم کیجیے خواہ انھیں قبل الاسلام یا بعد الاسلام کے کارناموں میں شمار کیجیے لیکن اک گمنام شہر کی بارہ ہزار مسجدوں کی توجیہ میں بھی کیا اس کے سوا کچھ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا محمد یوسف وجیہ الدین کے سوا یہ مسجدی مذاق کسی اور کا پیدا کیا ہوا تھا۔ تاریخ جب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ:

فارسی	اردو
"خلق چندیری بخدمت مولانا محمد یوسف	چندیری کے باشندوں نے مولانا
توجہ کرد" سیر الاولیاء ص ۲۸۷	یوسف کی خدمت میں حاضر ہو کر توجہ کی
	درخواست کی،

میر خورد اپنی چشم دید گواہی کا بھی اضافہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

فارسی	اردو
کاتب حروف ایں بزرگ را دریافتہ بود	راقم الحروف ان بزرگ صاحب سے واقف
ذوق مجلس اوگرفتہ بیشترے خلق چندیری	اور آپ کی مجلس سے فیض اٹھائے ہوئے
مریدان او اند" ص ۲۰۰	ہے چندیری کے زیادہ لوگ آپکے مریدوں میں
	داخل ہیں۔

سچی بات یہی ہے کہ حضرت سلطان جی کے زمانہ میں ایمانی عواطف وجذبات کو بیدار کر کے جب قرآنی یقین کے قابو میں ان جذبات کو کر دیا جاتا تھا،

"از بہر تو میرم از برائے تو زیم" — تیرے ہی لیے مروں اور تیرے ہی لیے جیوں۔

کی تکبیر سے جو آگ پیدا ہوتی تھی، اسے عقل؛

اِنَّ صَلَاتِی وَنُسُکِی وَمَحْیَایَ	میری نماز میری قربانی میری زندگی میری
وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔	موت سب کچھ جہانوں کے پالنے والے
	اللہ ہی کے لیے ہے۔

کے قطعی یقین کی گرفت میں دے دیتی تھی، اور گو "قرآن" کی "یہ روح" بظاہر چند لفظوں کا مجموعہ ہے لیکن سارے مخلوقات سے ٹوٹ کر واقعی اپنی پرورش کرنے والی لامحدود قوت کے ساتھ جو جٹ جاتا ہے، کیا دنیا بھر کی پھر کوئی طاقت اس کو نیچا دکھا سکتی ہے۔

وَمَنْ یَّکْفُرْ	اور جس نے طاغوت (خدا سے ہٹانے
بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ	والی قوتوں سے رشتہ توڑا یعنی لا الٰہ کا مقام
بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ	طے کیا، اور اللہ کو اس نے مان لیا (الا اللہ
بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی	پر ڈٹ گیا) تو اس نے ایک ایسے
لَا انْفِصَامَ لَھَا	مضبوط کڑے کو تھاما ہے جس میں مسک بھی
	پیدا نہیں ہو سکتی۔

سلطان المشائخ کی برکت

میں یہ نہیں کہتا کہ حضرت سلطان المشائخ جان بوجھ کر اس ذریعہ سے ہندوستان کی فوجی قوت کو بڑھانا چاہتے تھے، میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ان کے عشق جہاں سوز کے جو واقعات کتابوں میں ملتے ہیں، جس قوت سے انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تھاما تھا، یقین کے جس نہ کھسکنے والی چٹان .... پر انہوں نے قدم جمایا تھا، ان کے زمانہ میں انسانیت کو اپنے مالک کے قدموں پر جس اضطراب و بے تابی سے تڑپتے ہوئے ہندی مسلمانوں کی شکل میں پایا گیا تھا، ایمان کا یہ ذوق، یہ وارفتگی، یہ شوق پر ولولہ، شاید اس

ملک کو نہ اس سے پہلے نصیب ہوا، اور نہ بعد، پھر اگر اس کے نتائج بھی بےمثال ہیں تو آخر آپ ہی بتائیے کہ اور ہوتا ہی کیا؟

وَلَئِنْ مُتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۔ آل عمران	اگر تم مر گئے یا قتل ہو گئے، تو اللہ ہی کی طرف اٹھائے جاؤ گے۔

کے غیر مشتبہ علم کا دباؤ، بھڑکے ہوئے جذبات پر پڑ جاتا تھا، تو کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ

سَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ آل عمران	لپکو اپنے مالک کی آمرزش اور بخشائش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی فراخی آسمانوں اور زمین کی فراخی جیسی ہے،

کی تعمیل میں پھر کوئی پس و پیش کر سکتا تھا،

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ)	مول لے چکا ہے اللہ ایمان والوں سے ان کی جانوں کو اس معاوضہ میں کہ انہیں "الجنۃ" ملے گی۔

کے "وعدہ" کے متعلق کسی مومن کا ایمان مجمل مفصل بن بن کر اگر ان خوارق و نوادر کا ظہور ان سے کراتا تھا جن کا مشاہدہ ہم اس زمانہ میں کر رہے ہیں تو جذبات و عقل و ایمان تینوں کے باہمی اجتماع کا ہمیشہ لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے، افسوس ہے کہ بعد کو صرف جذباتی ہیجانات تو رہ گئے لیکن عقل "یقین" کے جس لازوال سرچشمہ سے سیراب ہو کر ان جذبات کو عملی پیکروں میں جلوہ گر کرتی تھی، بہ تدریج اس کا قرآن سے تعلق ٹوٹتا چلا گیا، اور آخر میں وہی سماعی اشعار جن سے عمل پیدا ہوتا تھا، صرف ایک وقتی ہیجان اور کیفیت پیدا کر کے عمل کے میدان میں اپنے سارے زور و شور کھو بیٹھے تھے، اور وہی بات صادق آتی تھی، جو ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ:

الفناء یلبت النفاق	گانا نفاق اگاتا ہے۔

وجدو حال کی مجلسوں کے سارے دعوے اعمال کے حلقوں میں پہنچ کر ایسی صورت میں جھوٹ بن جاتے ہیں اور رغ فی الشمس ما یغنیک عن زحل۔ اور یہ تو آپ دیکھ رہے ہیں، جو کچھ دیکھ رہے ہیں، اسے دیکھ کر آپ جو چاہے رائے قائم کیجئے، لیکن آپ جو کچھ سن رہے ہیں، آپ کو جو کچھ اب تک سنایا گیا ہے کیا ان شنیدوں پر اپنے دیدوں کا قیاس کرنا صحیح ہوگا، کسی نے شیخ کبیر شکر گنج سے ذکر کیا کہ مشائخ چشت کے طریقہ سماع پر بعض علماء کو اعتراض ہے، فرمانے لگے:۔

"سبحان اللہ یکے سوخت و خاکستر شد و دیگرے ہنوز در اختلاف ست"	سبحان اللہ! کوئی تو جل کر خاک ہو گیا اور دوسرے ابھی بحث و اختلاف میں ہیں۔

شکر گنج کی بوقت وفات کیفیت

آج کیا دیکھا جا رہا ہے۔ اور کل کیا دکھا گیا تھا، دونوں میں کوئی نسبت بھی ہے، پچانوے سال کے بعد شیخ کبیر شکر گنج کی اس ناسوتی دنیا میں آخری رات تھی، سلطان المشائخ راوی ہیں:

نماز خفتن (عشاء) بجماعت بگزارد بعد ازاں بیہوش گشت ساعتے بہوش آمد پرسید کہ نماز خفتن گذاردہ ام گفتند آرے، گفت یکبار دیگر بگذارم کہ داند چہ شود، دوم کرت نماز بگذارد باز بے ہوش شد ایں بار بے ہوشی بیش تر شد باز بہوش آمد پرسید کہ نماز خفتن گذاردہ ام گفتند بود بارہ گذاردیدم (تکملہ سیر الاولیاء ص ۸۹)	عشا کی نماز جماعت کے ساتھ ادا فرمائی اس کے بعد بے ہوش ہو گئے تھوڑی دیر بعد ہوش آیا دریافت فرمایا کہ میں عشا کی نماز ادا کر چکا ہوں، لوگوں نے کہا جی ہاں ادا فرما چکے، فرمایا دوسری مرتبہ میں ادا کر لوں کل کو معلوم کر کیا ہو گا دوسری مرتبہ بھی نماز ادا کی پھر بے ہوشی طاری ہو گئی بہت دیر تک اسی حال میں رہے پھر ہوش آیا دریافت کیا کہ میں عشا کی نماز ادا کر چکا، لوگوں نے کہا دو مرتبہ ادا کر چکے،

الغرض یوں ہی پچانوے سال کی مشق سجدہ گزاری انہیں ہوش آنے کے بعد پھر اسی کام پر مجبور کرتی تھی جس کے لیے عمر بھر جیتے رہے، غالباً تین دفعہ یہ صورت پیش آئی، بعد ازاں "برحمت پیوست" اور اسی سیرت فریدی میں فانی ہو کر جس نے بقا حاصل کی تھی، ایک کم نوے سال (۸۹) کی عمر پائی تھی، ان ہی سلطان المشائخ کا بھی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں یہ حال تھا،

بہنجوقت نماز بجہت جماعت از بالائے بام	جماعت کی نماز کے لیے پانچوں وقت
جماعت خانہ کہ عمارتے بس رفیع است	کوٹھے سے جو بلند ہے نیچے تشریف لاتے
فرود آمدے و با درویشاں و عزیزاں	اور درویشوں اور عزیزوں کے ساتھ
کہ درآں جمع ملکوت حاضری شد نماز	جو موجود ہوتے نماز ادا
گزاردے۔ (سیر الاولیاء ص ۱۲۴)	کرتے۔

اور "عمارتے بس رفیع" سے پانچوں وقت نیچے اتر کر جماعت کی شرکت عموماً روزہ کی حالت میں ہوتی تھی، کیونکہ یہ تو صحیح نہیں ہے کہ آپ ایام محرمہ کے سوا ہمیشہ روزہ دار رہتے تھے، لیکن یہ صحیح ہے کہ مہینے کے زیادہ دن روزوں ہی میں بسر ہوتے تھے، علاوہ ان خاص مریدوں کے جن کا لقب آپ کے علقہ "میں یاران نظام الدین" تھا، اور جن کی تربیت کی شرط حضرت کے نزدیک۔

"در صحبت ما باش، یا با در صحبت تو باشیم"	ہماری صحبت میں رہو یا پھر ہم تمہاری
ص ۱۲۱	صحبت میں رہیں۔

ان یاران خاص کے سوا آپ نے بیعت کے دائرہ کو جب بہت زیادہ وسعت دے دی تو مولانا ضیاء الدین برنی جو آخر میں حضرت ہی کے آستانہ پر آگر پڑ گئے تھے، ان کا بیان ہے کہ حضرت نے ایک دن مجھ سے اس بیعت عام کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا، آپ نے پہلے تو اس مسئلہ کی ایک مختصر تاریخ بیان کی جس کا

حاصل یہ ہے کہ ابتداء میں مشائخ طریق اُن ہی لوگوں کی تربیت فرماتے تھے، جو بالکلیہ ہر چیز سے الگ ہو کر صرف اللہ اور رسول کے دین کی خدمت میں مستغرق ہو نا چاہتے تھے، لیکن شیخ شہاب الدین سہروردی شیخ ابوسعید ابوالخیر سیف الدین باخرزی کے زمانہ سے بیعت توبہ اور تبرک کا رواج بھی جاری ہوا، شیخ کبیر شکر گنج نے بھی یہی مسلک اختیار فرمایا، اس کے بعد سلطان المشائخ نے فرمایا کہ میں بھی اپنے شیخ کی اتباع میں اب یہی کرنے لگا ہوں، پھر آپ نے فرمایا کہ:

"تو اثری شنوم کہ بسیاراں از در آمدن ارادت من، دست از معیتے میدارند و نماز بجماعت می گذارند و باوراد و نوافل مشغول می باشند"	میں تو اثر کے ساتھ سنتا ہوں کہ مرے حلقہ ارادت میں داخل ہونے سے بہت سے لوگ گناہ سے ہاتھ روک لیتے ہیں اور باجماعت نماز ادا کرتے ہیں اور نوافل و وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

در دبھرے لہجے میں اس کے بعد ارشاد ہوا۔

"می بینم مسلمانے بعجز و اضطراب و مسکنت و بیچارگی برمن می آید و می گوید کہ از جملہ گناہاں توبہ می کنم من بہ نیت آں کہ شاید سخن او راست باشد دست بیعت می دہم" (ص ۳۴۷)	میں دیکھتا ہوں کہ ایک مسلمان عاجزی اور بے چینی اور بیچارگی کے ساتھ میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمام گناہوں سے توبہ کرتا ہوں، میں اس خیال سے کہ یہ اپنی بات میں سچا ہو بیعت کر لیتا ہوں۔

پیری مریدی کا مقصد

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان بزرگوں کی اصلی غرض عام پیری مریدی سے کیا تھی؟ ہاں! جن کی ساری عمر اسی سوز و ساز دروں پیش میں گذری کہ جس طرح بھی ممکن ہو، پیغمبر کی امت کو پیغمبر کے قدموں تک پہنچا دیا جائے، سلطان المشائخ عموماً فرمایا کرتے کہ ہمارے طریق کی پہلی شرط یہ ہے کہ:

"طلب جاہ و کرامت نباشد"

صرف توبہ اور استقامت مطلوب ہے، پھر استقامت کا مطلب خود ہی یہ فرما

"استقامت می باید کہ بر متابعت رسول علیہ السلام والصلوٰۃ باشد و ہیچ مستحبے و آدابے از وے فوت نہ شود" (سیر الاولیاء ص ۳۴۸)

اس پر مضبوطی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کا پیرو رہے اور کوئی مستحب اور کوئی آداب میں سے اس سے نہ چھوٹے۔

یہی طریقہ میں داخل ہونے کی غرض تھی، لوگوں کو "مرگ" کے ساتھ پکڑا جاتا تھا تب جا کر کہیں "فرائض" نماز باجماعت وغیرہ کی "تپ" پر راضی ہوتے تھے، لیکن لیکن آج امت کی پچھلی نسلیں پہلی نسلوں پر لعنت کرتے ہوئے جسے پیغمبر نے قیامت کے ہولناک علامات میں شمار کیا ہے، ان ہی بزرگوں پر خلاف سنت بلکہ بعض تو خلاف اسلام تک چلنے کا فتویٰ لگا رہے ہیں، گذر چکا کہ آج اس کی ریسرچ ہو رہی ہے، کہ مسلمان صوفیوں نے افلاطن جدید مصری سے کیا لیا، یونانیوں سے کیا سیکھا، ایران کے آتش پرستوں سے کون کون سی چیز اخذ کی، ہندوستان کے جوگیہ کے کن کن اشغال و اعمال کو اپنے طریقہ میں داخل کیا، گویا اسلام کا خود اپنا کوئی سرمایہ کسی باب میں کچھ نہیں ہے، فقہ رومیوں اور ایرانیوں سے لی گئی، تصوف، اشراقیوں اور جوگیوں سے چرایا گیا، ظاہر و باطن کی تعمیر ان ہی دونوں چیزوں سے ہوئی ہے جب دونوں ہی میں ہمارے اکابر العیاذ باللہ منتحل اور سارق نکلے، تو پھر اپنا ہمارے پاس کیا رہ گیا، قرآن نے ہمیں کیا دیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں کیا ملا؟ مگر میں کیا کروں، ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گیا، ہندوستان کے سب سے زیادہ مشہور مرکزی صوفی سلطان المشائخ کا مطالعہ ایک زمانہ سے کر رہا ہوں،

نشست میں جوگیوں کی مخالفت اب تک ان کے متعلق ہمیں اس کا بھی ٹھیک طریقہ سے

پتہ نہیں چلا کہ وہ ذکر اور مراقبہ کے عام طریقہ کے سوا کسی خاص طریقہ ذکر یا مراقبہ کی بھی تعلیم دیتے تھے، مثلاً فلاں رگ دبائی جائے، فلاں عضو کو فلاں جگہ رکھا جائے وغیرہ۔ کچھ چیزیں اگر ملتی بھی ہیں تو اسی قسم کی، مثلاً ذکر ہو رہا تھا کہ مربع طریقہ کی نشست بنا کر، یعنی آلتی پالتی مار کر اگر کوئی بیٹھے، اور ذکر کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس طریقہ سے بیٹھ کر ذکر کرنے کی ایک صورت جائز ہے اور ایک ناجائز، جائز صورت کے متعلق الفاظ مبارک یہ ہیں،

"جائز خلاف نشستن جوگیان است که هر دو قدم زیر هر دو زانو باشد" (ص ۴۴۴)	جائز طریقہ یہ ہے کہ جوگیوں کی نشست کے خلاف ہو اس طرح کہ دونوں قدم دونوں زانو کے نیچے ہوں

ظاہر ہے کہ اٹھنے بیٹھنے کا معاملہ چنداں اہمیت نہیں رکھتا، اسی لیے جواز و عدم جواز کے الفاظ کو اولیٰ اور خلاف اولیٰ ہی پر محمول کیا جائے گا، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن بزرگوں کا حال یہ ہو کہ معمولی بات یعنی بیٹھنے کی ہیئت تک کے متعلق بھی ان کا خیال تھا کہ جوگیہ کی چونکہ وہ نشست ہے اس لیے مسلمانوں کو یہ طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے، انہی بزرگوں کے متعلق یہ کہنا کہ انہوں نے اپنا سارا طریقہ جوگیہ یا اشراقیہ کو دیکھ کر مرتب کیا ہے، کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے پہلے

---

(۱) مطلب یہ ہے کہ قرآن میں کثرت ذکر کا مطالبہ بار بار کیا گیا ہے، اسی کے ساتھ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ (اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے بیٹھے اپنے پہلوؤں پر) یعنی ہر طریقہ سے ذکر کی عام اجازت دی گئی، اب اگر بزرگوں کو کسی خاص طریقہ نشست یا طریقہ ادا وغیرہ سے تجربۃً وہ بات مفید معلوم ہوئی اور لوگوں سے ذکر اسی طریقہ سے کرانے لگے تو کیا وہ قرآن سے باہر گئے، سچ یہ ہے کہ قرآن نے جسے مطلق چھوڑا ہے آپ اس میں تعیین کس بنیاد پر کرتے ہیں ۱۲۔

بھی بعض اجزاء کا اس کے متعلق ذکر آ چکا ہے، کیا تماشے کی بات ہے، جس کے تربیت یافتوں کی یہ ذہنیت ہو، اور جس کی مجلس مبارک ہیں، اس حدیث کے متعلق جس میں ہے کہ کوئی مسافر اگر بیابان ٹاپو میں تنہا پڑ جائے، یا ایسی حالت میں کسی کی سواری کا جانور بھاگ جائے، تو ایک صحابی سے نہیں، ابن مسعود، ابن عباس، عقبہ بن غزوان، تین تین صحابیوں سے مروی ہے کہ ایسے وقت میں مسافر کو چاہیے کہ:

اعینوا یا عباد اللہ رحمکم اللہ	مدد کرو اے اللہ کے بندو، اللہ آپ پر رحم کرے

یا بعض روایتوں میں ہے۔

یا عباد اللہ اعینونی یا عباد اللہ اعینونی	اے اللہ کے بندو، میری مدد کرو، اے اللہ کے بندو میری مدد کرو۔

حصن حصین میں مصنف ابن ابی شیبہ اور طبرانی کے حوالہ سے اسے نقل کی[ا] ہے نووی نے کتاب الاذکار میں مسند بزار اور ابن السنی کا بھی حوالہ دیا ہے، محدثی[ن] کی ایک بڑی جماعت نے اس کی تحسین و توثیق کی ہے، اگرچہ بعضوں کو روایت ک[ے] بعض راویوں کے متعلق شک بھی ہے، تاہم شراح حدیث میں سے بعض معتبر لوگوں نے لکھا ہے مثلاً نووی ارقام فرماتے ہیں:۔

حکی لی بعض شیوخنا الکبار فی العلم انہ انفلتت بہ دابۃ اظنہا بغلۃ وکان یعرف ہذا الحدیث فقالہ فحبسہا اللہ علیہم	میرے بعض کبار اساتذہ نے مجھ سے بیان کیا یعنی علم می[ں] جن کا مقام بڑا تھا انہوں نے بیان کیا کہ ان کا جانور سوار[ی] چھوٹ پڑا، میں خیال کرتا ہوں کہ خچر تھا، ان بزرگ کو یہ حد[یث] معلوم تھی، وہی الفاظ انہوں نے دہرائے جو حدیث میں آ[ئے] ہیں، معاً جانور وہیں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا خود میں بھی ایک د[فعہ]

فی الحال وکنت مرۃ مع	لوگوں کے ساتھ تھا کہ جانور چھوٹ پڑا پکڑنے والے
جماعۃ فانفلتت بہیمۃ	عاجز ہو گئے ہیں نے اس وقت حدیث کے الفاظ کا
فعجزوا عنہا فوقفت	استعمال کیا جانور وہیں کھڑا ہو گیا اور کوئی سبب اس کے
فی الحال بغیر سبب	کھڑے ہونے کا پیش بھی نہ تھا بجز اس کے کہ حدیث کے الفاظ
سوی ھذی الکلام۔	استعمال کیے گئے تھے۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے آپ اندازہ کیجئے اس ذہنیت کا جو سلطان المشائخ کی صحبت مبارک میں پیدا ہوتی تھی، یعنی اسی "اعینونی یا عباد اللہ" والی روایت کا ذکر کرکے کوئی خارجی آدمی نہیں، بلکہ مقربین خاص میں جن کا شمار تھا، اور جو از سر تا پا سلطان المشائخ کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا، میری مراد خود جامع ملفوظات امیر حسن علا سنجری سے ہے وہی لکھتے ہیں کہ:

بندہ عرضداشت کرد کہ این دعا چگونہ است	بندہ نے عرض کیا کہ یہ دعا کیسی ہے
کہ مردمان می خوانند	جسے لوگ پڑھتے ہیں اعینونی یا عباد اللہ
"	رحمکم اللہ۔

پوچھنے کی کیا غرض تھی خود ہی لکھتے ہیں۔

"مقصود بندہ این بود کہ معونت از غیر خدا	بندہ کا مقصد یہ تھا کہ خدا کے سوا دوسرے
خواستن چگونہ بود" (فوائد الفواد ص ۱۴۵)	سے مدد چاہنا کیسا ہے۔

"معونت از غیر خدا خواستن چگونہ بود" بس مجھے صرف اسی فقرہ کی طرف توجہ دلائی ہے، باوجودیکہ دعا رحدیث کی ہے، ایسی حدیث بھی نہیں جو موضوع اور بالکلیہ بے سروپا ہو بلکہ گذر چکا کہ محدثین ثقات کا ایک طبقہ اس کی تحسین کرتا ہے، بلکہ اپنے مختلف تجربات سے اس کی تصدیق بھی کرتا ہے، خود طبرانی نے بھی اس حدیث کی روایت کے بعد:

وَقَدْ جُرِّبَ ذٰلِکَ — اس کا تجربہ بھی کیا گیا ہے۔

لکھا ہے یوں بھی کسی خاص شخص کو پکارا نہیں جاتا، بلکہ اللہ کا کوئی بندہ ہو، ملائکہ میں ہو، جن میں ہو، انسان میں ہو، کوئی بھی ہو اگر یہاں موجود ہو تو میری مدد کرے، اور پکارا بھی جاتا ہے تو معبود بنا کر نہیں بلکہ عباداللہ (اللہ کے بندوں) کے الفاظ سے پکارا جاتا ہے رحمکم اللہ (اللہ تم پر رحم کرے) کے الفاظ سے اس کی طرف بھی اشارہ موجود ہے، کہ ہماری طرح تم بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے محتاج ہو، اب اس کے ساتھ اس کو ملائیے کہ قرآن مجید کے

اِنْ کُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْهَا حَافِظٌ — ہر شخص پر ایک نگران یقیناً ہے۔

اِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ۔ — تم پر نگران ضرور ہیں

وغیرہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کے ساتھ ساتھ کچھ فرشتے بھی رہتے ہیں، حدیثوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ ملائکہ اطراف ارض میں گھومتے رہتے ہیں[1]، نیز روایتوں کا ایک مجموعہ حدیث کی کتابوں میں پایا جاتا ہے جن سے ابدال کے نظریہ کی تائید

نظریۂ ابدال کا ثبوت قرآن و حدیث سے

---

[1] ہر زمانہ میں طبقۂ صالحین کے بعض افراد کو ابدالیت کے مقام سے حق تعالیٰ سرفراز فرماتے ہیں، یہ ایک ایسا خیال ہے جو سلف سے خلف تک مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اس باب میں حضرت انس رح ابن مسعود، ابوذر رض، معاذ بن جبل، عوف بن مالک صحابیوں، اور ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وعنہا سے حدیث کی کتابوں میں روایتیں بھی نقل کی گئی ہیں، گو محدثین دائرہ نقد ان کی سندوں سے مطمئن نہیں ہیں، لیکن شارحین حدیث کہتے ہیں کہ حدیث کا بلوغ قدر مشترک جو مفاد ہے، اس کا انکار مشکل ہے یوں بھی امام بخاری، امام شافعی، احمد بن حنبل جیسے کبار ائمہ حدیث اپنی کتابوں میں اس قسم کے الفاظ (کہ فلاں بزرگ کا شمار ابدال میں تھا، یا مسلمانوں کا فلاں طبقہ ابدال کا طبقہ ہے) پائے جاتے ہیں کہتے ہیں کہ ہر زمانہ میں چالیس افراد کا مردوں اور چالیس ہی کا عورتوں میں سے اس روحانی خدمت کے لیے

(باقی اگلے ۲۴۳ پر)

ہوتی ہے، عام طور پر جنہیں رجال الغیب کہتے ہیں، اور ان سب کو بھی جانے دیجئے پکارنے والا تو پکارتا ہے کہ اللہ کے بندوں میں کوئی ہو تو آکر میری مدد کرے، کون جانتا ہے کہ کسی چلنے پھرنے والے یا جھاڑ جنگل میں کوئی آدمی ہی ہو جس کے کان میں آواز پہنچ جائے۔ جب عباد اللہ کا لفظ عام ہے تو سب ہی کی اس میں گنجائش ہے، اور شراح حدیث نے عموماً سارے احتمالات لکھے بھی ہیں، خود سلطان المشائخ نے امیر حسن علاء کو جو جواب دیا کہ:

"دریں عباد اللہ مسلمین و مخلصین مغرست" اس عباد اللہ میں مسلمان اور مخلص لوگ مخزیں یعنی اللہ کے نیک اچھے مخلص بندے مقصود ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان کا اشارہ ابدال والے رجال الغیب کی طرف ہو، یا یہی بات کہ ادھر ادھر کوئی اللہ کے اچھے نیک بندے ہوں وہ اس آواز کو سن کر پہنچ جائیں، بہرحال اس طریقہ سے عباد اللہ کو عون اور مدد کے لیے پکارنا ظاہر ہے کہ ایسی نامحسوس غیبی ہستیوں کا بھی پکارنا نہیں ہے جن کے وجود کا کوئی ثبوت[1] نہ ہو مگر آپ دیکھ رہے ہیں، توحیدی معرفت کے احساس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) انتخاب ہوتا ہے، کوئی ایک ان میں جب مر جاتا ہے تو اسی وقت کسی دوسرے سے اس جگہ کو معمور کر دیا جاتا ہے ابدال کہنے کی یہی وجہ بھی ہے کہ ہمیشہ ایک کی جگہ بطور بدل کے دوسرے کا انتخاب ہوتا ہے۔

[1] مثلاً اصنامی نظام والے بت پرستوں کا جو حال ہے کہ خود ہی کسی پتھر یا مٹی کے تودہ کو فرض کر لیتے ہیں کہ اس کے ساتھ فلاں روح کا تعلق ہو گیا، اور اپنی ساری امیدوں آرزوؤں کا ماوی و ملجا اب اسی پتھر یا تودہ خاک کو بنا لیتے ہیں، لیکن یہ بات کہ نفساً اس روح کا اس پتھر یا تودہ خاک سے تعلق ہے بھی یا نہیں، حساً یا عقلاً یا کسی اور ذریعہ سے ان کو اس کا قطعاً علم نہیں ہوتا، اس لیے بت پرستی علاوہ اس ناقابل عفو جرم کے جس کا نام شرک ہے یوں بھی وہ ایک

(باقی اگلے صفحہ ۲۴۴)

کی نزاکتوں کو دیکھ رہے ہیں، کہ اس میں بھی سلطان المشائخ کے صحبت یافتوں
کو "معونت از غیر خدا خواستن" کا شبہ ہوتا ہے۔

سلطان المشائخ کے متعلق سجدے کرانے والی روایت کی تردید

اللہ اللہ جس کے حلقۂ اخلاص وصفا میں وحدت کا یہ رنگ
پیدا ہوتا تھا، اسی شاہبازِ فضائے تفرید، دیکھ تازمیدانِ تجرید پر آج الزام
لگایا جا رہا ہے کہ قرآن کے نصِ محکم

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ	خدا ایسا نہیں کرتا کہ کسی آدمی کو کتاب
الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ	اور حکم "اور نبوت عطا کرے پھر وہ لوگوں سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
بے بنیاد وہم ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان خود تراشیدہ فرضی پتھروں یا خود ساختہ مٹی
کے تودوں کے ساتھ کسی زندہ وجود کا جو یہ تعلق مانتے ہیں، آخر اس کی بنیاد کیا ہے، جہاں
چاہا ایک پتھر رکھ دیا، گویا یہ پتھر ایک قسم کے الٰہ الدین الف لیلہ والے کا چراغ ہے کہ جلا نہیں
کہ موکلین حاضر ہو گئے۔ یوں ہی جہاں کہیں ذرا چھیل چھال کے کوئی پتھر جما دیا، یا پتھر
پتھر نہیں مٹی ہی کو پانی میں سان کر کہیں ٹھوپ دیا، اور روح مخفی کا اس کے ساتھ تعلق ہو گیا
بخلاف خالق تعالیٰ جل مجدہ کے کہ گو بظاہر حواس سے اس کا وجود بھی مخفی ہے لیکن کائنات
نام ہی ہے ان کی کارفرمائیوں کی جلوہ گاہ کا، ہر ذرہ اس عالم کا اپنے خالق کے افعال کا صفات
کا وجود کا آئینہ بردار ہے، خالق قیوم کے تصور کے بغیر کسی بھی مخلوق کا وجود ناقابل تصور
ہے دھوپ کا تصور آفتاب کے بغیر ناممکن ہے، انفس و آفاق اس کے آیات و نشانیاں اور
اس کے پتے ہی ہی ہیں وہ علیٰ کل شیء شہید ، بکل شیء محیط ، ہو معکم اینما کنتم ہے، لیکن تراشیدہ پتھر اور روح
جن میں نہ کوئی کسی کا خالق ہے نہ کوئی کسی کا مخلوق، ان دو مخلوقوں میں آخر رشتہ کس بنیاد پر قائم کر لیا جاتا ہے،
اور ایسا رشتہ کہ ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے جدا نہیں ہو سکتا، پتھر کے سامنے کھڑا ہونا گویا اسی روح
کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اس سے مانگنا اسی مخفی روح سے مانگنا ہے جو اس پتھری کمل تجربے حاضر کی جاتی ہے ۱۲۔

یقول للناس کونوا عبادًا لی — کہے کہ اللہ کے نہیں بلکہ میرے بندے
من دون اللہ۔ — تم لوگ بن جاؤ۔

کی علانیہ خلاف ورزی کرتے ہوئے فرمان ربانی

واسجدوا للہ ان کنتم ایاہ تعبدون — اللہ ہی کو سجدہ کرو اگر تم اسی کو پوجتے ہو۔

کے علی الرغم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ہی امتیوں کو جن کے نزدیک غیر اللہ کی عبادت انسانیت کی سب سے بڑی تباہی اور جہنم کے ابدی عذاب کا مستحق بنانی ہے، ان ہی لوگوں سے اپنے آگے سجدے کراتا تھا، ان کو بجائے اللہ کے "عبادًا لی" (اپنا بندہ بناتا تھا) اور دلیل میں کیا پیش کیا جاتا ہے؟ چند مشتبہ الفاظ، یعنی جہاں دست بوسی، پائے بوسی کے الفاظ کی صراحت پائی جاتی ہے، وہیں بعض عبارتوں میں "سر بر زمیں نہاد" کے الفاظ بھی کہیں کہیں ملتے ہیں۔

سر بر زمین نہادن کا مطلب

لیکن سوال یہ ہے کہ اس "سر بر زمین نہادن" کا کیا مطلب ہے کیا واقعۃً لوگ سلطان المشائخ یا شیخ کبیر شکر گنج کے سامنے سجدے کرتے تھے؟ اب میں لوگوں سے کیا کہوں، مختلف زبانوں میں مختلف محاورات چل پڑتے ہیں، لغوی معنی ان الفاظ کے اور ہوتے ہیں اور اصطلاحی دوسرے، سارا فتنہ محض اس پر مبنی ہے کہ اس زمانہ کی جو اصطلاح تھی، جو دستور تھا، اس سے قطع نظر کرکے حریفوں نے ان الفاظ کے معانی لغت کی کتابوں میں دیکھنے شروع کیے، حالانکہ کچھ نہیں تو کم از کم یہ لوگ اسی کو دیکھتے کہ اس فعل کے جواز میں جو دلیل سلطان المشائخ سے منقول ہے، وہ کیا ہے، وہی دلیل بتا سکتی تھی کہ ان الفاظ کا کیا مطلب ہے، سیر خورد تو عقیدت میں کسی سے پیچھے نہیں سمجھے جا سکتے، وہی یہ لکھنے کے بعد کہ "کاتب حروف بخط مبارک سلطان المشائخ نوشتہ دیدہ است" ارقام فرماتے ہیں کہ اس فعل کے جواز کی دلیل یہ ہو سکتی ہے کہ:

قال صهيب رأيت علياً يقبل يد العباس ورجله (ص ۲۴۰) — حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے حضرت علی کو دیکھا کہ وہ حضرت عباس کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیتے تھے۔

یعنی حضرت علیؓ اپنے چچا عباس کے ہاتھ ہی نہیں بلکہ پاؤں کو بھی احتراماً چومتے تھے اب آپ خود غور کیجیے اس سے کیا ثابت ہوا، صرف یہی نا کہ پاؤں چومنے کے وقت چومنے والے کا سر چونکہ بالکل زمین سے قریب ہو جاتا ہے، اس لیے ثابت ہوا کہ پاؤں چومنے کی وجہ سے اگر سر کسی کے سامنے اتنا جھک جائے کہ پاؤں سے اور زمین جس پر پاؤں عموماً رکھے رہتے ہیں، قریب ہو جائے۔ تو صہیب کی اس روایت سے انحناء اور جھکاؤ کا جواز نکلتا ہے، مقصد یہ ہے کہ پائے بوسی کی وجہ سے سر میں اتنا جھکاؤ جو پیدا ہو جاتا ہے کہ قریب قریب سر زمین ہی پر چلا جاتا ہے اس لیے ایک صورت سجدے کی سی پیدا ہو جاتی ہے اس لیے چاہیے تو یہی تھا کہ جب غیر اللہ کے سجدے کو اسلام میں حرام کر دیا گیا ہے پائے بوسی بھی جس میں سجدے کی سی شکل پیدا ہو جاتی ہے ناجائز ہو جاتی لیکن جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پائے بوسی کا ثبوت ملتا ہے تو پائے بوسی کے جواز کی ایک صورت نکل آتی ہے

اور سلطان المشائخ — میں پوچھتا ہوں کہ اس سے زیادہ تو کوئی اور بات اس دلیل سے ثابت نہیں ہوتی، پھر کیا ہوا؟ یہی بات کہ لوگ قدم بوسی پر اس زمانہ میں معترض ہوتے تھے کہ اس میں سجدہ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے، ایک شخص کا قصہ بھی فوائد الفواد میں منقول ہے کہ روم و مصر و شام کی سیاحت کر کے آیا تھا کسی کو قدم بوسی کرتے ہوئے اس حال میں جو اس نے پایا تو اس نے منع کیا کہ سجدہ اسلام میں ناجائز ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ سلطان المشائخ بذاتِ خود اس طریقہ کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ لوگ ہاتھ کے سوا قدم چومنے کے لیے بھی میرے سامنے سر جھکائیں، خود سیر الاولیاء میں میر خورد نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

"در پیش من کر روئے بر زمین می آورند | میرے آگے جو اپنا سر جھکاتے ہیں میں اسے
کارہ ام" ص ۳۴۱ | پسند نہیں کرتا۔

اور وہ چاہتے تھے کہ قدم بوسی جس کی وجہ سے خواہ مخواہ لوگوں کے سر زمین کی طرف چلے جاتے ہیں، ایک گونہ سجدے کی شکل پیدا ہو جاتی ہے، اس کو منع کر دیں، لیکن ان کا بیان ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ بھی قدم بوسی سے لوگوں کو منع نہیں فرماتے تھے، اس لیے منع کرنے کی ہمت نہیں پڑتی، عجب جملہ لکھا ہے کہ:

"از دو چیز یکے لازم آید یا تجہیل مشائخ یا تفسیق ایشاں" | دو چیزوں میں سے ایک لازم آتا ہے مشائخ کو جاہل ثابت کرنا یا انکی تفسیق کرنا

یعنی یہ سمجھا جائے کہ شیخ کبیر اس حکم ہی سے ناواقف تھے کہ قدم بوسی جائز نہیں ہے یا عدم جواز کے علم کے باوجود شریعت کے حکم کی خلاف ورزی العیاذ باللہ کرتے تھے، جو ظاہر ہے کہ فسق ہے، اس کے علاوہ جیسا کہ میں نے عرض کیا حضرت علیؓ کے اس اثر سے بھی ان کو گونہ بد دلی گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ باوجود "کارہ" ہونے کے لوگوں کو انہوں نے اس فعل سے منع نہیں کیا،

قدم بوسی فقہاء کی نظر میں

لوگوں کو فقہاء کا مسلک چونکہ معلوم نہیں ہے۔ اس لیے سمجھتے ہیں کہ اگر صرف "قدم بوسی" ہی کا مسئلہ ہوتا حالانکہ قدم بوسی کی وجہ سے سر گویا زمین ہی سے آلگتا ہے، ورنہ آخر قدم بوسی کی صورت ہی کیا ہو گی، کیا جس کے قدم چومنا چاہے گا اس کی ٹانگ اٹھا کر اوپر کرے گا مقصود جب اعتراف فضل اور اظہار احترام ہے تو ظاہر ہے کہ چومنے والے ہی کو جھکنا پڑے گا اور اتنا جھکنا کہ جہاں قدم رکھے ہوتے ہیں وہیں تک اپنا منہ لے جائے، ایسی صورت میں سر یقیناً زمین سے بہت قریب ہو جاتا ہے اور گونہ سجدہ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے اسی لیے بعض فقہاء نے علماء اولیاء صالحین بلکہ سلاطین کی دست بوسی کی

اگر اجازت بھی دی ہے تو قدم بوسی کو ناجائز ٹھہرایا ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ جب
مخلوق کے ہاتھ چومنے کی اجازت دے رہے ہیں تو اسی مخلوق کے پاؤں چومنے میں کیا
خرابی ہوسکتی تھی مگر وہی بات کہ قدم بوسی میں سر زمین تک آجاتا ہے، عدم جواز کا
فتویٰ دیا گیا ہے، عالمگیری میں ہے۔

طلب من عالم او زاهد ان يدفع اليه قدمه ليقبله لا يرخص فيه

کسی عالم یا زاہد سے کوئی استدعا کرے کہ اپنے قدم اس کی طرف بڑھائیں تاکہ وہ ان کو بوسہ دے اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

حتیٰ کہ اسی انحناء اور جھکاؤ کی وجہ سے فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ سلام کرنے
کے وقت آدمی کو بالکل سیدھا رہنا چاہیے، بدن یا سر میں کسی قسم کا جھکاؤ نہ
پیدا کرنا چاہیے، عالمگیری میں ہے۔

یکره الانحناء عند التحیة وبه ورد النهی کذا فی التمرتاشی

سلام کے وقت بھی جھکاؤ مکروہ ہے، اس سے منع کیا گیا ہے، التمرتاشی میں مسئلہ یوں ہی ہے،

اور میں سمجھتا ہوں کہ ان ہی فقہی عبارتوں کی وجہ سے سلطان المشائخ کا دل
اس جھکاؤ کو پسند نہیں کرتا تھا جو قدم بوسی کی وجہ سے پیدا ہو جاتا تھا، مگر ان کی
یہ قلبی ناپسندیدگی عملی شکل اختیار نہ کرسکی جس کے اسباب انہوں نے خود ہی
بیان بھی فرما دیے ہیں کہ اپنے اسلاف کی تجہیل یا تفسیق کی جرأت اپنے اندر نہیں
پاتا۔

قدم بوسی حدیث کی نظر میں

مجھے اس سے بحث نہیں کہ سلطان المشائخ کا یہ فعل یعنی
قدم بوسی اور قدم بوسی کے انحناء مفرط کی وجہ سے سر زمین
نہادن کی جو شکل پیدا ہو جاتی ہے واقع میں یہ جائز ہے یا ناجائز، اس کا فیصلہ
تو علماء ہی کرسکتے ہیں، فقہ کی عبارت آپ دیکھ چکے، ایک طرف یہ فقہ ہے،

دوسری طرف حضرت علیؓ کا یہ اثر امام بخاری کی کتاب "الادب المفرد" باب ۴۴۵ میں ہے۔ اسی باب میں وفد عبد القیس کے ایک رکن الوازع بن عامر سے روایت ہے کہ ہم جب خدمت میں آئے تو آپ کے ہاتھ اور پاؤں کا بوسہ ہم سب نے دیا۔ مشکوٰۃ کی کتاب الایمان میں روایت ہے کہ دو یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام کی "نو آیات" کے متعلق پوچھا کہ وہ کیا ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں نو چیزیں جو شریعت موسوی میں ممنوع تھیں، جن میں بجز سبت کے حکم کے اسلام میں بھی ممنوع ہیں ان کا ذکر فرمایا، دونوں یہودیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس جواب کو جب سنا تو حدیث میں اس کے بعد ہے کہ:

فقبلوا یدیہ ورجلیہ و	پس ان دونوں یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ
قالا نشھد انک	علیہ وسلم کے دونوں ہاتھوں اور پائے مبارک کو بوسہ دیا
نبی	اور بولے کہ ہم اس کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ نبی ہیں۔

آگے اور رہا تمیں ہیں مجھے تو یہ کہنا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ والا اثر معلوم نہیں کس کتاب میں ہے لیکن یہ حدیث تو صحاح ستہ کی مشہور ...... حدیثوں میں ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدمبوسی ان یہودیوں نے کی۔

بہرحال اہل علم کا فتویٰ جو کچھ بھی ہو، لیکن میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں، ان لوگوں سے کہنا چاہتا ہوں جنہوں نے اسی قدم بوسی اور انحنا مفرط والی شکل کو باضابطہ سجدہ بنا لیا، اور دنیا میں ڈھنڈورہ پیٹ دیا کہ سلطان المشائخ کا مذہب تھا کہ مرید پیر کو سجدہ کر سکتا ہے، العیاذ باللہ بات کہاں کہاں پہنچا دی گئی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر سلطان المشائخ اپنے مریدوں سے بجائے قدم بوسی کے واقعی یہی نماز والا سجدہ کرایا کرتے تھے تو جن فقہاء نے ان پر سماع کا

الزام لگاکر طرح طرح سے بدنام کیا تھا تا آنکہ بات حکومت تک پہنچی خود غیاث الدین تغلق کو اپنے شاہی دربار میں مجلس مناظرہ منعقد کرانی پڑی، دونوں طرف کے علماء جمع ہوئے، وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ آج چھ سو سال گذر جانے کے بعد بھی تاریخ میں اس مجلس مناظرہ کا شور و غوغا گونج رہا ہے، حالانکہ جو کچھ بھی ہو سماع وہ بھی بغیر مزامیر والا کیوں کہ گذر چکا کہ مزامیر کو تو خود سلطان المشائخ محرمات میں شمار فرماتے تھے، اس غیر مزامیری سماع کا مسئلہ اتنا اہم تو نہیں تھا، جتنا کہ سجدہ والا مسئلہ سجدہ کا حال کہ غیر اللہ کے سامنے بہ نیت عبادت تو کفر ہے، شرک ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اسلام کے کسی فرقہ کو بھی اس کے کفر و شرک ہونے میں اختلاف ہوگا، رہ گیا وہ سجدہ جس میں ساجد اپنی عبدیت اور بندگی اور غایت فقر و تذلل کو نہیں، بلکہ جسے سجدہ کیا جائے یعنی مسجود لہ کے احترام اور عظمت کا اظہار اپنے سجدوں سے کرنا چاہتا ہو، وہی جسے عموماً سجدۂ تعظیمی کہتے ہیں، چونکہ کسی دوسرے کی عظمت یا فضل کا اعتراف جو سجدۂ تعظیمی کی روح ہوتی ہے، یہ ناجائز نہیں ہے اس لیے بظاہر اس سجدہ میں وہ خرابی جو سجدۂ عبادت میں پائی جاتی ہے نہیں پائی جاتی ہے،

سجدۂ تعظیمی

اسی لیے فقہاء اسلام تعظیمی سجدہ جو غیر اللہ کو کیا جائے اس کو کفر و شرک تو نہیں قرار دیتے، لیکن چونکہ حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے لیے بھی صحابہ کو سجدہ کی اجازت نہیں دی، تو ظاہر ہے کہ اور کسی کو کب اس کی اجازت ہو سکتی ہے خود قرآنی آیت:

وَاسْجُدُوا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ - اللہ ہی کو سجدہ کرو اگر تم اللہ ہی کی عبادت کرتے ہو۔

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو اللہ ہی کی عبادت کرتا ہے۔ اسے چاہیے کہ اللہ ہی کو سجدہ کرے، بہر حال ان ہی وجوہ سے سجدۂ تعظیمی کے متعلق فقہاء کا فیصلہ یہ ہے کہ غیر اللہ کیلئے

وہ بھی جائز نہیں ہے، عالمگیری میں تو لکھا ہے:

لا یکفر بذلک یا فحد امنہ کابہ غیر اللہ کو تعظیمی سجدہ کرنے والوں کی تکفیر تو نہیں کی
الکبیرۃ وھو المختار[۳۶۹] جائے گی لیکن گنہگار ٹھہرایا جائے گا اس لیے کہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔
جس سے معلوم ہوا کہ مذہب مختار فقہاء کا یہی ہے کہ سجدۂ تعظیمی کفر تو نہیں ہے، لیکن کبیرہ گناہ ہے

یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ العیاذ باللہ اگر فی الحقیقت سلطان المشائخ اپنے مریدوں سے سجدہ کراتے تھے، خواہ تعظیمی ہی سہی، تو فقہ کی کتابوں میں جسے "کبیرہ" قرار دیا گیا ہے اس الزام کو چھوڑ کر غیر مزامیری سماع کا الزام ان پر کیوں لگائے، اس قسم کے سماع کا مسئلہ اتنا تو سخت نہ تھا، جتنا کہ سجدہ کا مسئلہ سماع میں تو بہت کچھ گفتگو ہو سکتی تھی، دیگر ائمہ کے سوا غیر مزامیری سماع کی حد تک تو فقہ حنفی میں بھی گنجائش پیدا ہو سکتی تھی، بخاری اور مسلم کی حدیثوں سے اس قسم کے سماع کا جواز پیدا کیا جا سکتا تھا مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت صحابہ کا رجز پڑھنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ساتھ دینا "بینا" ابینا" کے لفظ کو ذرا بلند آواز کے ساتھ ادا فرمانا انجشہ والی روایت، جواری مغنیات کی روایت عبد اللہ بن رواحہ سے "ھات من ھنیاتک" وغیرہ وغیرہ، بیسیوں صحیح آثار اس کے ثبوت میں پیش ہو سکتے تھے، لیکن سجدہ کے جواز کی کیا صورت تھی، ان کو گرفت کرنی تھی، تو سب سے آسان بات تو یہی تھی خدانخواستہ اگر واقعی ان کے سامنے لوگ سجدے کرتے تھے، تو سلطان المشائخ کے پاس اس کے جواز کی

لہ حتیٰ کہ مشہور عالم حدیث جو اپنی سخت گیری و ظاہریت میں شہرت عام رکھتے ہیں یعنی علامہ ابن حزم جیسی ہستی مزامیری و غیر مزامیری ہر قسم کے غناء کی اباحت و جواز کے مدعی ہیں۔

کیا سند ہوتی نہ کوئی قرآنی آیت، نہ حدیث، نہ فقہ، میرے نزدیک یہ خود دلیل ہے کہ وہ سجدہ ہی نہ تھا بلکہ وہی قدم بوسی کی شکل تھی، جس میں انحناء مفرط کا پیدا ہو جانا لازمی ہے، آپ فوائد الفواد اُٹھا کر پڑھیے میر حسن علا سنجری عموماً یہی لکھتے ہیں

"سعادت پائے بوس بدست آمد" "سعادت پائے بوس حاصل شد"

"بہ سعادت پائے بوس رسید" "دولت پائے بوس حاصل آمدہ"

میں نے یونہی کتاب کھولی اور ص ۱۵۴، ص ۱۵۵، ص ۱۵۶، ص ۱۵۷ سب ہی جگہ یہی الفاظ نظر آئے، اگر یہ لوگ سجدہ کرتے تھے تو پھر وہی لکھتے، ہو سکتا ہے کہ اسی کیفیت کی تعبیر کبھی انہوں نے "سر بر زمین آوردہ" وغیرہ الفاظ سے کی ہو، گو مجھے خیال نہیں ہے لیکن اس کا مطلب بھی وہی ہے اور یہی ہونا بھی چاہیئے، مجھے تو حضرت والا کے دوستوں اور دشمنوں دونوں سے شکایت ہے، دوست تو اس کے درپے ہیں کہ عیاذاً باللہ ان کو تفسیق کا سامان مہیا کریں، اور دشمن شاید تجہیل کے درپے ہوں لیکن مسلمانوں کا بڑا حصہ کا پرانا حسن جن... جد مسلسل جن کے صلاح و تقویٰ کی روایتیں ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچائی ہو کیا یہ مناسب نہ تھا کہ ہم ان اکابر کی تفسیق یا تجہیل کی جگہ اگر کوئی بات ایسی نظر آئے تو اس کی تاویل کریں، اور میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، یہ تو تاویل نہیں بلکہ ان شاء اللہ یہی واقعہ ہے اور اسی کی واقعیت پر مجھے اصرار ہے[1]

[1] پہلے کسی موقع پر ذکر کیا جا چکا ہے کہ سجدۂ تحیت کا رواج بادشاہوں کے سامنے بھی ہندوستان میں اکبر سے پہلے نہ تھا، بلکہ اکبری عہد میں ایک شرار الناس شرار العلماء کی شرارت تھی، اور شاہجہاں کے عہد میں اس کا انسداد ہو گیا جیسا کہ تمام تاریخوں میں لکھا ہے پھر جب سجدۂ تحیت کا رواج بادشاہوں میں بھی نہ تھا تو فقراء کیا ہونا لوگوں کو اکبری عہد کے سجدۂ تحیت سے مغالطہ ہوا کہ شاید یہ سجدہ بادشاہوں کے سامنے ہندوستان میں پہلے سے چلا آ رہا تھا، اور ان ہی کی دیکھا دیکھی جیسے "شاہ" کا لفظ صوفیوں نے اپنے متعلق استعمال کیا اس سجدہ کو بھی اپنے سامنے کرا لیتے ہیں ۱۲۔

حضرت سلطان المشائخ پر ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ باوجود ان گراں قدر فتوحات اور "لامحدود آمدنی" کا ذکر کر کے یہ جو دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان پر حج فرض ہوگیا تھا، اور باوجود فرض ہونے کے انہوں نے اعراض کیا، یہ صحیح نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ ان دونوں حضرات کا "زلزالی عہد ابتلاء" جب ختم ہوگیا تو ان پر فتوحات کے دروازے ضرور کھلے اور خوب کھلے، لیکن اغنیاء سے جو کچھ لیا جاتا تھا لوگوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ خود اپنے لیے لیا جاتا تھا، ان کے محبوب رسول (علیہ السلام) کا تو حکم تھا کہ:

تو خذ من اغنیائھم و تقسم علی فقرائھم — لیا جائے امیروں سے اور بانٹا جائے مسلمانوں کے غرباء اور فقراء پر۔

جن لوگوں نے اپنی پوری زندگی "قاسم" ہونے کی حیثیت سے گذاری، دیوانوں نے سمجھ لیا کہ وہ ان آمدنیوں کے مالک تھے، مالک ہوتے تو چوبیس گھنٹوں میں اپنے لیے "صرف چند پر کالہائے نان و سبزی و کریلہ تلخ" کی افطاری اور کھچڑی کی سحری، جو کبھی کھائی جاتی تھی اور کبھی یوں ہی واپس کر دی جاتی تھی کہ بہت سے لوگ دکانوں میں اور سڑکوں پر بھوکے پڑے ہیں۔

صرف پنڈالوں اور نقربہ کے اسٹیجوں سلطان المشائخ کے دستر خوان پر کھانے والے بھی غرباء کے حقوق کے محافظوں کو کون سمجھا سکتا ہے کہ جن غریبوں کی صورت دیکھنی بھی تمہیں ناگوار ہو، کاش! تم دیکھتے کہ تقریباً ایک ہزار سال تک ان ہی بزرگوں کے دستر خوان پر ان بیچاروں کو وہ سب کچھ ملتا رہتا تھا جس کے نام سے بھی امراء نے ان کو محروم رکھا تھا، کیا ان بزرگوں کے دستر خوان پر صرف امراء بیٹھتے تھے؟ اب میں کیا بتاؤں سلطان المشائخ ہی ایک شخص کی تصویر ان الفاظ میں پیش

فرماتے ہیں:۔

"مردے ژندہ پوشے گلیمے سیاہ در بر، و سر بندے رنگیں بر سر" (سیر الاولیاء ص ۱۱۵)

ایک شخص گدڑی پہنے ہوئے، کالی کملی اوڑھے ہوئے اور ایک میلا کچیلا رومال سر پر ڈالے ہوئے

پھر اسی کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"ـ جماعت کندوری کشیدہ بودند او آمد سلام کرد در مائدہ خوان نشست"

جماعت کے سامنے دسترخوان بچھا ہوا تھا وہ آیا اور سلام کر کے دسترخوان پر بیٹھ گیا۔

صرف کھانے ہی کی اجازت نہ تھی کہ جو کچھ دسترخوان پر موجود ہو آزادی کے ساتھ کھا سکتے ہو، بلکہ اس کی بھی کہ لیجانے کی خواہش ہو، تو لے بھی جا سکتے ہو۔ اسی خستہ حال فقیر ہی کے ذکر میں ہے کہ جب دسترخوان بڑھایا جا چکا تو سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ:۔

"بعد فراغ طعام او را ندیدم پرسیدم که آں درویش چیزے خورد"

کھانے سے فراغت کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا پوچھا کہ اس درویش نے کچھ کھایا؟

سنیئے نظمار دسترخوان کیا جواب دیتے ہیں:۔

"گفتند چہار نان و قدرے شوربا در کاسہ چوبیں انداخت و پیش خانقاہ مقابل بلندی بود بر نشست و نان بخورد و رفت (ص ۱۱)"

لوگوں نے بتایا کہ چار نان اور کچھ شوربہ لکڑی کے پیالے میں ڈالا اور خانقاہ کے سامنے بلند جگہ کے اوپر بیٹھ کر کھایا اور چلا گیا۔

لہ اور صوبوں کا حال معلوم نہیں لیکن بہار میں شادیوں میں رواج "کندوری" کا ہے، لوگ عموماً اس کو ہندوؤں سے ماخوذ کوئی رواج سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ترکی لفظ ہے معنی... دسترخوان ہیں، جو کھانا برادری کو کھلایا جاتا ہے اس کو کندوری کہتے ہیں۔

یہ ایک جزئی واقعہ ہے، مگر اسی سے آپ کو ان بزرگوں کے دستر خوان کا قانون معلوم ہو سکتا ہے کہ کس قسم کے لوگوں کو اس "خوانِ یغما" پر بیٹھنے کی اجازت تھی، بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے، کہ شناسائی کی بھی ضرورت نہ تھی اور جن کا حال یہ ہو، جیسا کہ میر حسن علاء نے فوائد الفواد میں نقل کیا ہے کہ:

"دولت پائے بوس بدست آمد طعام	قدم بوسی کی، لوگوں نے کھانا حاضر کیا۔
پیش آوردند خوردن گرفتند"	اور کھانا شروع ہو گیا۔

کھانا شروع ہو گیا، اس وقت سلطان المشائخ ایک قصہ کسی بزرگ کا ان الفاظ میں بیان فرمانے لگے:

"بزرگے گفتہ است کہ خلق پیش من	ایک بزرگ نے کہا ہے کہ مخلوق میرے
طعام می خورند من آں طعام را در حلق	سامنے کھانا کھاتی ہے میں اس کھانے کو
خود یا بم یعنی گوئی آں طعام من می خورم"	اپنے حلق میں پاتا ہوں یعنی تم کہو کہ
(ص ۷۷)	کھانا میں ہی کھاتا ہوں،

ظاہر ہے کہ اگر کسی بزرگ کا یہ حال ہو گا، تو خود کہنے والا اس قصہ کو اپنے کسی تجربہ کی بنیاد پر اس وقت دہرا رہا ہو گا، جب اس کے دستر خوان میں لوگ کھانا کھا رہے تھے۔

غریبوں کا تعلق خانقاہوں سے آج جن میزوں پر الوانِ نعمت کے لقموں کے ساتھ غریبوں کا دکھڑا رویا جاتا ہے گویا یہ بھی ایک قسم کا حدیث المائدہ (ٹیبل ٹاک) اور ہضم کرنے کا چورن ہے، ان کو کیا معلوم کہ اسلامی تاریخ میں غریبوں اور امیروں کے درمیان صوفیائے اسلام کی یہی خانقاہیں درمیانی کڑی کا کام دیتی تھیں، ان بزرگوں کا دربار وہ دربار تھا، جہاں سلاطین بھی خراج داخل کرتے تھے، خود سلطان المشائخ کا کیا

حال تھا، گذرچکا کہ ولی عہد سلطنت خضر خاں تک اسی دربار کا حلقہ گوش تھا علاءالدین جو سارے ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا لیکن ایک خزانہ وہ بھی تھا جس میں اسے بھی مالگزاری داخل کرنی پڑتی تھی، اسی بادشاہ کے ذکر میں طباطبائی نے لکھا ہے:۔

"شیخ نظام الدین معروف باولیاء ... نظام الدین اولیاء علاءالدین کے زمانہ ... در زمان او (علاءالدین) بود اگرچہ ... میں تھے گو بادشاہ بظاہر شیخ سے ملاقات ... سلطان در ظاہر با شیخ ملاقات نمی کرد ... نہیں کرتا تھا مگر خط وکتابت اور تحفہ ... اما بارسال رسل ورسائل وتحائف ... تحائف کے ذریعہ تعلقات رکھتا ... وہدایا رسم اخلاقی می سپرد" (ص ۹۹) ... تھا۔

علاءالدین کو جتنا بھی بے شعور قرار دیا جائے لیکن آخر دور والوں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے تو کیا اتنے قریب سے بھی اپنی فوجی لوٹ کے حقیقی خزانہ کو وہ نہیں دیکھ سکتا تھا، میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک دلیل ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی فوجی قوت نے غیر معمولی طور پر جو اہمیت حاصل کرلی تھی اس کی تہ میں حضرت سلطان المشائخ کے توحیدی جوش وخروش کا زور چھپا ہوا تھا، خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہی خانقاہیں تھیں جن کے ذریعہ سے ملک کے عام غرباء فقراء تک ان کا حصہ پہنچایا جاتا تھا، اور یہی مطلب ہے، اس مشہور فقرہ کا کہ "مال صوفی سبیل ست" (فوائد الفواد ص ۹۵) یعنی راستوں پر پانی پلانے کی جو سبیلیں لوگ کھولتے ہیں، اور ہر آنے جانے والے کو اختیار ہے کہ بغیر کسی معاوضہ کے پانی پیئے، صوفیہ کے پاس جو آمدنی آتی ہے، اس کا بھی یہی حال ہے، فوائد الفواد میں سلطان المشائخ کے حوالہ سے بھی یہ فقرہ نقل کیا گیا ہے، خود سلطان جی نے وفات سے پہلے حکم دیا کہ جو کچھ

غلہ سازو سامان میری خانقاہ میں ہے، اُسے لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے، اور
وفات ہی کے وقت نہیں، یوں بھی عام دستور ساری زندگی میں یہی رہا کہ جو
کچھ آمدنی ہفتہ بھر میں ہوتی، وہ تقسیم ہوتی رہتی تھی اور

"در ہر جمعہ تجرید فرمودے حجرہا را بنا
خانہا خالی کنانیدے چنانکہ جاروب می
کردند بعدہ در مسجد جمعہ رفتے"

ہر جمعہ کو صفائی فرماتے اور کمرے اسٹاک
روم خالی کرائے جاتے ایسا معلوم ہوتا کہ
جھاڑو دلوا دیتے پھر نماز جمعہ کو جاتے

عام دستور

میر خورد نے لکھا ہے کہ اگر کسی دن اتفاق سے غیر معمولی آمدنی
آجاتی یعنی۔

"وقتے اگر فتوحے گراں رسیدے گریہ
بیشتر کردے و جہد بیشتر فرمودے کہ زود تر تفرقہ
کنید و ساعۃً فساعۃً کسان می فرستاد
کہ تفرقہ کردند؟"

اگر کسی وقت زیادہ فتوحات آجاتیں
تو بہت روتے اور سعی کرتے کہ جلد تقسیم
کر دی جائیں تھوڑی دیر سے آدمی
کو بھیجتے کہ ختم کیا کہ نہیں۔

گویا مسلسل آدمی پر آدمی بھیجتے چلے جاتے پوچھتے کہ سب خرچ ہو گیا۔

چوں می شنیدند کہ در حال قسمت کردند
بمحتاجاں رسانیدند خاطر مبارک قرار
گرفتے (ص ۱۳۱)

جب سن لیتے کہ فوراً تقسیم کر دیا گیا
اور محتاجوں کو دیدیا گیا اس وقت ان کو
قرار آتا۔

میر خورد نے یہ بھی لکھا ہے کہ علاوہ دستر خوانی طعام کے سلطان جی کا قاعدہ
تھا کہ افطار اور نماز مغرب کے بعد بالاخانہ پر تشریف لے جاتے، مغرب اور
عشاء کے وقت ہر قسم کے لوگوں کو آنے کی اجازت تھی اس وقت بھی۔

"از ہر جنس میوہائے خشک و تر و
ماکولات و مشروبات لطیف و لذیذ پیش

خشک اور تر میوے یا کھانے پینے
کی اچھی چیزیں لوگ سامنے لاتے تو تمام

می آورد ندد آں عزیزاں تناول	آنے والے تناول فرماتے اور ان کی دلجوئی
می کردند و ایشاں را دلداری می	کرتے اور ہر ایک کے حالات معلوم
فرمود، و از عالم ہر یکے پرسش می کرد"	کرتے

بہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ معاملہ صرف واقعی کھلانے پلانے ہی کی حد تک محدود تھا، خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے غریبوں کو کپڑے، لباس، جوتے اور دوسری ضروریات کی چیزیں ملتی رہتی تھیں، میر خورد نے ایک موقع پر لکھا ہے:

"آئندہ و روندہ از غریب و شہری ہر کہ	آنے جانے والا اجنبی یا شہری جو بھی
بیامدے وسعادت پائے بوس حاصل	آتا اور حاضر خدمت ہوتا ان میں سے
کردے ہیچ کس را محروم نگذاشتے از	کسی کو محروم نہیں فرماتے، کپڑا، نقد،
جامہ و چیتل و تحف و ہدایا کہ از عالم	تحفہ اور ہدیہ جو غیب سے پہونچتا تمام
غیب رسیدے ہمہ بہ مصرف رسانیدے	خرچ فرما دیتے اور جو بھی آتا اور جس وقت
و ہر کہ آمدے ہر وقت کہ آمدے توقف	آتا توقف نہیں فرماتے فوراً پیش
نمودے در حال پیش می فرمودند"	کرتے۔

یعنی ملنے کے لیے جو بھی جس وقت آتا حکم تھا کہ فوراً اُس کو خدمت اقدس تک پہنچا دیا جائے

آنے والوں کے لیے خادم کو ہدایت

میر نے لکھا ہے کہ ایک دن سلطان المشائخ دوپہر کو قیلولہ فرما رہے ہیں، کوئی حاجتمند کسی ضرورت سے آیا، اُسی مبارک حضرت کے خادم نے اس کو ٹال دیا کہ حضرت قیلولہ فرما رہے ہیں، اِدھر یہ واقعہ ہوا اور دوسری طرف نیند میں سلطان جی شیخ کبیر شکر گنج کو دیکھتے ہیں، کہ فرما رہے ہیں:۔

اگر در خانہ چیزے نیست بقدر وسع حق	اگر گھر میں کچھ نہیں ہے بقدر وسعت

رعایت آئندہ واجب است اہل	دلجوئی ضروری ہے، یہ کہاں آیا ہے
کجا آمدہ ست کہ چنیں خستہ دل را باز	کہ ایسے زخمی دل کو واپس کر دو۔
گردانید"	

نئی آنے والوں کے ساتھ برتاؤ تو اچھا ہونا چاہیے، نیند سے چونک پڑے!
ی مبارک بلائے گئے، پوچھا کہ کوئی آیا تھا، بولے کہ ہاں میں نے حضرت کے
آرام کا خیال کرکے واپس کر دیا میر نے لکھا ہے کہ

"سلطان المشائخ بہ تلفت کرد وکہ خدمت	سلطان المشائخ گرم ہوئے اور فرمایا
شیخ المشائخ را در غضب دیدہ ام	کہ میں نے شیخ المشائخ کو حالت غصہ میں
مرا عتاب می کرد"	دیکھا ہے مجھے عتاب فرما رہے تھے۔

اسی کے بعد عام حکم ہو گیا تھا کہ میں جس حال میں بھی رہوں آنے والوں کی
فوراً خبر ہونی چاہیے" اگر در قیلولہ باشم مرا خبر کنی" قیلولہ سے اٹھنے کے بعد اسی
لیے عام عادت یہ تھی کہ دو سوال کرتے" یکے آں کہ سایہ گشت" یعنی زوال ہو گیا۔
ظہر کی نماز کے متعلق سوال تھا، اور دوسرا یہ کہ "آئندہ آمدہ است بنا یدا منتظر
باشد" (س ۱۲۹)

بغداد کے ایک درویش کا واقعہ | فوائد الفواد میں سلطان المشائخ کی زبانی یہ قصہ میر حسن علا نے نقل کیا ہے کہ

در بغداد درویشے بود کہ ہر روز یک	بغداد میں ایک فقیر تھا جہاں ہر دن
ہزار دوست کاسہ در مائدہ او خرچ	اس کے دسترخوان پر ہزاروں خرچ
شدے و دار ابہشتدہ مطبخ بود۔ ص ۱۱۱	ہوتا اور ان کے اٹھارہ مطبخ تھے۔

مگر اٹھارہ باورچی خانوں والے خود ان درویش صاحب کا کیا حال تھا،
جن کے یہاں سے اتنا کھانا پک کر لوگوں میں تقسیم ہوتا تھا، اسی کے بعد

ہے کہ ایک دن لوگوں سے درویش صاحب نے پوچھا کہ کوئی کھانے والا رہ تو نہیں گیا، نظم کرنے والوں نے کہا کہ

"خیر باہمہ را یا دمی کنیم وہمہ را طعام می دہیم" — تو سبھوں کا خیال رکھتے ہیں اور سبھوں کو کھانا دیتے ہیں۔

درویش صاحب بار بار یہی پوچھتے جاتے تھے کہ کسی کو فراموش تو نہیں کیا گیا ہے ؟ ہر دفعہ یہی جواب ملا کہ۔

"ما کسے را فراموش نمی کنیم ہمہ را وقت طعام حاضر کنیم" — ہم نے کسی شخص کو فراموش نہیں کیا اور برابر کھانا دیتے رہے۔

آخر میں انہوں نے کہا کہ:

"امروز سہ روز است کہ مرا طعام ندادہ اید" — آج تیسرا دن ہے کہ مجھ کو کھانا نہیں دیا۔

وجہ یہ تھی کہ:

"مطبخ بسیار بود مطبخیاں می دانستند کہ از دیگر مطبخ رسیدہ باشد" — مطبخ بہت سے تھے منتظم خیال کرتے تھے کہ دوسرے مطبخ سے چلا گیا ہوگا۔

حقیقت جب معلوم ہوئی تو لوگوں کو شرمندہ ہونا پڑا،

سولہ درویش کا لنگر خانہ

اور خیر یہ تو ایک قصہ ہے، معلوم نہیں بغداد کے کس بزرگ کا ہے، لیکن یہ واقعہ تو آپ کو ہندوستان کی اکثر تاریخوں میں ملے گا کہ جلال الدین خلجی کے عہد میں مولہ[1] نامی دلی

---

[1] ظفر الوالہ جو گجرات کی عربی زبان میں ایک مبسوط تاریخ ہے اس میں اس لفظ "مولہ" کا تلفظ درج کرتے ہوئے لکھا ہے، بتشدید اللام المفتوحہ ہے یعنی "مولّہ" اس کا صحیح تلفظ اس میں شیخ مولہ کے متعلق لکھا ہے کہ کان سیدی مولہ مع سعۃ تصرفہ یقتصر فی الملبوس علی ردائہ من قطن وازادہ فی المأکول علی اثر صخبز من رقیق الارذ و قلیل الادم (بانی اگلے صفحہ

میں ایک اور درویش تھے، ملا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہے کہ اُن کی خانقاہ میں

"ہزار من میدہ و پانصد من سلوخ گوشت شیخ کے لنگر خانہ میں ہر روز ہزار من میدہ
بنا بنا با و سہ صد من شکر فرح بوی شیخ پانچ سو من گوشت تین سو من شکر
بود کہ در لنگر بکار می رفت" (ص ۲۰) خرچ ہوتی تھی۔

اگر من سے وہی چالیس سیر والا ہندوستانی من مراد ہے، اور غالباً وہی مراد ہے بھی کہ اور جہاں کہیں بھی من کا لفظ اس زمانہ کی کتابوں میں استعمال کیا گیا ہے اس سے وہی ہندوستانی من مقصود ہے، سوچنے کی بات ہے کہ ایسی صورت میں ہزار ہزار من آٹے کی روٹیوں اور پانچ پانچ سو من گوشت کے روزانہ کھانے والوں کی تعداد کیا ہو گی، اور واقعہ تو یہ ہے کہ بجائے خود یہ اس الو العزمی کی دلیل ہے جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے اندر پائی جاتی تھی، اللہ اللہ ہم آج جس چیز کو سوچ بھی نہیں سکتے حکومت نہیں، بلکہ مسلمانوں کے عام افراد اسے انجام دیتے تھے، آخر روزانہ اتنی بڑی مقدار میں کھانا پکوانا اور کھلانا بغیر کسی معمولی سلیقۂ نظم کے ممکن ہے؟ لیکن قومیں جب زندہ ہوتی ہیں، تو ان پر ایسی باتیں بلکہ ان سے بھی عجیب تر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۰) من جنس البقول الحب کثیر الریاضۃ والمجاھدۃ لا زوجۃ لہ ولا غلام یخدمہ ولا یقبل الفتوح ص ۲۶۶ ج ۲ یعنی سیدی مولہ ان لطافت کے باوجود سادہ لباس رکھتے تھے، ایک سوتی چادر ایک لنگی، کھانے میں چاول کی روٹی کسی ترکاری کے ساتھ جس میں گوشت وغیرہ کچھ نہ ہوتا، مجاہدہ اور ریاضت کی سختی کے ساتھ پابند تھے۔ ان کی نہ بیوی تھی نہ کوئی غلام خدمت کرنے والا۔ لوگوں سے نذر نیاز فتوحات بھی نہیں لیتے تھے پھر یہ خرچ کہاں سے مہیا ہوتا تھا؟

تر باتیں آسان ہو جاتی ہیں[۱]۔ اور جب مردنی چھا جاتی ہے، تو وہ آدمی کے کھانے پینے کا انتظام بھی دشوار ہو جاتا ہے، ملا صاحب نے لکھا ہے کہ رفتہ رفتہ جب سیدی مولہ کے اس "خوان یغما" کی خبر بادشاہ وقت (جلال الدین خلجی) کے کانوں تک پہنچی تو خود اسے بھی تعجب ہوا، اور شاید کچھ خطرہ بھی، آخر

---

[۱] مآثر الامراء میں اللہ وردی خاں ایک جہانگیری امیر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے شکاروں کو گھیرنے اور پھنسانے کیلئے ایک خاص قسم کا جال بنوایا تھا، مآثر الامراء میں اس جال کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے "دست و کمال استواری با ہشتاد شتر ایک جال تھا (اسی) اونٹوں پر لدکر شکارگاہ پہنچایا جاتا تھا" طول دو ہزار و دو صد درعہ بادشاہی وارتفاع شش "اللہ اکبر دس ہزار گز بادشاہی طوالت ملاحظہ فرمایئے! اسی اونٹوں پر اگر جاتا تھا تو کیا تعجب ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ٹکڑوں میں منقسم تھا جب اس سے شکار کا کام لینا چاہتے تو "بساں سراپردہ پہلو بہ پہلو نہا سترگ برپا کنند و انواع سباع (درندے) و وحوش گرد آوردہ صید نما ینند" صفحہ ۲۵۸ ج ۱۔ گویا وہ سارے جانور جو اس جال کے احاطہ میں آجاتے تھے تو وہ شکار تھے میں نے یہ اس لئے نقل کیا ہے کہ شکار جو صرف دل بہلانے کی ایک چیز ہے لیکن اتنی غیر اہم چیزیں بھی زندگی کی ہیں قوموں سے کیسے عجیب کارنامے صادر کرا لیتی ہیں، سیر المتاخرین وغیرہ میں اکبر کے زمانہ کا ایک قصہ بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہ نے جشن منانے کا حکم دیا حسب دستور بارگاہ شاہی نصب ہوا جس میں دوازدہ ہزار کس در سایہ آں گنجیدہ یعنی دس بارہ ہزار آدمی کی گنجائش اس بارگاہ میں تھی اتفاق سے اس میں آگ لگ گئی لکھا ہے "اندازہ ایں نقصان جز محاسب نہ تواند یافت" گر قلوب میں جب قوت اور زندگی رہتی ہے تو جس نقصان کا حساب کوئی محاسب نہیں کر سکتا تھا، اس کی پرواہ بھی نہیں ہوئی، اسی کتاب میں ہے کہ "بعد اطفائے التہاب آتش مذکورہ (یعنی آگ کے بجھ جانے کے بعد) حکم شد کہ بجہت بزم خرف کہ نزدیک بود بارگاہ والا درست کردہ بودند کہ روز بارگاہ فلک اشتباہ صورت انجام یافت" (سیر المتاخرین) اسی کسی جگہ میں نے شیخ محدث کے حوالہ سے بنگالی بادشاہ غیاث الدین خلجی کے متعلق نقل کیا ہے کہ بنگالہ اتنا بڑا پل بادشاہ نے بنوایا تھا جس پر بارہ دن تک لوگ چلتے رہتے تھے ۱۲۔

"شبے بہ لباس ناشناس در خانقاہ او رفتہ تصرف او را انچہ شنیدہ بود زیادہ یافت"	ایک رات اجنبی لباس میں ان کی خانقاہ میں حاضر ہوا تھا اور جو کچھ سن رکھا تھا اس سے زیادہ حیرت دیکھا

ملا عبدالقادر نے اس کی تصریح بھی کی ہے کہ سیدی مولہ کا دستر خوان سب کے لیے کشادہ تھا، عامی اور خاصی کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔

"مردم نامی و سرداران معتبر و سائر خواص و عوام پیوستہ ملازم خانقاہ او بودند"	عام لوگ معتبر سردار اور تمام عوام و خواص پابندی کے ساتھ خانقاہ میں ہوتے۔

ؒ ان سرداران معتبر میں ملا صاحب نے لکھا ہے کہ "ملوک و امرا معزول خلجی بھی شریک ہوتے تھے، غالباً ان ہی لوگوں کی شرکت جلال الدین خلجی کی غلط فہمی کا باعث ہوئی اس کو خطرہ ہوا کہ شاید سیدی مولہ کے اس خانقاہی کاروبار کے پیچھے کوئی سیاسی سازش تو پوشیدہ نہیں ہے خود جا کر خانقاہ اور لنگر خانے کی جو حالت اس نے دیکھی، اس سے بدگمانی میں اور اضافہ ہو گیا بالآخر اس نے سیدی مولہ کو پابزنجیر دربار میں حاضر کرنے کا حکم دیا۔ پوچھ گچھ ہوئی، شیخ نے قسمیں کھا کر باور کرایا کہ میری نیت میں کوئی فتور نہیں ہے۔ دربار کے امرا اور علماء بھوں نے سلطان کو سمجھایا اور شیخ کی طرف سے صفائی پیش کی، لیکن اس کے دل سے کانٹا نہ نکلا، قاضیوں سے اس نے چاہا کہ شیخ پر کوئی شرعی الزام قائم کریں، لیکن بالاتفاق سبھوں نے اظہار کیا کہ ہمارے نزدیک شیخ پر کوئی شرعی الزام عائد نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے بعض علماء بادشاہ کے زیر عتاب بھی ہوئے مجبور ہو کر جلال الدین نے اس زمانہ کے بعض زاویہ نشین قلندروں کو جنہیں "حیدریہ" کہتے تھے شیخ کی مخالفت پر آمادہ کیا، اور ان ہی بدبختوں کے ہاتھ شیخ کو شہید ہونا پڑا، بداؤنی شیخ محدث دونوں نے لکھا ہے کہ جس

شیخ محدث نے بھی اخبار الاخیار میں سیدی مولہ کا عنوان قائم کرکے لکھا ہے کہ

"اتباع و مریداں بسیار داشت و بمردم — مریدین اور متبعین بہت رکھتے تھے
طعام می داد" ص ۳۰۷ — اور لوگوں کو کھانا کھلاتے تھے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اپنی مقدار و وسعت کے لحاظ سے سیدی مولہ کا دستر خوان جو کچھ بھی خصوصیت رکھتا ہو، لیکن خانقاہی لنگر خانوں کے دروازے عموماً ہر کہ ومہ خاص و عام کے لیے کھلے رہتے تھے۔

شیخ فخر الدین اس میں ان کی کوئی خصوصیت نہ تھی، اکبر کے ابتدائی عہد میں شیخ فخر الدین نامی ایک بزرگ تھے، ملا عبد القادر ہی نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سماع کے بعد دستور تھا کہ

"سفرہ (دستر خوان) می کشیدند و شاہ — دستر خوان بچھتا اور بادشاہ و فقیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دن سیدی مولہ شہید کیے گئے سخت آندھی آئی طوفان کا سماں قائم ہوگیا، شیخ محدث کا تو بیان ہے کہ گویا قیامت برپا شد، عالم تاریک گشت" بداؤنی کا بیان ہے کہ "قحطے چناں واقع شد کہ ہندواں از غایت گرسنگی بمجمعہ جماعہ جماعہ ستہائے یک دیگر را گرفتہ خود را در آب جون انداختہ طعمۂ نہنگ فنامی شدند و مسلماناں نیز باکشش گرسنگی سوختہ غریق بحر عدم بودند" عام خیال یہی تھا کہ شیخ مولہ کے خون ناحق کا یہ اثر ہے، لیکن بقول عبد القادر" بریں طور چیز با مدار ہم نہ تواں نہاد کہ شائد از جملہ اتفاقیات باشد بداؤنی نے یہ بھی لکھا ہے کہ قتل ہونے سے چند دن پیشتر سیدی مولہ کی زبان سے یہ اشعار سنے جاتے تھے

در مطبخ عشق جز نکو را نکشند — لاغر صفتاں زشت خو را نکشند
گر عاشق صادقی ز کشتن مگریز — مردار بود ہر آنچہ او را نکشند

ودر دیش گرد او برابر بود، ادس پر برابر ہوتے تھے۔

انتہا اس عمومیت کی یہ تھی کہ بیرم خاں خاناں جو اس زمانہ میں وزیری نہیں بلکہ مدار کل اور حقیقی معنوں میں وہی حکمراں تھا، لکھا ہے کہ:

"بیرم خاں نماز جمعہ اکثر در مسجد ادا می گذارد ... و در تناول طعام و سائر آداب مجلس ہیچ امتیاز از سائر الناس نداشت (ص ۳ ج ۳)

بیرم خانخاناں عموماً جمعہ کی نماز ان کی مسجد میں ادا کرتے اور کھانا کھانے اور آداب مجلس میں عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہیں برتتے تھے۔

غربت و امارت کا یہ سنگم، یعنی صوفیہ صافیہ کا یہ طبقہ جہاں امراء و غرباء دونوں ایک حیثیت سے حاضر ہوتے تھے، اس نظم سے غریب حاجتمند مسلمانوں کی کتنی حاجت روائیاں ہوتی تھیں واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عہد کا کوئی زمانہ اور ان دنوں ہندوستان کا شاید ہی کوئی صوبہ کوئی علاقہ ایسا ہوگا جہاں

توخذ من اغنیائھم وتقسم علی فقرائھم

امیروں سے ان کے لیا جائے اور غریبوں پر بانٹ دیا جائے۔

کے نبوی فرمان کی تعمیل میں ارباب صدق و صفا کا یہ طبقہ مشغول نہ تھا، خصوصاً جن بزرگوں کو کسی خاص وجہ سے امراء اور ارباب ثروت پر اثر قائم ہو جاتا تھا۔ یوں سمجھیے کہ غرباء کی قسمت جاگ اٹھتی تھی،

شاہ بھیک رحمتہ اللہ علیہ گیارہویں صدی کے اواخر اور بارہویں کے آغاز میں ایک مشہور ہستی حضرت شاہ بھیک رحمتہ اللہ علیہ کی تھی، جن کا اصلی نام سید محمد سعید تھا، لیکن عوام میں آپ کا یہ عرفی ہی نام مشہور ہو گیا، اور اب تک اسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں، ہمارے مخدوم و مکرم جناب مولوی غلام بھیک نیرنگ صاحب وکیل انبالہ کے نام کا انتساب آپ ہی کی

اسم گرامی کی طرف ہے۔

یہ شاہ بھیک قدس سرہٗ حضرت شاہ ابوالمعالی (انبیٹھا) ضلع سہارن پور کے ارشد خلفاء میں ہیں بہادر شاہ کے انتقال کے بعد جب معزالدین جہاندار شاہ دلی کے تخت پر قابض ہو گیا، تو اُس زمانہ کا ایک امیر ظفر خاں حضرت سے مشورہ گیر ہوا کہ جہاندار شاہ کے مقابلہ میں فرخ سیر جو اُٹھ کھڑا ہوا ہے میں کس کا ساتھ دوں، آپ نے فرخ سیر کی رفاقت کا مشورہ دیا، وہ اپنی فوج کے ساتھ فرخ سیر سے جا ملا، جیسا کہ معلوم ہے قسمت نے دلی کے تخت کا فیصلہ فرخ سیر کے لیے کیا، ظفر خاں کی بن آئی اور نواب روشن الدولہ ظفر خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے، سہ ہزاری کا منصب بخشی گیری کا عہدہ فرخ سیر کی طرف سے ان کو عطا ہوا، چونکہ یہ کامیابی حضرت والا کے شورہ کی راہ سے روشن الدولہ کو حاصل ہوئی تھی، قدرتاً وہ شاہ بھیک صاحب کے انتہائی عقیدت کیشوں میں تھا، اور نواب روشن الدولہ کی وجہ سے فرخ سیر خود اُس کے دربار کے امراء حضرت کے معتقدوں میں شریک ہو گئے، ان کے تذکرہ میں جس کا نام "ثمرۃ الفؤاد" ہے، اور ان کے براہ راست مرید مولوی محمد لطف اللہ مرحوم کی تصنیف ہے اس کتاب میں حضرت شاہ بھیک کے ادودہش کے قصوں کی ایک طویل فہرست درج ہے، مولوی لطف اللہ نے لکھا ہے، حضرت کی خانقاہ میں ذاکرین وشاغلین کی تعداد

"پانصد کس در اوائل حال بر آرہ (خانقاہ) شریف بیادِ الٰہی مشغول می بودند۔ | شروع شروع میں پانچ سو آدمی خانقاہ میں یادِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔

ان کے سوا " ہمیں مجمع صادر و وارد ہر روز تا ہزار کس بردہ باشد" ص ۱۷۰ اور دونوں وقت النسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو حضرت کی خانقاہ سے کھانا پہنچایا

جاتا تھا۔

روشن الدولہ کی ستر ہزار رقم اور شاہ کا رویہ	اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ روشن الدولہ خود حضرت والا کی خدمت میں

اس لیے حاضر ہوا کہ حضرت کی خانقاہ کی شاندار عمارت تعمیر کرائے، اپنے ساتھ "مبلغ ہفتاد ہزار روپیہ بہبت روضہ شریف آوردہ" اور عرض گذار ہوا کہ "ایں قدر زررا ہمراہ آوردہ انچہ دیگر مطلوب خواہد باشد طلبیدہ می شود"

شاہ بھیک نے روشن الدولہ سے یہ سُن کر فرمایا کہ:

بالفعل مبلغ رایکجا جمع دارند شما آرام کنید بوقت سہ پہر تہیہ آں نمودہ معماراں را طلبیدہ شروع عمارت کردہ خواہد شد"	ابھی نقد یکجا رکھیں آپ آرام کریں سہ پہر میں سامان کرکے اور معماروں کو بلا کر تعمیر کا کام شروع کیا جائے گا

روشن الدولہ ستر ہزار کی ان تھیلیوں کو حضرت کے پاس چھوڑ کر اپنی بارگاہ کی طرف آرام کے لیے چلا گیا، ادھر شاہ بھیک صاحب نے۔

"درویشاں را طلبیدہ زرندکور خانہ بخانہ بیوہ زنان ومحتاجات ومسکنیان ساکنان انبالہ وتھانیسر وسرہند وپانی پت ہیو تقسیم نمودند کہ یک حبہ باقی نگذاشتند ص ۷۱ا	درویشوں کو بلا کر ساری نقدی گھر گھر بیواؤں اور محتاجوں اور مسکینوں اور انبالہ و تھانیسر و سرہند و پانی پت وغیرہ کے باشندوں میں تقسیم کر دیا اور ایک حبہ بھی باقی نہ چھوڑا۔

روشن الدولہ بیچارہ سہ پہر کے وقت حاضر ہوتا ہے، اور آپ فرماتے ہیں۔

"بنار خانقاہ ماچہ قبولیت شدہ کہ بچندیں گوشہ نشیناں ومحتاجاں	خانقاہ کی بنار ایسی مقبول ہوئی کہ بہت سے گوشہ نشینوں اور محتاجوں

رسیدہ ...... ما فقیر را عمارت عالی چہ کار ست"

کہ یہ رقم پہنچے گی میں فقیر آدمی ہوں مجھ کو ایسی بڑی عمارت کی کیا ضرورت ہے۔

روشن الدولہ نے یہ سن کر عرض کیا

"بسیار مستحسن و بجا شد خزانہ دیگر ہم موجود است"

بہت بہتر اور خوب ہوا دوسرا خزانہ موجود ہے۔

تین لاکھ کی رقم اور اس کا مصرف اسی کتاب میں لکھا ہے کہ :

"روزے قاصد مرسلہ بادشاہ محمد فرخ سیر و نواب روشن الدولہ و نواب عبداللہ خاں مع عرائض و ہندیات مبلغ سہ لک روپیہ رسید"

بادشاہ فرخ سیر نواب روشن الدولہ نواب عبداللہ خاں کی طرف سے قاصد مع دستاویزات اور تین لاکھ کی نقدی کے ساتھ پہنچا۔

شاہ صاحب کو خبر ہوئی، ارشاد ہوا کہ حسب استحقاق لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

"بموجب امر عالی قصبہ پانی پت لیہ پور کرنال و انبیٹھ و گنگوہ وغیرہ قسمت نمودہ" ص ۱۱۹ ر

حضرت کے حکم کے مطابق پانی پت اور رام پور کرنال، انبیٹھ اور گنگوہ وغیرہ میں تقسیم کر دیا گیا۔

اسی میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ بھیک کا

"معمول چناں بود کہ در سفر و حضر تا نصف لیل دروازہ باز می ماند و سائلے کہ می آمد محروم نمی رفت از نقد و جنس و طعام و پارچہ ہر چہ میسر و موجود بودے انعام می فرمودے" ص ۱۱۸۔

سفر و حضر میں آپ کا معمول تھا کہ آدھی رات تک دروازہ کھلا رکھتے اور جو سائل آتا تھا اسے محروم نہیں جانے دیتے تھے نقد، غلہ، کھانا، کپڑا جو کچھ بھی موجود ہوتا اسے عطا فرماتے

اس کتاب میں آپ کے داد و دہش اور علم بذل و کرم کے جو قصے درج ہیں اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل مضمون بن سکتا ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ کتنی بیوہ عورتوں کی لڑکیوں کی شادیاں حضرت نے کرائیں، کتنوں کو ان امیروں کے پاس نوکریاں دلوائیں، کتنے مظلوموں کو ظالم حکام کے پنجوں سے اپنے اثر سے کام لے کر آپ نے خلاصی دلوائی۔

مجدد الف ثانی کے پوتے کا حال

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ کسی ایک شخص کا حال نہ تھا، ان بزرگوں کے دیگر مشاغل و مکاسب میں ایک اہم چیز یہ بھی تھی، ان ہی دنوں میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے شیخ سیف الدین بن عروۃ الوثقیٰ شیخ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کا قیام عموماً دلی میں رہتا تھا، لکھا ہے کہ:

"محمد اورنگ زیب و شاہزادگان و امرا با خدمت ایشاں ارادتے پیدا شد و در امر معروف و نہی منکر کوشش بلیغ می داشتند"	محمد اورنگ زیب شاہزادوں اور امرا کو آپ سے عقیدت پیدا ہو گئی تھی اور یہ سب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بہت کوشش فرماتے تھے۔

لیکن امرا کی ارادت سے جو نفع اٹھایا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ:

یک ہزار و چہار صد کس را موافق رغبت و فرمائش ہر یک از خانقاہ ایشاں ہر روز دو وقت طعام عنایت می شد۔	ایک ہزار چار سو اشخاص کو ان کی خواہش کے مطابق روزانہ دونوں وقت کھانا دیا جاتا تھا۔

(مناقب العارفین)

ہر شخص کی رغبت اور فرمائش کے مطابق ہزار ہزار چودہ چودہ سو آدمیوں کو روزانہ کھانا کھلانا کوئی معمولی بات ہے، لیکن وہ بیچارے اسی لیے تھے کہ منجملہ دیگر

مہمات کے ایک مہم ان غریبوں تک روزی پہنچانے میں ذریعہ بننا بھی تھا۔

شاہ بولن کا دستر خوان

ایک دلچسپ کہیے یا دل دوز واقعہ اسی سلسلہ کا یہ ہے کہ تیرہویں صدی کے ایک بزرگ جن کا عرفی اور مشہور نام شاہ بولن تھا، سہوارہ کے رہنے والے تھے، صاحب مناقب العارفین جو ان کے دیکھنے والوں میں ہیں اُنہوں نے لکھا ہے۔

"در خانقاہ خود وارد و صادر را طعام	اپنی خانقاہ میں تمام آنے جانے والوں کو
می دادند، گویا لنگر خانہ وے حضرت	کھانا دیتے گویا حضرت کا لنگر خانہ عام
سفرۂ عام بود چہ دشمن وچہ دوست	دستر خوان تھا جس پر دوست و دشمن
دریغ نمی داشتند	کی تمیز نہ تھی سب کے لیے عام تھا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں غدر کا فتنہ ہندوستان میں شروع ہوا لیکن اس زمانہ میں بھی شاہ بولن کا لنگر خانہ جاری رہا اسی کتاب میں ہے۔

"در ایام غدر ہندی در لنگر خانہ وے	زمانہ غدر میں آپ کے لنگر خانہ میں
حضرت دوست و دشمن می آمدند و طعام	دوست و دشمن آتے تھے اور کھانا
می خوردند و می رفتند"	کھاتے اور چلے جاتے تھے۔

انگریزی حکومت اور اس کے ارباب حل و عقد اسلامی فقراء کے اس طرز عمل سے واقف نہ تھے، ان تک یہ خبر پہنچی کہ شاہ بولن نامی فقیر سرکار کے باغیوں کو کھانا کھلاتا ہے، حالانکہ ان بیچارے کو کیا خبر کون باغی ہے اور کون غیر باغی بقول صاحب مناقب

"وے حضرت با کسے حاجتے و کارے نداشتند" آپ کسی شخص سے کوئی کام یا غرض نہیں رکھتے تھے۔

لیکن حکومت کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ امیروں سے لے کر مفت غریبوں میں کھانا بلا وجہ تقسیم کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے، شاہ صاحب پر بھی بغاوت کا

مقدمہ قائم ہوا، اور

"بجرم آں کہ دشمنان حاکم را امداد می کردند و طعام می دادند...... باعث گرفتاری و رسانیدن وے حضرت در جزیرہ مذکورہ (انڈمان) شدہ بود۔ (مناقب ص ۲۷ ک)	اس جرم میں کہ حکومت کے دشمنوں کی امدادت کرتے اور انھیں کھانا دیتے میں گرفتار کیے گئے اور جزیرۂ انڈمان میں مقید کر دیئے گئے۔

زندگی کا آخری حصہ عبور دریائے شور کی اسی سزا کی وجہ سے انڈمان ہی میں گذرا، اور

"در جزیرہ انڈمان مدفون گشتند" جزیرہ انڈمان میں دفن ہوئے۔

شیخ عزیز اللہ کی داد و دہش

اپنے محبوب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے نمونے تکسب المعدوم و تحمل الکل و تعین الاخرق[1] کی اتباع میں ان کو جو لذت ملتی تھی، درد نا آشنا قلوب اس کی حلاوتوں

---

[1] یہ بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں کا وہ مشہور فقرہ ہے جسے خدیجۃ الکبریٰ ام المومنین علیہا السلام نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے اس وقت فرمایا تھا جب غار حرا سے آپ پہلی دفعہ تشریف لائے۔ اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی جن مشاغل میں گذری تھی گویا اس کا اظہار تھا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ ناداروں کو کما دیتے ہیں، دوسروں کا بار خود برداشت کرتے ہیں جو اپنا کام اچھی طرح انجام نہیں دے سکتے تھے ان کی مدد فرماتے ہیں۔ صوفیہ کرام میں عبادت کے اس طریقہ کو یعنی "برآوردن کار امیدواراں" کو جو ان کو اہمیت حاصل تھی وہ کسی خاص بزرگ کے ساتھ مخصوص نہ تھی، آپ کو ان بزرگوں کے حالات میں بکثرت اس کی مثالیں ملیں گی، ان کا امراء اور سلاطین پر جو اثر تھا اس کا نتیجہ یہ تھا۔ باقی اگلے صفحہ پر

کو کیا محسوس کر سکتے ہیں، ملا عبد القادر نے شنیدہ نہیں بلکہ اپنی یہ دیدہ شہادت شیخ عز بن اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق نقل کی ہے، کہ ان کا عام حال یہ تھا۔

از جہت شفاعت ہر فقیرے بیچارۂ	جو کوئی محتاج بے وسیلہ آدمی ان کے پاس سفارش کے
کہ رجوع باوکردے ہر چند در اعتکاف	لیے حاضر ہوتا، شیخ خواہ چلہ ہی میں کیوں نہ بیٹھے ہوں
اربعین ہم بودے اگر ہمہ بجائے بیگانہ	اور کسی ایسے شخص کے پاس ہی سفارش نہ کرنی پڑتی ہو،
از دین باشتے رفتے مسافت بعیدہ	جو دین سے بیگانہ ہوتا، لیکن باوجود ان تمام باتوں
پیادہ طے می نمود بعد از انجاح	کے شیخ پیدل اس شخص کے گھر جاتے۔ مکان! اس کا
حاجت آں محتاج باز بحجرہ	جتنے فاصلہ پر بھی ہو، ضرورت مند کی حاجت جب
اعتکاف رفتہ مشغول	پوری ہو جاتی تب پھر چلہ کے حجرہ میں واپس ہو کر
می شد۔	اپنے اشغال میں مشغول ہو جاتے۔

ملا صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے طرز عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ سفارش کے لیے چلہ کے اعتکاف سے باہر ہونے کو چلہ کشی کے منافی نہیں خیال کرتے تھے ملا صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مشکل ہی سے ان کی سفارش رد ہو سکتی تھی۔ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ جن کا شمار رؤسا طریق میں ہے، حلب کا بادشاہ الملک الظاہر بامر اللہ حضرت کے عقیدتمندوں میں تھا فتوحات میں ایک موقع پر شیخ نے لکھا ہے۔

لقد کلمت الملک الظاہر بامر اللہ صاحب	میں نے حلب کے بادشاہ ملک الظاہر بامر اللہ سے مختلف امور کی
حلب فی حوائج کثیرۃ نقضاہا فی مجلس واحد مائۃ	متعلق سفارش کی بادشاہ نے میرے کہنے سے ایک سو اٹھارہ
حاجۃ وثمانیۃ عشر حاجۃ للناس ولو کان عندی	حاجتیں لوگوں کی ایک دن میں پوری کیں، اور اس وقت
فی ذالک الیوم اکثر من ذلک لقضاہ لطیب	اگر میرے پاس کچھ اور ضرورتیں ہوتیں تو انہیں بھی خوشی سے
النفس ج ۳ ص ۹۷	وہ پوری کرتا۔

گویا شکستے در اعتکاف واقع نہ شد — گویا سمجھتے تھے کہ ان کے اعتکاف کا تسلسل اس سے نہیں ٹوٹتا تھا۔

واللہ اعلم اعتکاف کو پھر نئے سرے سے شروع کرتے تھے، یا نفلی اعتکاف ہونے کی وجہ سے اس قسم کے ارعینات میں وہ اس لیے باہر نکلنے کو جائز سمجھتے تھے، خیر یہ تو فقہ اور تصوف کا علمی مسئلہ ہے، امام محمد وغیرہ کی جو رائے نفلی اعتکاف کے متعلق ہے اس کے لحاظ سے گنجائش بھی پیدا ہوتی ہے، مجھے اس وقت ان بزرگوں کے نقطۂ نظر کو پیش کرنا ہے، قومی ہمدردیوں کے مدعیوں کے لیے اس میں کتنی بصیرتیں ہیں، ملا صاحب نے لکھا ہے کہ:

ایں عبادت متعدی را تقدم بر عبادت لازم نہادے۔ — یعنی ان کا خیال تھا کہ کسی غریب آدمی کی حاجت برآری کا کام چونکہ ایسی عبادت ہے جس سے دوسروں کو نفع پہنچتا ہے یعنی متعدی ہے، اس لیے لازمی عبادت جس کے منافع صرف اپنی ذات کی حد تک محدود رہتے ہیں، اس کو ترجیح حاصل ہے۔ اسی لیے سفارش کو چلہ کشی کی عبادت سے مقدم خیال کرتے تھے۔

غریبوں سے ہمدردی

ذرا ان بزرگوں کی نگاہ کی بلندیوں کو دیکھیے، صرف یہی نہیں کہ اعتکاف اور چلے کو توڑ دیتے تھے بلکہ ملا صاحب کا جیسا کہ بیان ہے، کسی قسم کا آدمی ہو، دین سے بیگانہ ہی کیوں نہ ہو، فاسق ہو، فاجر ہو، لیکن غریب مسلمان کا کام نکلتا ہے اس لیے ان کو ایسوں کے پاس جانے میں بھی عذر نہیں ہوتا تھا، کل کیا دن تھے اور آج ان ہی کے اخلاف کا کیا حال ہے اور بات اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی ہے، ملا صاحب نے اس کے بعد جو یہ اضافہ کیا ہے کہ

گاہے چناں بودے کہ اگر کافرے یا ظالمے در بارہ اول شفاعت قبول نکردہ باشد — کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اگر کسی کافر یا ظالم حاکم کے پاس شیخ کی سفارش کارگر نہ ہوتی، اور وہ اس کو قبول نہ کرتا،

از خانہ بدر نیامدہ شیخ تمام روز بر خانہ اونشستہ	یا قصداً گھر سے باہر نہ نکلتا تو دن دن بھر شیخ اس کے دروازہ پر بیٹھے رہتے۔

سن رہے ہیں، فاسق اور فاجر ہی نہیں کافر اور ہندو عہدہ داروں کے پاس بھی اس غرض کے لیے جانے میں نہیں ہچکچاتے تھے۔ کسر نفسی[۱] کا یہ حال ہے کہ قصداً عہدہ دار باہر نہیں نکل رہا ہے، لیکن وہ ہیں کہ اس کے دروازے پر اس لیے دھونی رمائے بیٹھے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک امتی کا کام نکلتا ہے نہ عزت کی پرواہ ہے اور نہ پوزیشن کی کیونکہ شیخ کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ ان کے علمی وقار کا اندازہ اسی سے کیجیے کہ ملا عبدالقادر جیسے آدمی ان کے شاگرد ہیں، اور اس تلمذ پر ان کو فخر ہے خود لکھا ہے کہ:

ودر درس آں صاحب کمال بعضے کتب رسائل تصوف استفادہ نمودہ الحمدللہ	اس باکمال بزرگ کی خدمت میں تصوف کے چند رسالوں کے پڑھنے کا مجھ کو بھی موقع ملا ہے الحمدللہ

علاوہ علوم باطنی کے ملا صاحب کا بیان ہے:

[۱] کسر نفسی اور تواضع کے سلسلے میں ملا عبدالقادر ہی نے ان کا ایک عجیب قصہ نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہ کی خانقاہ میں سماع کی مجلس تھی شیخ عزیز اللہ بھی اس مجلس میں موجود تھے، اتنے میں کسی قلندر آزاد نے ایک چیخ ماری اور "دست برزانوے شیخ بردہ و بر داشتہ او را سر نگوں بر زمین زد و دستارش پریشان شدہ و ملے نیز رسید" بھری مجلس میں ان کو پٹک دینا ہے، پگڑی بکھر جاتی ہے، تکلیف بھی پہنچی ہے لیکن شیخ نے خود ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ لوگوں نے یہی سمجھا کہ شاید وجد اور حال میں اس قلندر سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہے، مگر دراصل اس نے شرارۃً یہ حرکت کی تھی، تھوڑی دیر بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کیا، حاکم شہر بھی مجلس میں موجود تھا، اسے بڑا غصہ آیا "داراز زجر و ضرب شدید آں پریشاں کرد" گھر جاتے ہوئے شیخ نے کیا کیا تھا شیخ عذر خواہی او بسیار نمود و دست و پائے او (یعنی اس قلندر کے دست و پا لو) بوسیدہ در رعایت خوشی نگاہداشت و از گذاشت کہ تعرض باو رسند

"در علوم ظاہری ہم کامل و مکمل بود و تفسیر غوامض و عوارف فصوص الحکم و شروحش بہ تلامذہ درس گفتے، صاحب تصانیف مشہور ہ ست"

بہر حال اگر عہدہ دار اس دن ہاتھ نہ آتا، یا شیخ کی سفارش نہ سنتا تو شیخ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے، ملا صاحب نے لکھا ہے کہ:

مرہ دیگر بدبار او مکرر رفتہ دم نزدہ داریں معنی ہیچ رنگ کدورتے بآئینہ خاطر عیب نمائش نہ نشستہ	دوسرے دن پھر اسی کافر یا ظالم عہدہ دار کے دربار میں جاتے اور کوئی شکوہ یا گلہ نہ کرتے نہ ان کے دل میں اس طرز عمل سے کوئی کدورت پیدا ہوتی۔

کچھ اس طرح پٹ جاتے تھے کہ بالآخر

تا آنکہ مشفوع عنہ خود شرمندہ وخجلت زدہ دریائے ادب افتادہ وحاجت آں فقیر راسمعاً وطاعۃً بر می آورد۔	وہ شخص جس سے سفارش کی جاتی تھی، خود شرمندہ اور خجل و نادم ہو کر شیخ کے پاؤں پر گر پڑتا اور بولا۔ خوشی و رضا اس بیچارے غریب کا کام نکل جاتا۔

خانقاہ سارے محتاجوں کا سہارا تھی

اسلام کے ان اکابر کا حال پڑھیے، اور اس پر غور کیجیے، آپ کو نظر آئے گا کہ امراء اور غرباء کے درمیان، ان ہی بزرگوں کا وجود باوجود حلقۂ اتصال بنا ہوا تھا، اور میرا خیال ہے کہ ان کی خانقاہوں کے لنگر خانے جہاں اپنے اندر دوسرے اغراض رکھتے تھے، ایک بڑا کام ان سے یہ بھی نکلتا تھا کہ ملک کے غریبوں، مسافروں، بے وسیلوں کی پناہ گاہ یہ خانقاہیں بنی ہوئی تھیں۔ بلکہ ان ہی کے ذریعہ سے غریبوں تک بھی وہ نعمتیں پہنچ جاتی تھیں، جن کا نام بھی اس زمانہ کے غریبوں نے شاید نہ سنا ہو،

مسلمان جس ملک میں بھی پہنچے تھے، اس کے طول و عرض میں آپ کو اس قسم کی خانقاہوں کا جال بچھا ہوا نظر آئے گا، خیال تو کیجئے عہد التمش و بلبن، یہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے آغاز کا زمانہ ہے، لیکن دلی ہی میں نہیں،

بلدۂ تخت سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں میل دور ہم دیکھتے ہیں کہ غرباء کے لیے ان ہی خانقاہوں کے ذریعہ سے لنگر جاری ہیں، سیر الاولیاء میں سلطان المشائخ کی زبانی یہ روایت درج ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے

"در اوائل از آیندگان می شنیدم کہ شیخ خضر پارہ دوندر بہار خانقاہے دارد و درویشاں را خدمت می کند" (ص ۱۱۲)	ابتدا میں آنے والوں سے میں نے سنا کہ بہار میں شیخ خضر پارہ دوز کی ایک خانقاہ ہے جہاں وہ درویشوں کی خدمت کرتے ہیں۔

سلطان المشائخ کا ابتداء میں ان ہی کے پاس بہار جانے کا خیال تھا

"نیت جزم کردم کہ برمعو غلام بچگان او را تعلیم بکنم"	میں نے عزم کر لیا تھا کہ وہاں جاؤں گا اور ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کروں گا۔

غور کرنے کی بات ہے کہ یہ زمانہ ظاہر ہے کہ سلطان المشائخ کی نو عمری کا زمانہ ہے، غالباً ناصر الدین بن التمش کا زمانہ ہوگا، اور اسی زمانہ میں دلی سے اتنی دور بہار میں درویش کی خانقاہ جاری ہے، اور درویشوں کی خدمت ہو رہی ہے، بہرحال "فتوحات" و "نذور" شکرانوں کی آمدنیاں ان خانقاہوں میں ضرور ہوتی تھیں لیکن جب تک ہماری خانقاہیں واقعی خانقاہیں تھیں، دکانوں کی شکل انہوں نے نہیں اختیار کی تھی، تو اس وقت خانقاہ کے درویش کی حیثیت مالک کی نہیں صرف قاسم کی رہتی تھی،

بزرگوں پر زبان درازی

فتوحاتی آمدنیوں کے مالک نہیں، بلکہ قاسم ہونے پر ان خانقاہوں میں اصرار کیا جاتا تھا، اور اتنا شدید اصرار کہ شیخ کبیر شکر گنج خواب میں آکر سلطان المشائخ کو تنبیہ کرتے ہیں کہ کیا اس کے بعد بھی ان بزرگوں کے متعلق حج کی فرضیت اور عدم فرضیت میں کسی کو شبہ

باقی رہ سکتا ہے۔ ہاں جن دینی بادشاہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دین کی خدمت میں صرف کرکے اپنے آپ کو ہمیشہ فقیر بنائے رکھا، آج ان پر زبانیں کھل رہی ہیں، ان لوگوں کی جن کا سرمایہ دینی جدوجہد کی راہ میں زبان سے نکلنے والے چند تقلیدی الفاظ، یا قلم سے بننے والے چند فرسودہ پامال حروف کے سوا اور کچھ نہیں ہے، جن سے بمشکل پانچ وقت کی نماز بھی ٹھیک طریقہ سے ادا نہیں ہو سکتی، خدا کی شان ہے وہی آج ان بزرگوں کو ٹوکنے کی ہمت کر رہے ہیں، جن کی زندگی میں "دین" اور دین کی حقیقی سچی خدمت کے سوا اور کچھ نہ تھا،

اللہ کے ان دوستوں کے معاملہ میں اپنے عزیزوں سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ خدا کی غیرت کو حرکت میں نہ لائیے تنقید و تحقیق، ریسرچ و تنقید کے کھیل کھیلتے رہیے لیکن خدارا ریش بابا تک تو آپ کی یہ بازیاں نہ پہنچ جائیں

من عادی لی ولیا فقد آذنته بالحرب۔ — میرے کسی ولی سے جو دشمنی کرتا ہے میں اس کو جنگ کا اعلان دے دیتا ہوں

کی حدیث اگر آپ نے سنی ہوگی تو بیٹھے بٹھائے اس اعلان جنگ کو کیوں دعوت دیتے ہیں، جس کا جواب تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

کیا آپ واقعات کا انکار کر سکتے ہیں، ہندوستان کی تاریخ سے "محمد تغلق" اور اس کی بے نظیر خونیں داستانوں، بے مثال مجنونانہ افسانوں کے نقوش کیا مٹائے جا سکتے ہیں؟ دولت آباد بسانے کے لیے دلی اجاڑی گئی، اس حد تک اجاڑی گئی کہ کسی گوشہ کے کسی گھر سے دھواں بلند نہیں ہو رہا ہے۔

بزرگوں سے سیاہ باطنی کا انجام عجیب بات ہے کہ سلطان المشائخ کی زندگی کی بعض معمولی باتوں کو تو لوگوں نے اہمیت دی کہ

غیاث الدین تغلق پر جب نو تعمیر دعوتی مکان گرا، تو کہتے ہیں کہ سلطان المشائخ کے ستانے کا چونکہ ارادہ رکھتا تھا، حضرت سے لوگوں نے عرض کیا کہ اب تو وہ جمنا کے ساحل پر آگیا، دو ایک روز میں دلی پہنچ کر معلوم نہیں کیا مصیبت پیدا کرے، بیان کیا جاتا ہے کہ اسی وقت زبان مبارک سے "ہنوز دلی دور است" کا فقرہ نکلا، جو نسلوں اور پشتوں سے منتقل ہوتے ہوتے آج تک زبان زد عام ہے، عموماً تاریخوں میں اس واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح خلجی فاسق سیہ کار بادشاہ قطب الدین مبارک جب اپنے غلام خسرو خاں کے ہاتھ سے مارا گیا، تو عموماً اس موقعہ پر بھی عموماً بعض ذکر کرتے ہیں، کہ جس رات کو مارا گیا، اس کی صبح کو وہ سلطان المشائخ کے ساتھ گستاخی کا عزم کیے ہوا تھا کہتے ہیں کہ سلطان المشائخ ہی کی بد دعا کا شکار ہوا[1]،

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ یہ خسرو خاں جو چار مہینوں کے لیے دلی کا بادشاہ بھی ہو گیا تھا، دراصل گجرات کا ایک خوش رو و جیہ چھوکرا تھا، اصلی نام حسن یہ نار بچہ تھا، قطب الدین اس کے ہاتھ سے مارا گیا یہ تو واقعہ ہے، لیکن اس کے پیچھے کیا کسی اللہ کے دلی کی بد دعا تھی؟ جیسا کہ میں نے کہا تاریخوں میں بھی سلطان المشائخ کے قصہ کو ذکر کرتے ہیں، لیکن مجمل لفظوں میں بر خورد نے سیر الاولیاء میں اس قصہ کا ذکر کیا ہے، حاصل یہ ہے کہ خضر خاں چونکہ حضرت والا کا مرید تھا، اور وہی علاء الدین کا ولی عہد تھا جس سے قطب الدین نے حکومت غصب کی تھی، اس لیے قطب الدین حضرت سے بھی ناراض رہتا تھا، اس نے اپنی ایک نئی جامع مسجد "جامع میری" کے نام سے بنوائی تھی اور تمام مشائخ و علماء کو حکم تھا کہ اسی میں آکر نماز جمعہ ادا کریں، سلطان المشائخ نے کہلا بھیجا "مسجد نزدیک واریم و ابہ احق است ہمیں جا خواہیم گزارد" اور وہ جامع میری نہیں گئے بادشاہ سخت برافروختہ ہوا اسی کے ساتھ ہر لوچندی کو اعیان و مشاہیر شہر دربار شاہی میں پیش ہو کر نذر گذرانتے تھے (باقی اگلے صفحہ پر)

بجائے خود اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں واقعات کچھ کم اہم نہیں ہیں، خصوصاً قطب الدین مبارک کے ساتھ آپ کے تعلقات کی نوعیت اور چار سال تک

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: سلطان المشائخ اس تقریب میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے، ادائے رسم کیلئے اپنے خادم اقبال کو بھیج دیتے تھے، اس سبب سے بھی وہ برہم تھا۔ اس نے اپنے تمام امراء وزراء کو حکم دیا کہ کسے بزیارت شیخ غیاث پور نرود" میر خورد نے یہ بھی لکھا ہے کہ "بارہا گفتہ کہ ہر کہ سر شیخ پیا من آرد تنکہ زر اورا بدہم" ایک دن شیخ ضیاء الدین رومی کی درگاہ میں سلطان جی اور قطب الدین کا آمنا سامنا بھی ہو گیا، سلطان جی نے بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے سلام کیا، قطب الدین نے جواب نہ دیا، یوں مسلسل واقعات قطب الدین کی حکومت کی چار سالہ مدت پیش آتے رہے، تو چندی کی حاضری پر امراء کا قصہ سب سے آخر میں پیش آیا، قطب الدین نے بھرے دربار میں اعلان کیا کہ اگر "تو غرہ ماہ آئندہ نیامد بیایم چنانکہ دانیم" گویا یہ اس کی دھمکی تھی کہ زبردستی دربار میں گھسٹوا کر بلواؤں گا، شاید قتل ہی کا ارادہ ہو، سلطان جی کو بادشاہ کے اس عزم صمیم کی خبر پہنچی "سلطان المشائخ ہیچ نگفت" اب مہینہ ایک ایک دن کر کے ختم ہوتا جا رہا تھا "ہر چند ماہ نزدیک رسید التفات مخلصاں مادرے پیش تری داد" الغرض مہینہ ختم ہوا، چاند مغرب کے بعد دیکھا گیا، کل پہلی تاریخ ہے، شہر کے اعیان و امراء دربار میں جائیں گے، لیکن سلطان المشائخ یہی طے کیے ہوئے ہیں کہ میں نہیں جاؤں گا، قطب الدین بھی فیصلہ کیے ہوئے ہے کہ اگر "نیامد بیارم چنانکہ دانم" حرف شب درمیان است دلی میں کھلبلی مچی ہوئی ہے، دنیا و دین کے دو بادشاہوں کا کل معرکہ ہے، رات گزرنے بھی نہ پائی کہ:

"ہم دریں شب ماہ بلائے از آسمان بر جان بادشاہ نازل شد"

یعنی خسرو خاں حسن پرواریچہ ہوئے سر سلطان را گرفت و با ہمداں خنجد پہلو کے سلطان را بخنجر بشگافتہ بزمین انداخت و سر آں مشئوم را از تن جدا کرد و از بام ہزار ستون بزیر افگند "طباطبائی نے کو سر را بالائے نیزہ کرد خلق نمود" میر خورد کہتے ہیں کہ جس رات کو یہ واقعہ پیش آیا، سلطان المشائخ اپنے بالاخانہ کی چھت پر ٹہلتے ہوئے زبان مبارک سے یہ شعر پڑھتے جاتے تھے ؎

اے سر و بہک چرا نشستی بجائے خویش | باشیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

(باقی آئندہ صفحہ ۲۸۰)

اسی کشمکش میں دلّی ہی کے گویا ایک محلہ میں رہنا، سلطان المشائخ کی ایمانی استقامت کی بڑی عجیب و غریب شہادت ہے، شخصی حکومت کے مطلق العنانہ اختیارات کا اندازہ کیجئے اور پھر اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیے، یقیناً ابتلار کی یہ چار سالہ مدت کم مدت نہیں ہے۔

سلطان المشائخ سے حسد اور اس کا نتیجہ

مگر پھر بھی مجھے لوگوں پر تعجب ہے کہ جب تاریخی کتابوں میں سلطان المشائخ کے متعلق اس قسم کے واقعات درج ہی کیے جا رہے تھے، تو اس سلسلہ کا جو سب سے بڑا واقعہ تھا اسی کو قلم انداز کیوں کر دیا گیا، حالانکہ میر خورد نے اسی زمانہ میں اپنی کتاب سیرالاولیاء میں بہ تفصیل اس کا تذکرہ کیا تھا، خلاصہ یہ ہے کہ غیاث الدین تغلق کے عہد میں "سماع" کے مسئلہ نے ایک سخت فتنہ کی شکل اختیار کر لی، سلطان المشائخ کے دربار کا جاہ و جلال، دسترخوان کی وسعت، ارباب حاجات کا ہر طرف سے آنا، اور غریبوں کی عام اعانت و امداد کی وجہ سے ملک میں جو ہر دلعزیزی آپ کو حاصل تھی یہی چیز بعض علماء وقت کے حسد کا باعث ہوئی، اور تو کوئی چیز قابلِ اعتراض بات سلطان المشائخ کی زندگی میں ملی نہیں، اسی غیر مزامیری سماع کے مسئلہ کو اہم بنا کر مولویوں نے محضر نامہ کی صورت میں غیاث الدین کے پاس پیش کیا، ایک صاحب جن کا نام شیخ زادہ جام حسام الدین تھا سلطان المشائخ ہی کی خانقاہ کے رہے ہوئے بلکہ پلے ہوئے تھے، میر خورد نے لکھا ہے:

"پاتابہ غریبی درخانہ سلطان المشائخ کشادہ بود"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) میر خورد نے اس شعر پڑھنے کے واقعہ کو نہیں لکھا ہے، دوسرے تذکروں میں ہے۔ البتہ سعدی کے نام سے اسی مقام پر میر نے بھی اس شعر کو استعمال کیا ہے، واللہ اعلم ۱۲

یعنی شروع شروع جب دلی آئے تو حضرت ہی کے یہاں فروکش ہوئے، بڑے آدمی شیخ جام کے خاندان سے تھے اس لیے "بانواع تربیت و شفقت سلطان المشائخ پرورش یافتہ" بعد کو شاہی دربار میں ان کو رسوخ خاص حاصل ہو گیا تھا،

مسئلہ سماع پر مباحثہ

یہی حضرت اس محضر نامہ کے پیش کرنے میں آگے آگے تھے، غیاث الدین کو حیرت ہوئی جب اس نے سنا کہ غیر مزامیری سماع بھی حرام ہے، اس نے فرمان صادر کیا:

چوں علماء دین در حرمت سماع فتوی کردہ بجہت ایں کار مزاحم شدہ سلطان المشائخ را حاضر کنند وجملہ علماء شہر واکابر را طلب کنند"	علمائے دین نے سماع کے حرام ہونے کا فتوی دیا اور اس میں مزاحم ہوئے اور حکم دیا کہ سلطان المشائخ اور تمام علماء اور اکابر شہر کو بلائیں۔

فرمان کی تعمیل ہوئی، سلطان المشائخ بھی حاضر ہوئے اور شہر کے علماء واکابر بھی بلائے گئے، اس زمانہ میں نائب السلطنت کے عہدہ پر قاضی جلال الدین لواجی سرفراز تھے محلس میں یہی سلطان المشائخ سے مخاطب ہوئے، بادشاہ بھی موجود تھا، طرفین میں گفتگو ہو رہی تھی، دونوں کی سن رہا تھا، درمیان میں فریق مخالف کے علماء جب شور برپا کرتے تو تغلق کہتا:

"غلبہ نکنید بشنوید کہ شیخ چہ می فرماید"	ہنگامہ نہ کریں بلکہ سنیں کہ سلطان جی کیا فرماتے ہیں۔

اس عرصہ میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے نواسے مولانا علم الدین بھی مجلس مناظرہ میں کہیں سے آپہنچے، غیاث الدین ان کا کچھ معتقد تھا، ان ہی کو اس نے حکم بنایا اور کہا کہ:

"بغداد و شام و روم گشتہ اید بفرمائید	آپ بغداد، شام اور روم پھر چکے ہیں فرمایئے

مشائخ آں سماع می شنوند یا نہ، و ایشاں — کہ اس دیار کے مشائخ سماع سنتے
را دریں کار کسے مانع شود یا نے؟" — ہیں یا نہیں، اور ان کے اس کام میں کوئی
مانع بنتا ہے یا نہیں۔؟

مولانا علم الدین نے جواب میں جو واقعہ تھا وہ بیان کیا، فرمایا:۔

"در ہمہ شہرہا بندگان و مشائخ سماع — تمام شہروں میں مشائخ اور بزرگ
می شنوند" — سماع سنتے ہیں۔

بلکہ یہ بھی کہا کہ بعض مقامات میں تو "دف و چغانہ" کے ساتھ بھی سنتے ہیں۔

"و کسے ایشاں را مانع نمی شود" — کوئی انھیں روکتا نہیں ہے۔

تغلق نے ان کی یہ رپورٹ جب سنی

"ساکت شد ہیچ نہ گفت" — خاموش ہوگیا کچھ نہیں کہا

نائب السلطنت قاضی جلال الدین نے بادشاہ پر اصرار کیا کہ ممانعت سماع کا فرمان جاری کر دیجئے، سلطان المشائخ نے کہا بادشاہ ایسا حکم نہ صادر کریں، تغلق نے سلطان المشائخ ہی کی بات مان لی، یعنی کوئی فیصلہ نہ ہوا، جو حال اب تک تھا وہی باقی رہا، مولانا فخر الدین زرادی کے عربی رسالہ سے یہ فقرہ میر خورد نے نقل کیا ہے، جس میں اس مجلس مناظرہ کی کیفیت درج ہے۔

وکان ذلک من اول الضحیٰ الی — ابتدا وقت چاشت سے سایہ ڈھلنے
اوان الفیئ ثم قام اھل المجلس — تک مناظرہ کی یہ مجلس قائم رہی، پھر لوگ
من عند السلطان۔ — بادشاہ کے سامنے سے اٹھ گئے۔

بہر حال یہ تو مجلس مناظرہ کا مختصر حال ہے، میر خورد نے دیگر جزئیات کی بھی تفصیل لکھی ہے۔

سلطان المشائخ کے تاثرات میر خورد نے اس کے بعد مولانا ضیاء الدین برنی صاحب

تاریخ فیروز شاہی کے رسالہ "حسرت نامہ" سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ:

"چوں حضرت سلطان المشائخ از محفر مذکور در خانہ آمد بوقت نماز پیشین (ظہر) مرا و مولانا محی الدین کاشانی وامیر خسرو شاعر را طلب فرمود"

حضرت سلطان المشائخ جب محفل سے اندر گھر میں آئے تو ظہر کی نماز کے وقت مولانا محی الدین کاشانی اور امیر خسرو شاعر کو طلب فرمایا۔

برنی کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ حضرت کی خدمت میں جمع ہو گئے اُس وقت حسب ذیل تقریر سلطان المشائخ نے شروع کی۔

"گفت کہ دانشمندان (علماء) دہلی بعداوت وحسد من پُر بودند میداں فراخ یافتند وسخنہائے پراز عداوت ایشاں بسیار گفتند"

فرمایا کہ علماء دہلی مری عداوت وحسد سے بھرے ہوئے تھے میدان وسیع پایا تو عداوت سے بھری ہوئی بہت سی باتیں کیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس میں جو تقریریں ہوئی تھیں ان سب کا خلاصہ سلطان المشائخ نے ذکر فرمایا، آخر میں ارشاد ہوا۔

"عجبے امروز معائنہ شد کہ در معرض حجت احادیث صحیحہ[1] حضرت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نمی شنوند ومی گویند کہ در شہر ما"

آج عجیب بات دیکھنے میں آئی کہ بحث کے موقع پر مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث بھی نہیں سنتے۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارے شہر میں .

---

[1] خدا جانے بیجاپور میں بیٹھے بیٹھے ہندو شاہ کے بیٹے قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں کہاں سے یہ بات اڑالی کہ امام غزالی کا قول یجوز لاہلہ ولا یجوز لغیر اہلہ کو حدیث قرار دے کر سلطان جی نے پیش کیا، کیا تماشا ہے دوہزار سے اوپر حدیثوں کے حافظ پر یہ الزام ہے، اسی مجلس میں مولانا فخر الدین زرادی موجود تھے گزر چکا کہ وہ دعوے کے دونوں پہلو جواز و عدم جواز پر دلیل پیش کرنے کے لیے تیار تھے ۱۲

عمل بروایت فقہ مقدم ست برحدیث" روایت فقہ پر عمل بمقابلہ حدیث مقدم ہے۔
اور صرف یہی نہیں، برنی نے براہِ راست سلطان المشائخ کی زبان سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔

ہر بارکہ حدیث صحیح حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مذکور می شد بری آمدند و منع می کردند و می گفتند ایں حدیث متمسک شافعی است و او دشمن علمار ما است ما نمی شنویم"	جب جب حدیث ذکر کی جاتی تھی تو برافروختہ ہوتے اور منع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ امام شافعی کی دلیل ہے اور وہ ہمارے علمار کے دشمن ہیں ہم اسے نہیں مانتے۔

اسی کو "بدنام کنندہ نکو نامے چند" کہتے ہیں، کیا واقعۃً یہی حقیقت ہے، یہی امام ابو حنیفہ اور علمائے احناف کا مسلک ہے، کیا ان خرافات کا اظہار جب ان مولویوں کی زبانوں پر ہو رہا تھا، تو وہ اصل حقیقت سے آگاہ نہ تھے، لیکن ان کو حسد اندھا بنائے ہوئے تھا، اس وقت ان کا ایمانی نور گہن میں آگیا تھا، سب کچھ جانتے تھے مگر جیسا کہ سلطان المشائخ نے فرمایا،

"با اعتقاد اند یا نہ کہ بحضور اولی الامر بمکابرہ می آیند"	اعتقاد ہے یا نہیں کہ بادشاہ کے سامنے دھاندلی کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ صرف دھاندلی اور مکابرہ سے محض اپنی بات کی بیجا طرفداری بادشاہ کے سامنے کر رہے تھے،

غلط استدلال

تعجب ہے کہ سلطان المشائخ کے اسی بیان کو بعض لوگوں نے اس کی دلیل بنالیا ہے کہ ہندوستان کے علمار حدیث سے ناواقف تھے، حالانکہ یہ جو کچھ کہا جا رہا تھا ناواقفیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ صرف ضد، ہٹ دھرمی، حسد، شرارت نفس کا نتیجہ تھا، اسی کے بعد سلطان المشائخ ہی کے الفاظ یہ ہیں۔

"ہیچ عالمے ندیدم و نشنیدم کہ پیش او احادیث صحیح حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کردہ آید و او گوید کہ من نمی شنوم من نمی دانم"	میں نے کسی عالم کو نہیں دیکھا اور نہ سنا کہ اس کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کی جائیں اور وہ کہے کہ میں نہیں سنتا اور نہ جانتا ہوں۔

سلطان المشائخ بیچارے تو ہندوستان سے باہر ایک دن کے لیے بھی کہیں تشریف نہیں لے گئے، ان کا "ندیدم" کھلی ہوئی بات ہے کہ ہندوستان ہی کے علماء سے متعلق ہو سکتا ہے، جس کا یہی مطلب ہوا کہ اس مجلسِ خاص میں جو گفتگو ہو رہی تھی، وہ علمی نہیں بلکہ صرف حسدی گفتگو اور معاندانہ جحود و تعنت تھا، ورنہ کیا عام علماء ہند کا وہی حال تھا، جب سلطان المشائخ نے دیکھا تھا، بھلا ایسا کونسا مسلمان ہو سکتا ہے جو حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث ماننے کے بعد بھی یہ کہہ دے کہ میں اسے نہیں مانتا، زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہی کہ مثلاً نسخ کا تخصیص کا تاویل کا دعویٰ کرے، نہ کہ علانیہ اقرار کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ماننے کے باوجود میں نہیں مانتا، کیا ایسے شخص کا اسلام باقی رہ سکتا ہے؟ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان مولویوں کی غرض بھی یہی ہوگی یعنی جس مقصد کو اس حدیث سے لوگ ثابت کرنا چاہتے ہیں، ہم اس مقصد کے لیے اس حدیث کو مفید نہیں سمجھتے، لیکن بادشاہ جاہل تھا علمی اصطلاحات کو کیا سمجھتا، انہوں نے اس کے سامنے ایسی تعبیروں میں اپنے مدعا کو پیش کیا کہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے ایمان کانپ جاتا ہے۔

سلطان المشائخ کی دلی اذیت کا نتیجہ بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ سلطان المشائخ پر علماء کے اس طرزِ عمل کا سخت اثر تھا، اور کیوں نہ ہوتا، علانیہ رسول کی حدیث کی توہین کی گئی تھی، ضیاء برنی نے اس کے

تغلق) در سنہ خمس وعشرین وسبعمأتہ ۔ واقعہ ۷۲۵ھ میں پیش آیا۔

۷۲۵ھ روئے نمود (ص ۲۲۵)

اور دلی کی اینٹ سے اینٹ بجانے والا، دلی کے ایک ایک متنفس کو دلی سے جلاوطن کر کے دیوگڑھی (دولت آباد) لیجانے والا، اور ان سارے مصائب ہائلہ کا سر چشمہ جس کا نام محمد تغلق ہے

" سلطان محمد عادل شاہ بن تغلق شاہ	سلطان محمد عادل شاہ ولد تغلق
کہ الغ خاں باشد در سنہ خمس	شاہ ۷۲۵ھ میں امراء اور ارکان
وعشرین وسبعمأتہ باتفاق امراء ارکان	سلطنت کے اتفاق سے سلطنت کی
دولت بر مسند سلطنت نشست"	مسند پر جلوہ افروز ہوا،

(ص ۲۲۵ البداؤنی)

میں اب اس پر کچھ اضافہ کرنا نہیں چاہتا، صرف اتنی بات کہ برنی نے جو الفاظ سلطان جی کی زبانی نقل کیے ہیں، ان کو سامنے رکھ لیجئے اور "محمد تغلق" جس نے خود تو اپنا نام "عادل" رکھا تھا، لیکن عوام میں "محمد تغلق خونی" کے نام سے مشہور ہے، اس کی چھبیس سال کی حکومت کی تاریخ پڑھ جائیے، اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھیے، ہو سکتا ہے کہ محمد تغلق کی مختلف الآثار وا بجواب متضاد صفات والی حقیقت عامہ مؤرخین واہل نظر کے لیے جو معمہ بنی ہوئی ہے، وہ معمہ حل ہو جائے

سعید بن جبیرؓ کی شہادت اور حجاج کا حال

مشہور ہے کہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالی عنہ تابعی کو حجاج نے شہید کیا، اور اس پر وہ خاص کیفیت طاری ہوئی یعنی۔

کان اذا نام دای سعید بن ۔ جب حجاج سوتا تو خواب میں حضرت سعید کو

جبیرا خذ بمجامع ثوبه
يقول يا عدو الله فيم
قتلتني فاستيقظ مذعوراً
ويقول مالي ولسعيد
(الیافعی ص ۱۹۸)

دیکھتا کہ وہ اس کے کپڑوں کو پکڑے ہوئے فرما رہے
ہیں اے خدا کے دشمن کس قصور میں تونے
مجھے قتل کیا۔ حجاج اس خواب کو دیکھ کر
ڈرا ہوا اٹھ جاتا اور بولتا کہ سعید کو ہم سے کیا
تعلق ہو گیا ہے۔

اور ابن جبیر ہی کے قتل کے بعد اس کو وہ بیماری ہوئی، جس کا نام لوگ "زمہریرہ" بتاتے ہیں، ایسی سخت سردی کلیجے سے اٹھ کر سارے جسم پر چھا جاتی تھی کہ کانپتا جاتا تھا اور۔

وكانت الكوانين تجعل
حوله مملوءة ناراً وتدنى
منه حتى تحرق جلده
وهو لا يحس بها۔

انگیٹھیاں آگ سے بھری اس کے پاس
لائی جاتی تھیں اور اس سے قریب کی جاتیں
تا آنکہ اس کی کھال بھی جل جاتی لیکن اسکو حس بھی
نہ ہوتا۔

پیٹ میں اطباء نے سرطان تجویز کیا، یافعی وغیرہ نے لکھا ہے کہ:

فدعا بالطبيب فاخذ لحما و
علقه في خيط وسرحه في
حلقه وتركه ساعة ثم اخرجه وقد
علق به دود كثيرة (یافعی ج اص ۱۹۵)

حجاج نے طبیب کو بلایا، طبیب نے گوشت کا ایک
ٹکڑا لیا اور اس میں تاگا باندھا اور گوشت کے اس
ٹکڑے کو حجاج کے حلق میں اتار دیا تھوڑی دیر کے بعد تاگے
کو کھینچا تو دیکھا کہ اس گوشت کے ٹکڑے میں بکثرت کیڑے لپٹے ہوئے ہیں۔

کہتے ہیں کہ جب مادی تدبیروں سے حجاج مایوس ہو گیا، تو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو بلوایا، اور دعا کی درخواست کی، ابن عساکر نے لکھا ہے کہ حضرت حسن اس کے اس حال کو دیکھ کر بے ساختہ رو کر رونے لگے اور حجاج کو مخاطب کر کے فرمانے لگے:۔

قد نهيتك ان تتعرض للصالحين (الیافعی ص ۱۹۵) میں نے حجاج تجھے منع کیا تھا کہ نیک بندوں کو چھیڑنا

سلطان المشائخ کی اذیت اور باشندگانِ دہلی

ظاہر ہے کہ حجاج کے پیٹ کا آکلہ (سرطان) ہو یا زمہریرہ (سردی) کی بیماری ہو، یہ تو بجائے خود ایک واقعہ ہے، لیکن یہ بات کہ یہ کیفیت حضرت سعید بن جبیرؒ کے قتل اور خون ناحق کی آواز بازگشت تھی، جس کی طرف خواجہ حسن بصریؒ نے اشارہ فرمایا، اس کا آپ کو اختیار ہے کہ مانیے یا نہ مانیے[1] بجنسہ یہی کیفیت محمد تغلق کی ہے، اس کا جنون اور عجیب و غریب جنون جس کی نظیر شاید تاریخ میں نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ بعد کہ لاکھوں کی آبادی رکھنے والے معمور شہر کو بہ یک گردش قلم ویران کرتا ہے اور ایسا ویران بقول ملا عبد القادر بداؤنی۔

دہلی چناں خراب شد کہ سگ و گربہ ہم	دہلی اس طرح برباد ہوئی کہ اس میں
دراں زمانہ دراں بین حسب حال آں بود	کتے اور بلیاں نہ رہے اور یہ شعر اس کے حسب حال ہے

جائے کہ بود زاں دلستاں با دوستاں در بوستاں
شد گرگ و روبہ را مکاں شد گرگ و کرگس را وطن

---

[1] بلا تشبیہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ولادت باسعادت نبوت کبریٰ کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر پڑے، بحیرۂ ساوہ خشک ہو گیا، اب بعض لوگ خواہ مخواہ عقلی محفلوں میں جگہ حاصل کرنے کیلئے ان واقعات ہی کا انکار کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ واقعات تو تاریخی ہیں کہتے ہیں طاق کسریٰ کے کھنڈر مدائن میں اب بھی جس حال میں موجود ہیں، اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زلزلہ زدہ عمارت ہے اور اسی زلزلہ میں اس کے مشہور کنگرے گر گئے تھے یوں ہی عرب کا نقشہ اٹھا کر دیکھیے آپ کو نجد کی وادی میں ایک خشک دریا ساوہ نامی نقشہ میں نظر آئے گا۔ بہرحال ان واقعات کا انکار کرنے کا تو نہیں، ہاں! ہم مسلمان لوگ، اپنے پیغمبر کی ولادت کے علامات میں ان حوادث کو شمار کرتے ہیں اور جنہیں پیغمبر سے عقیدت نہیں ہے وہ اس کی توجیہ کسی کونی قانون کے تحت کر سکتے ہیں۔ ۱۲

مردم و جانور شماری

عجیب و غریب جلاوطنی کا یہ واقعہ ضرور پیش آیا، دوآبہ کی رعایا پر سخت قسم کے ٹیکس عاید کرنا۔

"گاؤ شماری و خانہ شماری در سوم بد بنہاد[1] — گائے شماری اور گھروں کی گنتی اور دوسری
دیگر نیز پیدا کرد کہ موجب خرابی و ویرانی، — بری رسمیں جو ملک کی خرابی اور ویرانی کا سبب ہیں
آں ولایت بالکلیہ گردید ضعیفاں نابود — جس سے کمزور لوگ نیست و نابود ہو گئے
شدند، اقویا ربنیاد فساد نہادند" — اور قوی لوگوں نے فساد کی بنیاد رکھی۔

نیز "سکہ" کے مسئلہ میں جو حماقتیں باایں ہمہ عقل و ہوش اس بادشاہ سے سرزد ہوئیں کہ لوگ۔

"مس بدل الفرہ آوردہ سکوک می گردانیدند — لوگ پیتل کو سکہ ڈھالنے کی جگہ لا کر سکے
دامتعہ واسلحہ بان خریدہ در اطراف — ڈھلواتے اور اس سے سامان اور اسلحہ
عالم می فرستند ..... وبدیں حیلہ زر — خرید کر دنیا بھر میں بھیجتے تھے اس بہانہ
زرہائے بسیار اندوختند امامردم دار السلطنت — میں لوگوں نے بہت سی دولت جمع کر لی
(دہلی) بخاک سیاہ برابر شدند — باقی دار السلطنت کے باشندے خاک سیاہ
رہبیر الناظرین ص ۱۲۵ — ہو گئے۔

قحط کی مصیبت

قحط کی وہ صورت نمایاں ہوئی کہ
گندم قیمت آدم پیدا کرد و برنج — گیہوں آدمی کی قیمت کو پہنچ گیا اور چاول

---

[1] اعداد و شمار کا ضبط جن فاسد اغراض کو سامنے رکھ کر یورپ نے اس زمانہ میں پھیلایا ہے خدا کی بسائی دنیا جو اس علوم زمانہ سے موت و حیات کی ایک خاص گردش کے ساتھ چل رہی ہے اس کے حوادث پر قابو پانے کا جو ارادہ اس زمانہ میں ان ہی عددی مواد کی بنیاد پر کیا جا رہا ہے گویا اس کی ابتدا کم از کم سرزمین ہند میں اسی ہندی بادشاہ نے کی کہ بیلوں اور بھینسوں کو بھی گنوانا شروع کیا ۱۲۔

ہم سنگ طلا گردید، غلہ کمیاب بلکہ نایاب

گردید تہی دستاں بگرسنگی مردند

متوسطین ہم جاں بحق تسلیم کردند"

بھی سونا بن گیا اور غلہ کمیاب ہی نہیں نایاب

ہو گیا بیسیوں لوگ بھوک سے مر گئے اور اوسط درجہ

کے لوگوں نے بھی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

اور اس پر کریلے کو نیم پر دلی میں یوں اور چڑھا دیا گیا کہ:

" سلطان بے رحم سیاہ دروں دروازہائے

شہر (دہلی) بند کرد تا ہیچ کس از شہریاں

بیروں نہ رود، عامہ خلائق بدیں سبب

زیادہ از حد شمار بگرداب فنا فرو شدند" (قرشی)

بادشاہ سیاہ دل نے دہلی شہر کے دروازے

بند کر دیئے تاکہ شہری شہر سے باہر نہ جا سکے

نتیجہ یہ ہوا مخلوق خدا ان اسباب کی بنا پر

بے زیادہ فنا کے گھاٹ اتر گئی۔

ظالم بادشاہ نے بالاخانہ سے جب اپنی بربریت و وحشت کے اس دردناک نتیجہ کا معائنہ کر لیا، تب اس کی تسلی ہوئی، کہا جاتا ہے، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ اندھے فقیر کو دلی سے گھسیٹ کر سپاہی دولت آباد کی طرف لے چلے، وہ مر گیا، اس کے جسم کا ایک ایک عضو راستہ میں گرتا چلا گیا، تا ایں کہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل اس شکل میں ہوئی کہ گھسٹتی ہوئی لاش کا صرف ایک ہاتھ دولت آباد کی سرزمین میں لا کر دفن کیا گیا۔

ظلم وجور کی انتہا

واقعہ یہ ضرور ہوا، اسی طرح ہوا جیسے ہمالیہ کی راہ سے چین پر چڑھائی کی مہم روانہ کی گئی، جواب تک واپس نہیں ہوئی، خلاصہ یہ ہے کہ جب تک دلی میں رہا۔

" پیوستہ پیش سراپردہ سلطانی و درگاہ

دیوانی کشتہ پشتہ واز مردہ تودہ بودہ

کناساں و جلاداں از کشیدن کشتن ایشاں

بستوہ آمدہ بودند" (بداؤنی ص ۲۳۸)

بارگاہ سلطانی کے سامنے جلادوں کے

قتل و غارت گری سے کشتوں کے پشتے

اور مردوں کے تودے لگ گئے۔

کشتوں کے یہ پشتے اور مردوں کے تودے جن جن شکلوں میں ڈھیر کیے جاتے تھے،
طبا طبائی کا بیان ہے کہ:

"بریدن دست وپا وگوش وبینی ومیل کشیدن در چشم، دگر نرم استخوانہا بمیخ کوب وسوختن اندام ذی حیات باآتش وکشیدن پوست بدن، ودو پارہ ساختن آدمی وبستن مانند اشتن درپائے فیل و بدار کشیدن"

ہاتھ پاؤں کان اور ناک کا کاٹنا آنکھوں میں سلائی پھیرنا ہڈیوں کو چور چور کرنا زندہ کے جسم کا آگ میں جلانا، کھال کھینچنا آدمی کو دو حصوں میں چیر ڈالنا اور انھیں ہاتھیوں کے پاؤں میں باندھنا اور روندا جانا اور سولی دینا یہ سب کچھ ہوا۔

جس میں کسی کی کوئی خصوصیت نہ تھی،

"مردم ہر طائفہ از صوفی وقلندر ولشکری دلونیسندہ وعمال ورعیت وتاجر باندک تقصیر وکمتر لغزش سیاست عظیم کردی"
(ص ۱۲۴)

ہر جماعت کے لوگ اس میں گرفتار ہوئے صوفی وقلندر فوجی اور مصنف افسران رعایا، تجار معمولی تقصیر اور ذرا سے نام لغزش پر بڑی سزا پاتے تھے۔

واقعہ سب کے سامنے ہوا، لیکن کیوں ہوا، دلی پر بلکہ ہندوستان پر اچانک یہ آفت کہاں سے لوٹ پڑی، لوگوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا؟
یہ جستہ جستہ فقرے ان لوگوں کے لیے میں نے معتبر تاریخوں سے نقل کر دیے ہیں، تاکہ جن لوگوں کی نظر تاریخ پر نہ ہو، یا واقعات مستحضر نہ ہوں، ان کے سامنے تازہ شکل میں وہ نقشہ گھوم جائے جس کا اندیشہ سلطان المشائخ نے علماء، دلی کی توہین حدیث نبوی کے بعد ظاہر فرمایا تھا، تعجب تو اس پر ہے کہ یہ حیرت انگیز مدہش عقیلالمثال ساری باتیں کس بادشاہ سے سرزد ہوئیں،
جس کے متعلق ارباب تاریخ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ:

"دراکثر علوم خصوصاً تاریخ و معقولات و نظم و انشاء وغیرہم مہارت تمام داشت"	بیشتر علوم میں مہارت رکھتا تھا خصوصیت کے ساتھ تاریخ، معقولات نظم اور انشاء وغیرہ میں

یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ:

گاہ در نماز و روزہ و ترویج احکام شرع قیام نمودہ در اجتناب ملاہی و مسکرات وسائر مناہی کوشش بلیغ نمودہ بہ تعصب می رسانید" (سیر المتاخرین ص ۴۲۳)	کبھی نماز، روزہ اور احکام شرع کی ترویج میں کوشاں ہونے اور کھیل کود، نشہ اور تمام منکرات سے بچنے میں کوشش بلیغ کرتا جو تعصب کی حد تک پہونچ جاتا۔

اب آپ کا جی چاہے، جیسا کہ قرآن نے روشن خیالوں کا یہ نظریہ حوادث کائنات کے متعلق نقل کیا ہے کہ

قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ	مصیبتیں اور مسرتیں دونوں قسم کے واقعات گذشتہ نسلوں پر بھی گزرتے رہے ہیں (اس لیے ان کے پیچھے کسی اخلاقی قانون کی حکومت کو پوشیدہ سمجھنا حماقت ہے)

کی عام مادی ذہنیت والوں کی تعبیر کی چادر اٹھا کر جو چیز محسوس کرائی گئی ہے اُسے اپنے لیے نامحسوس بنا لیجئے یا خوش اعتقادی وغیرہ کے الفاظ کی عصری گالیوں کے برداشت کرنے کی صلاحیت ہو تو آپ بھی تخلفی عجائب و غرائب جلاو بلا، قحط و وبا میں وہی دیکھیے جو آج ہی نہیں،

علماء کا انجام

اسی زمانہ میں جب دلی میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا، دیکھنے والے دیکھ رہے تھے، میر خورد نے مجلس مناظرہ کے واقعات بالا کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

اناں بود کہ درچہارم سال ازیں ماجرا	مناظرہ کے چوتھے سال وہ تمام علماء جو

تمامی علمار کہ دریں محضر (مجلس مناظرہ)	اس مجلس میں شریک تھے اور ان کے
بودند و دیگراں را ہم بہ سبب ایشاں	سبب سے دوسرے علماء بھی دیوگیر جلاوطن
در دیوگیر جلا کردند و بیشترے ازاں	کر دیئے گئے اور ان میں سے بہت سے
علمار در دیوگیر سر نہادند قحطے مہلک	علماء وہیں جاں بحق ہوئے ہلاک کرنے
دو بائے سخت در شہر پیدا شد"	والا قحط اور سخت وبا شہر پر مسلط ہوئی۔

میر خورد کے سامنے کی بات ہے، آخر میں لکھتے ہیں :-

" تا ایں غایت ایں بلاہا بکلی دفع نمی شود	اب تک یہ مصائب پورے طور پر دفع
سبحان اللہ ہر سخنے کہ بر زبان مبارک	نہیں ہوئے ہیں خدا کی مشیت سے جو بات
سلطان المشائخ گذشتہ بود عین آں	بھی سلطان المشائخ کی زبان مبارک
معائنہ ومشاہدہ شد" ص ۵۳۲	سے نکلی تھی بعینہ مشاہدہ ومعائنہ میں آئی۔

اور اسی پر مجھے تعجب ہے کہ محمد تغلق کی فتنہ سامانیوں کے پیچھے اسی زمانہ میں لوگوں کو علمار دلی کی وہ گستاخیاں نظر آئیں جو اللہ کے ایک دوست اور محبوب کو ذلیل کرنے کے لیے پیغمبر کی حدیث کی تحقیر و توہین پر بھی آمادہ ہوگئے تھے، لیکن اتنا بڑا واقعہ تو بھلا دیا گیا، اور صرف " ہنوز دلی دور است" یا قطب الدین مبارک کے اچانک قتل کا واقعہ لوگوں کو یاد رہ گیا۔

میرا مقصد اس واقعہ کے نقل کرنے سے جہاں ایک عجیب وغریب تاریخی واقعہ کی ایک توجیہ کا تذکرہ ہے۔ اسی کے ساتھ ان عزیزوں سے بھی التماس ہے جو اپنے چند سرسری سطحی بے سروپا معلومات کو سامنے رکھ کر ایسے نتائج پیدا کر رہے ہیں، جن کا حاصل اس کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے، کہ جب مسلمانوں کے ہاتھ میں حکومت تھی، دولت تھی، اقبال تھا، جلال تھا، اس وقت تو وہ خود ان کے علمار، ان کے اولیار سب اسلام سے دور تھے، لیکن جب سب کچھ

جاتا رہا تو غلامی کے اس دور میں اب حقیقی اسلام ان کے سامنے چہرہ پرداز ہوا ہے،

خواجگان چشت کی خدمت

پچھلے دنوں میں ایسے مضامین شائع ہوئے جن سے دل کو سخت دکھ پہنچا، اور گو مجھے بہت کچھ کہنا ہے، لیکن جیسے جیسے موقعہ ملتا جائے گا، اس سلسلہ میں جو اپنے حقیر معلومات ہیں۔ اُنہیں پیش کرتا چلا جاؤں گا، شاید غلط فہمیوں کا اس سے کچھ ازالہ ہو، میں نے قصداً اپنے اس مضمون میں خواجگان چشت اور ان میں بھی سلطان المشائخ کے حالات کے تذکرہ میں ذرا زیادہ طوالت سے اسی لیے کام لیا کہ ہندی مسلمانوں کی قلبی تربیت، اور اخلاقی نشوونما ایمانی رسوخ، اعتقادی شگفتگی، شرح صدر، کا زیادہ کام اسی خانوادہ سے متعلق رہا، اور ان میں بھی سب جانتے ہیں کہ حضرت سلطان المشائخ نظام الاولیاء کے خدمات بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ ان ہی کے حالات پر دوسرے بزرگوں کے حالات کو بھی قیاس کیا جائے گا، واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی نمائندگی اور اپنے پیغمبر کے دین کی مخلصانہ خدمت، تجنی راستبازی، وفا شعاری، بے نفسی کے ساتھ ان بزرگوں نے انجام دی ہے، بڑی ناشکری ہوگی اگر غیروں کے اغوا سے جس کا اکثر حالات میں لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا ان کے خدمات کی اہمیت گھٹائی جائے۔ اصل حقیقت کا انکشاف تو اسی دن ہوگا جس دن "السرائر" کو "الظواہر" کا رنگ دیا جائے گا، لیکن یوں بھی عام مسلمانوں کا "تلقی بالقبول" میرے نزدیک تو ان بزرگوں کی مقبولیت الٰہیہ کی دلیل ہے،

سلطان المشائخ کا حال مرض الوفات میں

آپ تسلیم کریں یا نہ کریں، لیکن اسی زمانہ کے لوگوں کی یہ روایت ہے کہ جب سلطان المشائخ پر وقت ناگزیر آگیا تو ٹھیک جو حال شیخ کبیر شکر گنج کا نماز کے باب میں تھا

کہ بار بار پوچھتے، اور دہرا دہرا کر ایک ہی نماز کو ادا کرتے، یہی حال سلطان المشائخ پر بھی طاری تھا، نیم بے ہوشی کی سی حالت تھی، اسی حالت میں پوچھتے

"وقت نماز شدہ است و نماز گذاردہ ام اگر گفتند کہ شما نماز گذاردہ اید می فرمود بار دیگر بگذارم" — نماز کا وقت ہو گیا اور میں نے نماز ادا کر لی؟ اگر لوگ بتاتے کہ ادا فرما چکے تو فرماتے تھے دوسری مرتبہ بھی ادا کر لوں۔

پھر جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں بیان کیا ہے کہ انبار خانہ اور جو کچھ بھی گھر میں تھا، سب کو آپ نے لٹوا دیا، لٹوا دیا، لوگوں نے "مقام مستودع" یعنی قبر کے متعلق دریافت کیا، فرمایا۔

"من زیر عمارت کسے خفتنی نہ ام، من در صحرا خواہم خفت[1]" — میں کسی شخص کی عمارت کے زیر سایہ سونے والا نہیں ہوں میں تو میدان میں آرام کروں گا۔

عیادت کے لیے شیخ زکریا ملتانی کے پوتے مولانا رکن الدین آئے، بعض تشفی و تسلی کے کلمات فرما رہے تھے، اور یہ کہ اللہ آپ کو ہم لوگوں میں زیادہ دیر تک سلامت رکھے،

"تا ناقصاں را کمالے حاصل شود" — تاکہ ناقص لوگوں کو کوئی کمال حاصل ہو جائے

"ایں نشنت سلطان المشائخ چشم پر آب کردہ فرمود" — سلطان المشائخ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر فرمایا۔

---

[1] میر خورد نے لکھا ہے کہ حضرت والا کو لوگوں نے ایک کھلے میدان میں ہی حسب خواہش دفن کیا تھا، آنجا کہ روضہ متبرکہ سلطان المشائخ است صحرا بود" لیکن بعد کو ہی محمد تغلق نے قبر شریف پر گنبد عمارت کنانید" (سیر الاولیاء ص ۱۵۴)

"من حضرت رسالت را صلی اللہ علیہ وسلم	میں نے رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم
در خواب دیدہ ام کہ می فرمود نظام!	کو خواب میں دیکھا ہے فرما رہے تھے نظام!
اشتیاق تو ما را بسیار است"	ہمیں تیرا بہت اشتیاق ہے۔

مجلس ان کلمات کے سننے کے ساتھ زیج اُٹھی، مولانا رکن الدین پر بھی گریہ طاری تھا۔
آپ دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں کے خدمات کی قیمت آج گھٹائی جا رہی ہے،
بلکہ جن پر رسول کے دین کے بگاڑ کا الزام لگایا جا رہا ہے خود رسول اللہ (صلی اللہ
علیہ وسلم) کی نگاہ میں اس کا اور اس کے کارناموں کا کیا مقام ہے، رضی اللہ ورسولہ
عنہم ورضوا عنہما خدا جانے اصل مضمون کو میں نے کہاں چھوڑا تھا، غالباً اسی کا ذکر ہو رہا
تھا کہ ہمارے قدیم تعلیمی نظام کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ دماغوں کی تصقیل
وتشحیذ کے بعد میدان عمل میں آنے سے پہلے عموماً قلوب کی تصحیح کا مسئلہ قریب قریب ایک
لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا تھا، اسی سلسلہ میں خواجگان چشت اور ان کے
قرآنی ذوق کا ذکر آ گیا، بات چونکہ عام خیالات کے خلاف تھی، ضرورت ہوئی کہ
ذرا تفصیل سے کام لیا جائے سلطان المشائخ کا وجود میرے نزدیک صرف چشتیوں ہی
میں نہیں بلکہ ہندوستان کے عام صوفیا میں ایک مثالی وجود تھا، اور ان کے حالات
بھی ایسے ذرائع سے جو ممکنہ حد تک "تاریخ میں معتبر ترین ذرائع سمجھے جا سکتے" ہیں
باآسانی مل سکتے تھے، اس لیے ان کے تذکرہ میں کافی طوالت سے قصداً کام لیا گیا
گویا سمجھنا چاہیئے کہ ایک طرح سے سلطان المشائخ کی سوانح عمری ہی درج
ہو گئی، اگرچہ اس کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے، خدا کرے کہ اس کے
لکھنے کی مجھے توفیق میسر ہو، واللہ علی ما یشاء قدیر۔

دماغ کے ساتھ دل کی اصلاح کی ضرورت

اب میں اپنے اصل مضمون کی تکمیل کی طرف متوجہ
ہوتا ہوں۔ میں نے جو دعویٰ کیا تھا کہ تری

دماغ کی تصحیح سے علم صحیح کے فوائد و ثمرات نہ خود عالم کو حاصل ہو سکتے ہیں، اور نہ دوسروں کو جیسا کہ چاہیے وہ فائدہ پہنچا سکتا ہے، اس خیال کی تائید غالباً سلطان المشائخ کی زندگی کے واقعات سے بھی ہو سکتی ہے، علی الخصوص محفلِ سماع والی مجلس میں دل کی اصلاح سے غافل ہو کر محض دماغ والے مولویوں نے جو کر وہ نمونے اپنی نفسانیت، دنائت، حسد، انانیت وغیرہ کے پیش کیے، اس سے بھی قلبی تصحیح کی ضرورت آپ خود انصاف کیجیے کہ کتنی اہم ہو جاتی ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ قاضی جلال الدین لوالجی جیسا عالم بھی باوجود سب کچھ جاننے کے محض سلطان المشائخ کی شخصی عداوت اور حسد کے نشہ میں سرشار ہو کر علانیہ بھرے دربار میں اس قول کی ہمت کرتا ہے کہ:

"ایں حدیث متمسک شافعی ست" او	یہ حدیث امام شافعی کی دلیل ہے وہ
دشمن علمائے ماست مانمی شنویم ونمی	ہمارے علماء کے دشمن ہیں تو ہم سنتے
دانیم"	ہیں نہ جانتے ہیں۔

اور یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کے متعلق مدعی ہوتا ہے کہ میں اس کو نہیں مانوں گا، میر خورد کا بیان ہے کہ قاضی جلال الدین نے بادشاہ کے سامنے سلطان المشائخ کو اس کی بھی دھمکی دی، کہ

"اگر سماع بشنوی من حاکم شرع ام ترا	اگر آپ نے قوالی سنی تو میں حاکم
بیازارم	شرع ہوں آپ کو اذیت دوں گا۔

سلطان المشائخ قاضی کی تمام باتوں کو سن کر

"حلم می ورزید وتحمل می کرد"	برداشت کیا اور تحمل سے کام لیا۔

لیکن اس کی اس دھمکی پر زبان مبارک سے صرف "معزول باد" کا فقرہ نکل گیا، کہتے ہیں کہ

"بعد از دوازدہ روز معزول شد" بارہ دنوں بعد معزول ہو گیا۔

خیر یہ تو الگ بات ہے، میں تو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ علم جب تک دماغ اور تن سے تعلق رکھتا ہے، اس وقت تک آستین کے سانپ سے زیادہ اس کی وقعت نہیں، اس کی یہ کتنی اچھی مثال ہے۔

قاضی محی الدین کا شانی

اسی کے مقابلہ میں اسی دلی کے دوسرے قاضی محی الدین کا شانی کو دیکھیے، شیخ محدث وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ التمش کے عہد کے مشہور قاضی قطب الدین کے نواسے تھے، اور مدتوں خود بھی درس وتدریس کا کام انہوں نے شہر میں انجام دیا تھا، اسی وجہ سے "استاد شہر بود" لیکن دماغ کے ساتھ ان کو اپنے قلب کی اصلاح کا موقع بھی سلطان المشائخ کی صحبت میں مل گیا تھا، ان کی استعداد وصلاحِ مزاج کو دیکھ کر سلطان المشائخ نے ان کی خاص تربیت کی تھی، جس خاص خدمت کے لیے ان کا انتخاب سلطان المشائخ نے کیا تھا اس کا اندازہ خلافت نامہ کے اس فقرہ سے ہو سکتا ہے، جو سلطان المشائخ نے ان کو لکھ کر دیا تھا، آخری فقرہ یہ تھا۔

فان فعلت ما امرتك وظني بك ان تفعل كذلك فانت خليفتي وان لم تفعل فالله خليفتي على المسلمين

پس اگر تم نے وہی کیا جس کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے تو میرا گمان تمہارے ساتھ یہی ہے کہ تم ایسا ہی کرو گے اور اس صورت میں تم میرے خلیفہ اور جانشین بن سکتے ہو اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو پھر مسلمانوں کی نگرانی کے لیے میرے خلیفہ اللہ تعالیٰ ہیں۔

مجھے یہی دکھانا ہے کہ یہ سارا قصہ بھی "المسلمین" کے لیے تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی حفاظت وصیانت کے لیے تھا، قاضی کا شانی میں باوجود خاندانی قاضی ہونے اور مولوی ہونے کے چند ہی دنوں میں سلطان المشائخ کی صحبت میں وہ ایمانی قوت پیدا ہوئی کہ

[1] حاشیہ ص ۳۱۱ پر ملاحظہ کریں۔

"شال اور اسر کہ مایۂ دانشمنداں ست بخدمت سلطان المشائخ آورد وپارہ کرد وثیقہ وظائف شاہی ۱۲"

وظائف شاہی کا وثیقہ سلطان المشائخ کی خدمت میں لائے اور اسے پھاڑ ڈالا

اسی چیز نے سلطان المشائخ کی نگاہ میں ان کی بڑی قدر پیدا کردی تھی لکھا ہے کہ سرِ دفتر ہو کر بجز قاضی کاشانی کے سلطان المشائخ اپنے مریدوں میں اور کسی کو تعظیم نہیں دیتے تھے،

ذراسی غلطی کی سزا

لیکن یہی رتبہ کی بلندی بچارے کے لیے ایک دفعہ مصیبت بن گئی، شاہی وظائف سے دست برداری کے بعد ظاہر ہے کہ امارت اور اس کا سارا ساز وسامان ٹھاٹھ باٹھ باقی نہیں رہا تھا، فقر وعسرت میں بسر ہوتی تھی، علاء الدین خلجی کو اس کی خبر ہوئی اُس نے فرمان صادر کیا کہ

"قضائے اودھ کہ موروث قاضی محی الدین ست با انعامات قریات بہ بہا بدو عوض دارند"

اودھ کی قضا جو قاضی محی الدین کی میراث تھی مزید دیہاتوں کے انعام کے ساتھ اُن کے سپرد کیے۔

شاہی فرمان قاضی صاحب کے پاس آیا، بس غلطی یہ ہوگئی کہ اُسی وقت واپس کردینے کی جگہ، وہ اس فرمان کو لے کر سلطان المشائخ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

حاشیہ صفحہ ۳۰۰

لہ مخدوم الملک شاہ شرف الدین منیری بہاری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات جس وقت ہورہی تھی، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ زبان مبارک پر اللھم اغفر امۃ محمد اللھم ارحم امۃ محمد (اے اللہ محمد کی امت کو بخشدے اے اللہ محمد کی اُمت پر رحم فرما) جاری تھا، ایک سو بیس سال کی عمر کس تڑپ اور درد وسوز میں اللہ کے اس فقیر کی گذری تھی اس کا اندازہ سکرات کے ان آخری الفاظ سے بھی ہوسکتا ہے ۱۲۔

"سلطان بغیر خواست من ایں خیلی فرمانے داده ست نافرمان مخدوم چه شود" | بادشاہ نے میری خواہش کے بغیر یہ اس طرح کا فرمان دیا ہے حضرت والا کیا فرماتے ہیں

جس کے سپرد "المسلمین" کی خدمت ہوئی تھی، اپنے اسی خا[illegible] زبان سے ان الفاظ کا سننا تھا کہ سلطان المشائخ کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ فرمو:

"البتہ شل ایں معنی در خاطر تو گذشتہ باشد آنگاہ ایں حق برائے تو پیش آورده اند" | یقیناً اس طرح کی چیز تیرے دل میں گذری ہوگی اس کے نتیجہ میں یہ تیرے سامنے لوگ لائے ہیں۔

اس فقرہ کا مطلب اس زمانہ میں لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے گا، لیکن کسی زمانہ میں قلوب کی صفائی اس درجہ کو پہنچ جاتی تھی کہ خیال ادھر دل میں آیا، اور دوسرے دل پر اس کا عکس پڑتا تھا، اسی مسئلہ کی طرف سلطان المشائخ نے اشارہ فرمایا، اتنے برہم ہوگئے کہ اسی وقت حکم دیا کہ "خلافت نامہ" واپس کر جاؤ، یعنی جب تم سے وہ کام سر انجام نہیں ہو سکتا، اور وہی شاہی ملازمت کے شغل میں اُلجھنا چاہتے ہو، تو پھر تم سے وہ کام نہیں ہو سکتا جس کے لیے المسلمین پر تمہیں نائب بنایا گیا ہے۔

سلطان المشائخ کی یہ خفگی کہتے ہیں کہ سال بھر تک قائم رہی، قاضی بیچارے حیران تھے کہ کیا کروں سال بھر کے بعد پھر ان کو جدید معاہدہ کا موقع دیا گیا۔ افسوس ہے کہ سلطان المشائخ کی زندگی ہی میں وفات پاگئے، ورنہ جو عہد کیا تھا شاید ان کے بعد وہ مسلمانوں کی خدمت کرتے۔

لیڈروں سے غلط توقعات

یہ تھا اس زمانہ میں ان لوگوں کی تربیت کا طریقہ جو اپنی زندگی قومی خدمات کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے، آج بھی لوگ "المسلمین" کا نام لے کر اُٹھتے ہیں، لیکن اس جلیل خدمت کے لیے دل سے کن کن چیزوں کے نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے، ان بیچاروں اس کا موقع نہیں ملتا، پھر

بجز چند اخباری بیانوں، مجلسی تجویزوں کے عام طور پر جو شکایت ہے کہ قومی لیڈروں سے اور کچھ بن نہیں آتا، تو آپ گولر کے درختوں سے انجیر توڑنے کا خیال کیوں پکاتے ہیں صورت اور نام کی شباہت سے حقیقت نہیں بدلتی، دماغی علم اتنے بڑے اہم کام کے لیے جو دراصل سچ پوچھیے تو پیغمبروں کی نیابت ہے، یقین کیجیے قطعاً کافی نہیں ہو سکتا اس راہ میں ذروں کو آفتاب سے اور رائی کو پربت سے کاہ کو کوہ سے ٹکرانا پڑتا ہے،

محمد تغلق کی اسکیم

مولانا فخر الدین زرادی اور اُن کے علم و فضل کا ذکر مختلف طریقے سے ہو چکا ہے، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ منجملہ اور مالیخولیاؤں کے محمد تغلق پر اس کا جنون سوار ہوا کہ ہندوستان سے باہر نکل کر براہ راست تاتاریوں کے ملک میں پہنچ کر ان کا قلع قمع کر دے، اس کے لیے اس نے "جہاد" کی مہم کا اعلان کیا، عظیم الشان بارگاہ نصب ہوئی، اس میں منبر رکھا گیا، مقصد یہ تھا کہ اسی منبر سے بادشاہ مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دے گا، لیکن دعوت سے پیشتر اس نے چند علماء سے مشورہ ضروری سمجھا، جن میں ایک مولانا فخر الدین زرادی بھی تھے۔

دبیر الملک ایک عالم دین کے سامنے

مولانا کی حاضری کا حکم ہوا، قطب الدین دبیر جو سلطان المشائخ کے مریدوں میں تھے اور محمد تغلق کے دبیر (سکریٹری) تھے، یہی مولانا فخر الدین کو لے کر دربار میں حاضر ہوئے، مولانا نے جوتے اُتار کر فرش پر جب قدم رکھا تو قطب الدین دبیر نے اُن کی جوتیاں اُٹھالیں اور بغل میں دبا کر پیچھے پیچھے چلے، تغلق قطب الدین کی ان تمام حرکتوں کو دیکھ رہا تھا بہرحال کہنا یہ ہے کہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوئے، کس بادشاہ کے سامنے؟ "محمد تغلق خونی" کے سامنے، بادشاہ مولانا سے خطاب کر کے پوچھتا ہے۔

"می خواہیم کہ آل چنگیز را بر اندازیم، ہم چاہتے ہیں کہ آل چنگیز کو اکھاڑ ڈالیں۔

شما در یں کار با ما موافقت خواہید کرد۔ آپ اس کام میں ہماری موافقت کروگے۔
مولانا نے جواب میں فرمایا "ان شاء اللہ تعالیٰ"
دیوانے تغلق کی اس سے کیا تشفی ہو سکتی تھی بولا کہ

"ایں کلمہ شک است" یہ شک کا کلمہ ہے،

سُننے کی بات ہے، سامنے تغلق ہے، تغلق کے جلاد ہیں، اس کی کھنچی ہوئی تلوار ہے، بغیر کسی جھجک کے جواب میں مولانا نے فرمایا۔

"در مستقبل ہمی آید" مستقبل میں یہی ہو کر رہے گا۔

مطلب یہ تھا کہ یہی ہو کر رہے گا، یعنی خود تمہارا عزم مشکوک اور مشتبہ ہو کر ختم ہو جائے گا۔ تغلق کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا خون کھولنے لگا، لیکن کسی معمولی کردار کا سامنا نہ تھا بات بدل دی اور بولا کہ

"شما مارا نصیحت کنید" آپ مجھے نصیحت فرمائیں۔

نصیحت کی درخواست تغلق کر رہا ہے، خدا جانے کتنے نصیحت کرنے والوں کو جو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے، کشتوں کے پشتوں سے بھرے ہوئے دربار کا نقشہ آپ کے سامنے گذر چکا، لیکن مولانا اسی سنجیدگی اور وقار سے تغلق کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

"غضب فرو خورید" غصہ پی جایا کریں۔

پوچھتا ہے، کدام غضب؟ مولانا فرماتے ہیں

"غضب سبعی" درندگی غصہ۔

یعنی درندوں جیسا غصہ تم نے اپنے اندر پیدا کر لیا ہے کہ کسی کی ادنیٰ مخالفت برداشت نہیں کر سکتے، اس غصہ کو پی جاؤ۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس جواب کے بعد مولانا کے سامنے اپنا جو انجام ہو سکتا تھا

وہ ظاہر ہے، شاہی دربار کی طرف جس وقت قطب الدین دبیران کو لے چلے تھے اسی وقت یہ کہتے ہوئے اٹھے تھے،

"من سرخویش بر در سرائے ایں مرد (تغلق) غلطیده می بینم باو ساخت نخواہم کرد، او زنده نخواہد گذاشت" — میں اس تغلق کے سامنے اپنا سر لڑھکا ہوا دیکھ رہا ہوں اس کے ساتھ درگذر نہیں کروں گا وہ زندہ نہیں چھوڑے گا۔

مولانا عماد غوری کے ذبح کا حکم — سیکڑوں کا انجام ان کے سامنے تھا، اسی پر قیاس کر رہے تھے، کچھ ہی دن پہلے اسی حق گوئی کے الزام میں مولانا عماد غوری کا سر اسی محمد تغلق کی تلوار سے اڑ چکا تھا، شیخ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں محمد تغلق پر جدید دین کی تجویز کا خبط سوار تھا مولانا عماد غوری کو بلا کر اس نے پوچھا

"فیض خدا منقطع نیست چرا بار کر فیض نبوت منقطع شود"[1] — اللہ تعالیٰ کا فیضان بند نہیں ہے کیوں ممکن ہے کہ نبوت کا فیض منقطع ہو جائے

شیخ محدث نے لکھا ہے کہ

"مولانا عماد برفور گفت که گہ مخورچہ می گوئی" — کھریات کہا تو کیا بک بک کر رہا ہے۔

آخر جہنم میں گہہ غوری کے لیے اس نے حکم دیا کہ

[1] یہی فقرہ ہے جو ہندوستان کی جدید نبوت اور جدید وحی کے مدعی قادیانی مزار کو ہانکا اسی تغلقی فقرہ پر ان کے متنبی کی دیوار قائم ہے، کا غذ اور سیاہی کی کمی قادیان ہمیں تو کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن تحلیل و تجزیہ کے بعد سارے هفوات کا خلاصہ اسی ایک فقرے میں مندرج ہے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے۔ صدیوں کے بعد پھر اسی تغلقی مالیخولیا نے قادیان میں جنم لیا ۱۲

" اور ذبح کنید وزبانش برآرند" ص ۲۰ اس کو ذبح کرو اور اس کی زبان کھینچو
اور ایسے واقعات تو ہر دن بلکہ دن کے اکثر گھنٹوں میں پیش آتے رہتے تھے، البتہ زیادہ
تر اس کے ستم کے تختہ مشق بیچارے وہی لوگ تھے جو اس کے دربار کے ملازم تھے اور
معمولی قصور پر قتل کی سزا پاتے تھے، مولانا عماد رحمۃ اللہ علیہ ان عاشقانِ پاک
طینت میں ہیں جنہوں نے اپنے وقت میں اللہ اور اس کے رسول کے عشق میں " بخاک
وخون غلطیدن"، کی رسم کو زندہ کیا تھا، رضی اللہ عنہ۔

مولانا زرادی کا سلوک

بہر حال مولانا زرادی بھی اسی رسم کی تازگی کے لیے چست کیے بیٹھے
تھے، لیکن خدا ہی جانتا ہے کیا صورت پیش آئی کہ تغلق
مولانا کی زبان سے ایسی سخت بات سننے کے بعد بھی خاموش ہی رہا، بلکہ بجائے اس کے
خاصہ طلب کیا۔ اور مولانا کو اپنے ساتھ بٹھا کر

" دریک صحنک بطعام خوردن مشغول شدند" ایک طشتری میں کھانا کھانا شروع کیا۔

مولانا کھانے میں شریک تو ہو گئے، لیکن چہرہ کی حالت بتا رہی تھی کہ ان پر سخت بار
ہے، تغلق کو بھی ان کے اس بار کا احساس ہو رہا تھا، لیکن خلاف معمول وہ
اور نرم پڑتا جا تا تھا، حتیٰ کہ مولانا کی دل جوئی کے لیے۔

" گوشت از استخواں جدا می کردہ پیش مولانا فخر الدین می نہاد" گوشت کو ہڈی سے جدا کر کے مولانا فخر الدین کے آگے رکھتا تھا۔

مگر مولانا پر وہی ناراضگی کی علامت برابر باقی تھی۔

" باکراہ تمام اندک اندک تناول می کرد" جبر کر کے تھوڑا تھوڑا کھا رہے تھے۔

خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا، اور مولانا کو رخصت کرتے ہوئے تغلق نے حکم دیا کہ

روپیہ کی ایک تھیلی اور اونی کپڑے کا ایک تھان ہدیہ میں پیش کیا جائے۔ اس کی نیت فاسد تھی، ارادہ کیے ہوئے تھا کہ اس ہدیہ کو اگر مولوی نے واپس کیا، بس ردِّ ہدیہ کو خلافِ سنت قرار دے کر گردن اُڑادوں گا، اس وقت سلطان المشائخ کے صحبت یافتہ قطب الدین دبیر جان پر کھیل گئے اور قبل اس کے کہ مولانا کی طرف ہدیہ بڑھایا جائے، دبیر نے اُن کی طرف سے خود لے لیا، دبیر کو یقین تھا کہ مولانا واپس کریں گے اور دلواد اسی کو کاربراری کا ذریعہ بنائے گا، خدا خدا کرکے مولانا کو تغلق کے دربار سے نجات ملی اور بخیر و خوبی گھر واپس ہوئے۔

استاد کی حمایت کا جذبہ میر خورد کا بیان ہے کہ مولانا کے چلے جانے کے بعد قطب الدین دبیر پر تغلق کا سارا نزلہ رجوع ہو گیا، چلا چلا کر ان کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

"اے مزوّر شکاں ایں چہ حرکتہا بود کہ کردی اول کفشہائے فخر الدین را در بغل گرفتی بعدہ جامہ دیم او خود پسندی و اورا از تیغ من خلاص دیا میدی و بلائے او برخود گرفتی۔"	اے حیلہ باز مکار یہ کیا حرکت تھی جو تو نے کی پہلے تو تو نے فخر الدین کی جوتیوں کو بغل میں دبایا اس کے بعد خوبصورت کپڑے کو خود لے لیا، اور اسے میری تلوار سے چھٹکارا دلایا اور اس کی مصیبت اپنے سر لی۔

لیکن دبیر نے جو کچھ کیا تھا طے کر کے کیا تھا، بادشاہ کے ان غضبناک بلکہ پیغام موت کے فقروں پر آزادی کے ساتھ اُنہوں نے بھی جواب دیا۔

"او استادِ من است و خلیفہ مخدوم من مرا شاید کہ کفشہائے او بتعظیم برسر گیرم کیت کہ زر بیلے و جامہ دیم را خود چہ اعتبار ست"	وہ مرے استاد ہیں، اور مرے مخدوم کے خلیفہ مرا فرض تھا کہ انکی جوتیاں تعظیم سے اپنے سر پر لیتا ہیلا بغل میں لینے اور خوبصورت کپڑے اور زر کا کیا اعتبار ہے

تغلق ان کی صاف گوئی سے متاثر ہوا، پہلے تو بولا۔

"ایں اعتقادہائے کفر آمیز را بگذار والا — ان کفر آمیز اعتقاد کو چھوڑ دے ورنہ
تراہم خواہم کشت" — تجھ کو بھی قتل کر ڈالوں گا۔

گویا اُستاد اور پیر کی عظمت اس کے نزدیک "اعتقادہائے کفر آمیز" تھی مگر "خواہم کشت" کی دھمکی دھمکی سے آگے نہ بڑھ سکی۔

شیخ قطب الدین منور کا واقعہ

اور یہ عجیب بات ہے کہ اسی قسم کا ایک واقعہ تغلق ہی کے ساتھ سلطان المشائخ کے ایک اور تربیت یافتہ بزرگ حضرت شیخ قطب الدین منور کا بھی ہے، یہ شیخ کبیر شکر گنج کے مشہور خلیفہ حضرت جمال الدین ہانسوی کے پوتے ہیں، ہانسی ہی میں ان کا قیام رہتا تھا، محمد تغلق بر سبیل دورہ ہانسی پہنچتا ہے، اطراف کے لوگ اس سے ملنے آتے ہیں، لیکن شیخ قطب الدین منور اپنی جگہ سے نہیں ہلتے ہیں[1] محمد تغلق کو اس کی خبر ملتی ہے، حاضری کا فرمان صادر کرتا ہے، اور حسن برہنہ نامی امیر کو حکم دیتا ہے کہ فوراً شیخ کو بارگاہ سلطانی میں حاضر کیا جائے۔ حسن برہنہ ہانسی پہنچتا ہے، شیخ کو بادشاہ کا حکم سناتا ہے، شیخ پوچھتے ہیں "جبراً" لانے کا حکم ہے یا میری مرضی کو بھی دخل ہے، اس نے کہا کہ جبراً جس طرح ممکن ہو لاؤ اس کا حکم ہے۔ شیخ بیوی کے پاس جاتے ہیں، خدا کے حوالہ ان کو اور بال بچوں کو کرتے ہیں۔

"مصلی برکتف، عصا در دست گرفتہ پیادہ روان شد" — جانماز کندھے پر اور لاٹھی ہاتھ میں پکڑی اور پیدل روانہ ہو گئے۔

[1] کاش! اس زمانہ میں تغلق رہا بہت پہلے پیدا ہو گیا، ورنہ قادیان کے "وا ہندوستان کے اور بہت سے دائروں میں اس کی پوجا ہوتی، گویا جن باتوں کو آج ہم سن رہے ہیں، ان سب کا بانی اوّل وہی تھا

حسن گھوڑا پیش کرتا ہے، انکار کیا گیا، ہانسی سے باہر نکلتے ہوئے اپنے آبا و اجداد کے مقبرے کے سامنے سے گذرتے ہیں، فرماتے ہیں:

"من از کنج شما باختیار خود بیروں نہ آمدہ — میں آپ کے گوشے سے اپنے اختیار سے باہر
ام ماراہی بربندد" — نہیں نکلا ہوں مجھے لوگ لیجا رہے ہیں

شاہی بارگاہ بانسی نامی قریے میں تھی، جو ہانسی کے قریب ہے، لیکن بادشاہ بجائے ملاقات کرنے کے حکم دیتا ہے کہ شاہی کیمپ کے ساتھ ان کو دلی لے چلو، اب ساتھ ساتھ منزل بمنزل دلی پہنچتے ہیں، دلی میں ان کے صاحبزادے میاں نورالدین بھی آجاتے ہیں، تغلق شیخ کی حاضری کا حکم دیتا ہے، شیخ نورالدین صاحبزادے بھی ساتھ ساتھ جاتے ہیں، شاہی محل سرا میں دونوں باپ بیٹے داخل ہوتے ہیں، ہر طرف ننگی تلواریں لیے سنتری ٹہل رہے ہیں، در و دیوار سے دہشت و خوف کی بارش ہو رہی ہے، شیخ قطب الدین سلطان آگے بڑھے چلے جاتے ہیں، لیکن کمسن نوجوان شیخ نورالدین کی ٹانگوں میں لرزش پیدا ہوتی ہے، بیٹے کو پلٹ کر شیخ اس حال میں پلٹے ہیں: فرماتے ہیں:

بابا نورالدین العظمۃ والکبریاء للّٰہ، یعنی بابا نورالدین بڑائی اور عظمت صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔"

یہ وہ نشہ تھا توحید کا جو سلطان المشائخ کی مجلس میں پلایا جاتا تھا، نورالدین سنبھل جاتے ہیں، تخت سامنے نظر آتا ہے۔

ہاتھ میں تیر و کمان ہے، بادشاہ کا غصہ سے چہرہ بگڑا ہوا ہے، آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں، شیخ السلام علیکم کہتے ہیں، مصافحہ کے لیے بادشاہ ہاتھ بڑھاتا ہے، شیخ ہاتھ ملاتے ہیں، ہاتھ کا ملانا تھا کہ تغلق کا رنگ فق پڑ جاتا ہے، خدا جانے کیا کچھ کہنے کے لیے تیار بیٹھا تھا، لیکن اب زبان سے جو الفاظ اس کے نکلتے ہیں وہ یہ ہیں۔

"من در دیار شما رسیدم تربیت نہ فرمودید — میں آپ کے دیار میں پہونچا ہوں آپ نے

بملاقات خویش مشرف نگرداند۔" تربیت نہیں فرمائی اور اپنی ملاقات سے مشرف نہیں فرمایا۔

شیخ اسی توحیدی سکینت و وقار کے ساتھ جواب دیتے ہیں

"ایں نمدپوش خود را دریں محل نمی داند کہ ملاقات بادشاہاں کند، در گوشہ بدعا گوئی بادشاہ و کافہ اہل اسلام مشغول می باشد معذوری باید داشت" یہ فقیر اپنے کو اس جگہ نہیں پاتا کہ وہ بادشاہوں سے ملاقات کیا کرے، کونے میں بیٹھ کر بادشاہ اور تمام مسلمانوں کے لیے دعا میں مشغول رہتا ہے آپ کو اسے معذور رکھنا چاہیے۔

تغلق چپ ہو جاتا ہے، اور فیروز باربک جو بعد کو فیروز شاہ کے نام سے مشہور ہوئے ان کو حکم دیتا ہے:

"آنچہ مطلوب شیخ ست ہمچناں کنید" شیخ کا جیسا منشا ہو وہی کرو۔

شیخ ہمیر فرماتے ہیں،

"مقصود من فقر و مطلوب من کنج جد و پدر ست" مقصد فقیری اور مرا مطلوب باپ دادا کا گوشہ ہے اور بس۔

بادشاہ کا اعتراف

محمد تغلق یہ سن کر اُن کو رخصت کر دیتا ہے، میر خورد نے تغلق کے ایک نامی امیر اعظم ملک کبیر معظم کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ شیخ کی روانگی کے بعد محمد تغلق نے اہلِ دربار کو مخاطب کر کے کہا کہ جس کسی نے مجھ سے آج تک مصافحہ کیا،

"البتہ دست او لرزید گر ایں بزرگ کہ بقوت دین دست ما محکم گرفتہ بود... ... از ہیبت او رہابت دین احساس کردم" یقیناً اُس کا ہاتھ کپکپایا لیکن یہ بزرگ جن کو دین کی قوت حاصل ہے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوا تھا اس پر دین کا جلال میں نے خصوصیت سے محسوس کیا۔

لیکن دین کی یہ مہابت اور ہاتھ میں یہ قوت کہ محمد تغلق جیسا جبار بھی، ان کی نگاہوں میں پر پشتہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا، یہ کہاں سے پیدا ہوا تھا؟ آگے قصہ سنئے کہ تغلق نے فیروز شاہ، اور مولانا ضیاء الدین برنی کو شیخ کے پاس بھیجا کہ ان کو مطلع کرو۔

"بادشاہ یک لک تنکہ انعام فرمود" — بادشاہ نے ایک لاکھ تنکہ انعام بھیجا ہے۔

خبر شیخ کو پہنچی ہے، بے ساختہ زبانِ مبارک سے

"نعوذ باللہ این درویش یک لک تنکہ قبول کند۔" — خدا کی پناہ، یہ فقیر ایک لاکھ تنکہ قبول کرے گا یعنی نہیں

ٹکا سا جواب دے دیا جاتا ہے، دونوں بادشاہ کی خدمت میں شیخ کے انکار کی خبر پہنچاتے ہیں،

"فرمان شد کہ پنجاہ ہزار بدہید۔" — فرمان ہوا کہ پچاس ہزار دے دو۔

مگر شیخ کو انکار ہی پر اصرار رہا، آخر میں تغلق عاجزی کے ساتھ کہلا بھیجتا ہے

"اگر شیخ این مقدار قبول نہ کند خلق مرا چہ گوید" — اگر شیخ یہ مقدار قبول نہیں فرمائیں گے تو مخلوق مجھے کیا کہے گی۔

بالآخر بڑے رد و کد کے بعد دو ہزار پر بات طے ہوئی، شیخ اس رقم کے لینے پر راضی ہو گئے اور اس لیے راضی ہو گئے .... کہ فیروز شاہ اور برنی دونوں نے عرض کیا کہ

"ما کہ ازیں تمام پیش تخت عذر کردن — میں اس سے کم تخت کے سامنے نہیں ذکر کر سکتا کہ شیخ اتنا بھی قبول نہیں فرماتے
کہ شیخ این ہم قبول نمی کند"

شیخ قطب الدین نے دونوں کو جواب دیا:

"سبحان اللہ درویش را دو سیر کھچڑی باید — سبحان اللہ فقیر کو دو سیر کھچڑی اور کچھ

سیر روغن کفاف باشد از ہزار ہا چہ کند" سیر گھی کافی ہو گا وہ ہزاروں کی رقم لیکر کیا کریگا۔

اللہ والوں کا حال

یہی چیز تھی جو سلطان المشائخ دین کے خادموں کے قلوب میں پیدا کرتے تھے جس دل سے ہزار ہا کا وزن نکل گیا۔ اگر "تغلق" کا وزن پشگ پشتہ سے بھی کم اسے محسوس ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ روپے والوں کا بوجھ تو وہی اپنے اندر پاتے ہیں جن کے دل پر روپیہ کا وزن ہو، جب روپیہ ہی کا وزن نہ رہا صرف دو سیر کھچڑی اور دانگے سیر روغن زرد زندگی گذارنے کے لیے جنہیں بس کرتا ہو وہ بھلا کسی کے بس میں آ سکتے ہیں؛

سبک روح تجرد بھی کہیں پابند ہوتی ہیں شمیم گل کے نقاشو! ذرا تصویر تو کھینچو

انما ذلکم الشیطن یخوف اولیاءہ یہ شیطان ہے جو اپنے دوستوں کو دہلاتا

فلا تخافوھم وخافون رہتا ہے پس نہ ڈرو ان سے اور مجھ ہی سے

ان کنتم مومنین ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔

کے قرآنی حکم کی تعمیل کی یہ شکل ہے، بلکہ اس کا زندہ اور کھلا ہوا تجربہ ہے کہ "الشیطان" کی ولایت سے ٹوٹ کر حق تعالیٰ کی ولایت ہی کو جو اپنی پناہ گاہ بنا لیتے ہیں، ان کو دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی دھمکی نہیں دے سکتی "محمد تغلق" کی عنان گسیختہ طغیانیاں بھی جس دل کو ہلا نہیں سکیں، خود اندازہ کرنا چاہیے کہ ایمان قوت کے جن لامحدود خزانوں سے قلوب کو بھر دیتا ہے: اس قوت کو جانچنے کے لیے اس سے بھی بہتر کسوٹی کیا اور مل سکتی ہے جس کے کام ہی سے نہیں صرف نام کے سننے سے بھی ارمے لرز جاتی ہے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ولایت الٰہیہ کے وارثوں کا صرف معائنہ بلکہ صرف "سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود" کی ایک جھلک اس کو کپکپا دیتی ہے۔ شیخ قطب الدین منور کے صاحبزادے شیخ نور الدین کا بیان ہے، میر خورد نے غالباً براہ راست ان کی زبان سے سنا ہے کہ بارگاہ شاہی کے سرادق جلال سے مرعوب ہو کر جب ان

پاؤں میں لغزش پیدا ہوئی، اور شیخ منور نے ان کو "الکبریاء للہ" ڈانٹ سے چونکایا تو فرماتے ہیں،

"بمجرد آں کہ این سخن العظمۃ والکبریا و العظمۃ والکبریاء اللہ کے سنتے ہی میرے
للہ) بسمع من رسید تقویتے در باطن باطن کو تقویت اور اطمینان اور
من ظاہر گشت واطمینانے واستظہارے مضبوطی حاصل ہوئی۔
حاصل شد"

کیسا اطمینان، کیسی پشت پناہی، جس کا احساس ان کے نوجوان قلب نے محسوس کیا؟ خود کہتے ہیں:

چنانکہ آں ہیبت ورعب از دل من اس طرح کہ میرے دل سے وہ خوف اور
بالکلی زائل شد دبدبہ قطعاً زائل ہوگیا۔

تغلق کے دربار میں ڈورہ یہ آہن پوش تیغ بکمر وگرز بدوش امراء وملوک پرا باندھے جو لوگ کھڑے تھے، غالباً شیخ نورالدین اسی نظارۂ ہوش ربا سے متاثر تھے، لیکن فرماتے ہیں کہ احساس کی تبدیلی کے ساتھ ہی "آن امراء وملوک درنظر من مجوگو سپنداں نمودند (وہ تمام امراء وبادشاہ میری نظر میں بکری جیسے دکھائی دیتے ہیں)

ایک کا خوف سارے خوف سے بے نیاز کر ڈالتا ہے یہ کوئی قصہ اور کہانی نہیں ہے ذاتی تجربہ ہے اپنا دیکھا ہوا مشاہدہ ہے، پہلی دفعہ نہیں بلکہ جب کبھی "ایک ہی کا خوف دل میں قائم ہوا ہے تو ہر ایک ڈر دلوں سے نکل بھاگا ہے" آدم اور آدم کی اولاد ڈرنے ہی کے لیے پیدا ہوئی ہے، اس کی سرشت کی افتاد اور فطرت کی ساخت یہی ہے مجانین یا پاگلوں کے سوا، آدمی کی عقل جب تک سلامتی اور صحت کی حالت میں رہتی ہے ڈرنے کا مشورہ دیتی رہے گی لیکن فرق صرف اسی قدر ہے کہ "ایک" سے اگر آپ نہیں ڈریں گے، جس سے ڈرنے کے لیے آپ کو پیدا کیا گیا ہے

تو عقل مجبور ہے کہ "ہر ایک" سے ڈرنے کا آپ کو مشورہ دے لیکن بجائے "ہر ایک" کے "ایک" ایک ہی کی خشیت اور ڈر میں آپ کا دل ڈوب گیا، اسی کی عظمت اور کبریائی کے استحضار و شعور میں غرق ہو گیا، تو اس وقت وہی عقل ایمان کی روشنی میں "ہر ایک" سے بے پروا ہونے پر اصرار کرتی ہے۔

میرے نزدیک صحیح حریت اور آزادی یہی ہے، باقی جو لوگ نہ ایک سے ڈرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ہر ایک سے کبھی نہیں ڈرتے، کم از کم میری سمجھ سے یہ باہر ہے کہ اپنے عقلی احساسات کے کچلے بغیر اس دعویٰ کی ہمت ان میں کیسے پیدا ہوتی ہے، جو بے زور ہے، اس کو زوروالوں سے قطعاً ڈرنا چاہیے جو نہتا ہے، اس کو ان لوگوں سے دبنا چاہیے جن کے ہاتھوں میں تلواریں ہیں، بندوقیں ہیں، اس وقت تک ڈرنا چاہیے، دبنا چاہیے، جب تک کہ کسی زیادہ زور آور کی ولایت و حمایت کا اسے یقین نہ حاصل ہو جائے۔ زندگی میں کبھی۔

حسبنا اللہ و نعم الوکیل — اللہ ہمیں بس ہے بڑا اچھا وکیل

کی نہ ہلنے والی چٹان پر اپنے آپ کو جو کھڑا پاتا ہو، اور موت یا قتل کے متعلق بھی

ولئن متم او قتلتم لا الی اللہ تحشرون۔ — اور اگر تم مرے بھی یا قتل ہوئے تو اللہ ہی کی طرف اٹھائے جاؤ گے۔

کی نہ بجھنے والی روشنی اس کے سامنے جگمگا رہی ہو، لیکن اس کے بغیر جن کمزوروں کی زبان سے "ہم کسی سے نہیں ڈرتے" "دنیا کی کوئی طاقت ہمیں کچھ کا نہیں سکتی" کے الفاظ نکلتے رہتے ہیں، یقین کیجیے کہ یا ان کی عقل جنون کی آفت سے ماؤف ہے، یا جو کچھ وہ بولتے ہیں، صرف بولنے کے لیے بولتے ہیں، وہ کچھ کرنا نہیں چاہتے صرف کہنا چاہتے ہیں، یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ ہمارے بزرگوں نے دماغی تصحیح کے ساتھ قلبی اصلاح کا جو ایک مرکب نظام اس ملک میں قائم کیا تھا، اس کے

یرت انگیز نتائج و آثار ہندی اسلام کی پہلی صدیوں ہی تک محدود رہے اس
ں شک نہیں کہ نتائج کی آب و تاب، ان کی تازگی اور رونق میں دن بدن انحطاط
پیدا ہوتا رہا ان چھ صدیوں میں اُتار چڑھاؤ کے بیسیوں حوادث سے اسے گذرنا
را لیکن یقین کیجئے کہ اس وقت تک جب تک کہ ہماری زندگی کی واپسیں سانس
س ملک میں پوری ہوئی ، حکومت کے چراغ کی آخری ٹمٹمانے والی لَو جب تک نہ
بجھی تھی، اور بزرگوں سے تعلیم و تربیت کا جو نظام وراثت میں ایک نسل تک پہنچا
تھا، جب تک کہ آخری برہمی کا وہ شکار نہ ہوا تھا اس وقت تک ان انقلابی
ہستیوں کے سوا جو اس ملک کی دینی و علمی "تاریخ میں" مقام خاص" کے مالک ہیں
وں بھی ملک کا کوئی گوشہ ان رسیدہ پھلوں سے خالی نہ تھا، جس کا پھلنا تعلیم
تربیت کے اس "شجرہ طیبہ" میں تقریباً لازمی تھا، جسے صدیوں کے مسلسل تجربات
کے بعد ہمارے بزرگوں نے یہاں نصب فرمایا تھا، ضخیم تاریخ مرتب ہو سکتی ہے،
گر کتابوں سے ان کے بکھرے ہوئے حالات ایک جگہ جمع کیے جائیں۔

بارھویں صدی کے علماء و صوفیاء؟

سمجھانے کے لیے میں نے آپ کے سامنے تقریباً ہندی اسلام کی پہلی صدیوں کے چند نمونے اب تک پیش
کیے ہیں، اب تک میری گفتگو کا دائرہ زیادہ تر ان ہی بزرگوں کی حد تک محدود
رہا ہے، جن کا تعلق ۔ ساتویں اور آٹھویں صدی کے آغاز سے ہے، اب میں آپ
کے سامنے چند مثالیں گیارہویں بلکہ بارھویں صدی ہجری کی مولانا غلام علی
آزاد بلگرامی کی مختصر کتاب "مآثر الکرام" سے اخذ کرکے پیش کرتا ہوں جس کا
کسی صوبہ، یا ضلع، یا تعلقہ کے باشندوں سے نہیں بلکہ زیادہ تر اودھ کے قصبہ
بلگرام ہی کے لوگوں سے تعلق ہے، ایک قصبہ کی پیداوار کا جب یہ حال تھا
تو اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ سارا ملک کس رنگ میں رنگین ہوگا، اس میں

شک نہیں کہ بلگرام کا شمار ہمیشہ سے ہندوستان کے ایک مردم خیز قصبوں میں ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس کو علم یا دین کی کوئی خاص مرکزیت حاصل تھی خود مولانا آزاد بھی باوجود وطن دوست ہونے کے یہ مانتے ہیں کہ خود اودھ ہی میں بلگرام جیسے بیسیوں قصبات تھے، ابوالفضل نے تو بلگرام کے ذکر میں لکھا ہے

"قصبہ ایست خوش ہوا، بیشتر مردم آں خوش فہم و سرود سرا" — قصبہ خوش فضا ہے اور اس کے اکثر باشندے اچھی سمجھ کے اور خوش آواز ہیں

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خوش فہمی کے ساتھ جہاں سرودسرائی کا بھی لوگوں کو عارضہ ہو، وہاں خوش فہمی سے صحیح استعمال کہاں تک لیا جا سکتا ہے، اگو اسی کے ساتھ ابوالفضل نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"در آنجا چاہے ست کہ ہر کہ چہل روز آب ازو آشامد شناسائی و حسن منظر افزاید" — وہاں ایک کنواں ہے جو شخص بھی کنویں کا چالیس دن پانی پیے گا اس کی شناسائی اور خوش منظری بڑھ جائیگی۔

شناسائی کا واللہ اعلم کیا مطلب ہے، دقت نظری یا معرفت کچھ بھی ہو، لیکن ظاہر ہے کہ یہ توخوش اعتقادی کے زمانہ کی باتیں ہیں، خوش اعتقادی کا ایک زمانہ کہ ابوالفضل جیسے بد اعتقاد آدمی کو بھی اس کے "تذکرہ میں" ندامت محسوس نہیں ہوئی، لیکن بداعتقادی کے اس عام دور میں اب کنوؤں کے پانی سے حصول شناسائی کی کون توقع کر سکتا ہے۔

بہرحال میری غرض یہ ہے کہ ان مثالوں کو مثالوں ہی کی حیثیت سے پڑھنا چاہیے، یہ خیال غلط ہوگا کہ یہ بلگرام کی خاص خصوصیت تھی، بلکہ اس زمانہ کے ماحول کی یہ عام پیداواریں تھیں، جن میں بلگرام نے بھی اپنا حصہ پایا تھا۔

میں نے دعویٰ کیا تھا کہ ہندوستانی تصوف خصوصاً طریقۂ چشتیہ کی خاص خصوصیت "سلوک بالقرآن" تھی، گو میرا یہ دعویٰ عجیب تھا لیکن بحمد اللہ جو شواہد اور وثائق آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، اُن کے دیکھنے کے بعد بھی کیا لوگوں کا تعجب باقی رہا ہوگا؟ لیکن وہ مثالیں تو ساتویں اور آٹھویں صدی کی تھیں، اب آئیے گیارہویں یا بارہویں صدی میں آئیے، دیکھئے کہ ہندوستانی مسلمان اس وقت تک بھی قرآن کو کس طریقہ سے استعمال کر رہے تھے۔

سید نور اللہ

مولانا آزاد نے سید نور اللہ نامی ایک صاحب کا ذکر کیا ہے، مولانا ان کے دیکھنے والوں میں ہیں اس لئے جو کچھ سنایا جائے گا، شنیدہ نہیں بلکہ زیادہ تر وہ دیدہ ہی ہوگا،

ان ہی سید نور اللہ صاحب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ دماغی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد قلبی تصحیح کی فکر میں گھر سے باہر نکلے، دلی پہنچے کسی پر نظر جمی نہیں، سیدھے سلطان المشائخ کے جوار میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے، کچھ دن کے بعد یہاں سے پھر بلگرام ہی واپس گئے بلگرام میں اس وقت دوائے دل کا کام سید لطف اللہ بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد تھا، مولانا آزاد بھی خود ان ہی کے دست گرفتہ ہیں، عوام سید صاحب کو میر لدھا یا پیر لدھا کے نام سے پکارتے تھے، اور مولانا اپنی کتاب میں ہر جگہ ان کو سید العارفین کے لقب سے ملقب فرماتے ہیں، سید نور اللہ سید العارفین میر لدھا صاحب کے برادر صغیر تھے، ان ہی سے آکر بیعت حاصل کی اور ان ہی کی صحبت میں اپنے علم میں عمل کے رنگ بھرنے کی مشق بہم پہنچانے میں مشغول ہوئے، استعداد بالغ تھی، رنگ بہت جلد نکھرنے لگا، مولانا ہی فرماتے ہیں "حالتے عجب بہم رسانید" یہ حالت عجیب کیا تھی؟ شبہا چشم کم بر ہم می زد

لیکن رات کی ان تاریکیوں میں کیا ستارے گنتے تھے، دور بین لگا لگا کر آسمانی فضاؤں میں دُبِّ اصغر اور دب اکبر کی جستجو کرتے تھے، مولانا فرماتے ہیں:

"اکثر اوقات می گریست در رکوع — اکثر اوقات رویا کرتے تھے کبھی رکوع

گاہے وگاہے در سجود شب را صبح کردے — میں اور کبھی سجدہ میں اس طرح رات گذار کر صبح کرتے

استغراق کا یہ عالم تھا کہ

"احیاناً (بعض اوقات) حالت رود او کہ تا یازدہ روز بیشتر اکل وشرب نمی پرداخت"

(کبھی کبھی یہ حالت ہوجاتی تھی کہ گیارہ روز یا اس سے زیادہ تک کھاتے پیتے نہ تھے) مگر باوجود اس استغراق کے جو ان کا ایک خاص حال تھا، بیداری کی یہ کیفیت تھی کہ سید العارفین کی مجلس میں ایک رند قلندر بیٹھا تھا کہیں سے مزامیر (باجوں) کی آواز آئی، قلندر نے میر صاحب کو چھیڑنے کے لیے کہا:

"جائے کہ مزامیر ست رواں باید شد" — جہاں باجے ہیں وہاں جانا چاہیے۔

سید نور اللہ جو عموماً خاموش رہتے تھے وہ بھی سامنے بیٹھے تھے، مہر سکوت ان کی ٹوٹتی ہے، قلندر سے پوچھتے ہیں:

"دراں جا چیست؟" — وہاں کیا ہے؟

قلندر نے قلندرانہ جواب یہ دیا۔

گفت "اللہ ست" — اس نے کہا اللہ ہے۔

یعنی "جہاں باجا ہے وہاں خدا ہے" اس فقرہ کا سننا تھا کہ سید نور اللہ میں حمایت شریعت کی رگ پھڑک اٹھتی ہے، کھڑے ہو جاتے ہیں، قلندر کا ہاتھ پکڑتے ہیں، اور گرجتی ہوئی آواز میں

"برخیز اللہ را بنما" — اٹھ! اللہ کو دکھا۔

صرف دعویٰ نہیں دلیل کا سوال تھا، قلندر کی ساری قلندریت غائب ہو گئی، حیرانی صورت بنا کر ان کا منہ دیکھنے لگا، سید صاحب پر جلال طاری تھا ہاتھ

سیدالعارفین نے آکر قلندر کو ان کے ہاتھ سے نجات دی۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی توہین ہو رہی تھی، سید صاحب کو ہوش آ گیا، مگر جانتے ہو، یہی ہوش بے ہوشی سے کب بدلتا تھا؟ کیا طبلہ کی کسی تھاپ، یا کسی راگ کے الاپ پر، مولانا آزاد راوی ہیں،

"شبے نماز تراویح بجماعت می خواند" ایک رات جماعت کے ساتھ تراویح پڑھ رہے تھے۔

قرآن سن رہے تھے، براہ راست خالق کائنات کے مخاطب تھے۔

اما بریں آیت رسید فلیضحکوا قلیلاً و لیبکوا کثیراً (تم کم ہنسا کرو اور چاہیئے کہ زیادہ رویا کرو، در عین نماز بے ہوش افتاد) عین حالت نماز میں بے ہوش ہو گئے خدا جانے کب ہوش آیا، مگر آیا تو کس حال میں آیا،

"تا چند روز از گریہ نیا سود" کتنے دنوں رونے کے باوجود سکون نہیں آیا۔

جس "اللہ کو الٰہ بنا کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے سپرد کیا تھا، اسی الٰہ کی تلاش میں سید صاحب کو کہیں رکاوٹ پیدا ہوئی، پیر سے عرض رسا ہوئے، بعض اشغال اور تدبیریں بتائی گئیں، مشکل حل نہ ہوئی۔

ہندوستان کا تصوف بارہویں صدی ہجری میں

میں جب کہتا ہوں کہ ہندوستان کا تصوف قرآنی تصوف تھا تو لوگ حیران ہوتے ہیں، آپ اس سلسلہ میں جو کچھ سن چکے وہ تو سن ہی چکے لیکن وہ تو ہندی اسلام کی ابتدائی قرون کی باتیں تھیں، سنیئے بارھویں صدی میں بھی سلوک کی راہ میں مرید رکاوٹ محسوس کرتا ہے، پیر علاج تجویز کرتا ہے

"برو قرآن مجید حفظ کن" تا ثر الکلام جاؤ اور قرآن پاک یاد کرو

ص ۱۲۰

جس کی تلاش تھی، اس کے پانے کی قریب ترین راہ یہی ہو سکتی تھی، محبوب بن بھی جائے۔ ع "تم ہمارے سامنے ہو ہم تمہارے سامنے" کا نظارہ بھی پیش آ جائے لیکن دل کی بے کلی کچھ اپنی ہم سنائیں کچھ وہ سنائیں اپنی" کے بغیر کیا مٹ سکتی ہے؟" قرآن حفظ کرنا اسی کی تدبیر تھی، مولانا آزاد فرماتے ہیں:

"چند جزاز قرآن حفظ کردہ بود کہ عقدہ	قرآن کے چند پارے حفظ کئے تھے کہ
انحلال پذیرفت"	عقدہ کھل گیا،

اب بات ہی کیا باقی رہتی ہے، عمر زیادہ گزر چکی تھی، لیکن چند جزء کے بعد کل اجزائے قرآنی کے حفظ کی دھن سوار ہوئی، جب تک جیتے رہے، اسی شغل میں جیتے رہے،

"بست و پنج جزیاد کردہ بود"	پچیس پارے یاد کر چکے تھے،

کہ جس وقت کے لیے جی رہے تھے، وہ وقت آ گیا، مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ جب "وقتِ احتضار رسید" پوچھا گیا

"تمنائے بہ خاطر دارید"	کوئی تمنا دل میں رکھتے ہیں

ساری آرزوؤں کو سینے سے نکال کر ایک ہی آرزو کی لذتوں میں جو ڈوب گیا تھا، سنتے ہو، بارہویں صدی کا ہندی مسلمان بھی یہی جواب دیتا تھا۔

"ہمیں تمنا باخود دارم کہ پنج جزء از قرآن	بس یہی تمنا رکھتا ہوں کہ پانچ پارہ
باقی ماند فرصت حفظ نہ یافتم"	حفظ کرنے سے رہ گیا کہ وقت نہ رہا

پانچ پاروں کے حفظ کی تمنا گور تک لیجانے والے کی وفات کی تاریخ مولانا آزاد کو "بشریٰ لکم الیوم جنات" ملی۔

جس قرآن میں حفظ کرتے تھے وہ گم ہو گیا، گھر کے لوگوں کو تلاش تھی خواب میں آئے اور اطلاع دی کہ "قرآن درخانۂ فلاں درفلاں محل ست" اور بیداری میں لوگوں نے

"چوں خبر گرفتند ہماں جا یافتند" جب خبر لی وہیں اسے پایا۔

اللہ کی راہ میں مرنے والوں کے متعلق قرآن میں "بل احیاء" یعنی وہ مرتے نہیں زندہ رہتے ہیں، کی خبر دی گئی تھی، خواب میں جس خبر دینے والے کی بات بیداری میں دیکھی گئی کیا خواب کی اس تجربی تفسیر کے بعد بھی یہی سمجھا جائے گا کہ ایسے لوگوں کا صرف نام زندہ رہتا ہے، ورنہ واقع میں وہ معدوم ہو جاتے ہیں۔

شیخ عبدالعزیز شکر بار

مولانا آزاد نے بارہویں صدی کے اس واقعہ کے ساتھ دسویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار جو حضرت شاہ ولی اللہ کے اجداد میں ہیں، یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ایک قاری حضرت کے

۱؎ فقیر سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی سابق صدر الصدور سرکار آصفیہ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ ان کے چچا نواب عبدالشکور خاں مرحوم کے پاس حضرت مولانا عالم علی صاحب نگینوی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لایا کرتے تھے، مولانا کو کشف قبور میں خاص ملکہ تھا، ایک دن قبرستان تشریف لے گئے، ایک بی بی صاحبہ جن کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا ان کی قبر پر مراقب ہو گئے اور فرمایا کہ ان بی بی صاحبہ کے پاس کسی نے اپنی جوتیاں امانتہً رکھنے کو دی تھیں اس عرصہ میں ان کا انتقال ہو گیا، کہتی ہیں کہ ان جوتیوں کی وجہ سے ان کو تکلیف ہے، پتہ یہ بتاتی ہیں کہ فلاں کمرے کے فلاں مقام پر جو صندوق رکھا ہوا ہے، اس کے کپڑوں کے نیچے جوتیاں ہیں جس کی امانت ہے پہنچادی جائے، لوگوں نے تلاش کیا، ٹھیک جوتیوں کا جو پتہ انہوں نے دیا تھا وہیں نکلیں، حافظ ابن قیم نے کتاب الروح میں عہد صحابہ کا بھی واقعہ کچھ اسی نوعیت کا درج کیا ہے کہ خواب میں اپنے دوست صحابی کو مرنے کے بعد انہوں نے اطلاع دی کہ میرے مکان کے چھپر میں سینگ کے اندر اشرفیاں رکھی ہوئی ہیں، جو ایک یہودی سے میں نے لی تھیں تم یہودی تک ان کو پہنچا دو، صحابی جنہوں نے خواب دیکھا تھا، ان کے گھر آئے، پتہ دہ کیا، اور چھپر میں (باقی صفحہ ۳۲۲)

سامنے بیٹھا ہوا تھا، ارشاد ہوا کہ کچھ سناؤ، خوش الحانی کے ساتھ سورۂ ق کی تلاوت اُس نے شروع کی، جوں ہی کہ

آیہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (میں اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہوں) رسید حالت شوق غلبہ کرد، سہ مرتبہ کلاہ از سر مبارک برقص آورد"

قاری طبع عالی کا مذاق شناس تھا، اب تک جو قریب سے آگے بڑھ کر اقرب کی شکل میں محسوس ہو رہا تھا، قاری نے جیسا کہ مولانا آزاد لکھتے ہیں،

بارِ حافظ آیت هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (وہی اوّل بھی ہے، وہی آخر بھی ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے، وہی ہر شئے کا دانا و علیم ہے) پڑھنا شروع کیا، مولانا لکھتے ہیں کہ

"شیخ را طرفہ ذوقے دعالتے بہم رسانید چوں	شیخ کو عجیب ذوق اور عجیب حالت ہوئی
قرآن تمام کرد و آیت سُبْحَانَ رَبِّكَ	جب قرآن پورا کر لیا آیت سبحان ربک
رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى	رب العزۃ تک پوری پڑھی شیخ دونوں شکر
الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.	سے لبریز ہاتھوں کو نیچے لائے اور سینہ پر
خواند، حضرت شیخ ہر دو دست مبارک	لے گئے۔
بر روئے شکر بے فرود آورد و بر سینہ فیض	
گنجینہ برد"	

اہل مجلس کی نظر اسی پر تھی کہ اچانک انہیں محسوس ہوا، کہ شیخ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۱) تو ٹھیک جہاں پر اُنہوں نے اشرفیوں سے بھرے ہوئے دیگ کا پتہ دیا تھا ملا گھر والوں سے اُنہوں نے قصہ خواب کا بیان کیا، اور ان کی اجازت سے یہودی کو دے آئے یہودی اس قصہ کو سن کر مسلمان ہو گیا۔ اس قسم کے تجربات کا ایک ذخیرہ کتابوں میں ملتا ہے۔

"جان بجانان تسلیم نمود" مآثر الکرام ص؎۔ جان جاناں کو سپرد کر چکے ۔

میں صرف نمونہ دکھا رہا ہوں، ہندوستانی مسلمانوں کا جو تعلق قرآن سے تھا ہندی اسلام کی ابتدائی و وسطانی و آخری صدیوں سب ہی کے نمونے اور سب ہی کی شہادتیں آپ کے سامنے گذر رہی ہیں، استیعاب مقصود نہیں صرف ان جھوٹوں سے جو آج اپنے بڑوں سے اسی لیے روٹھے بیٹھے ہیں کہ ہندوستان میں پہنچ کر انہوں نے خدا کے کلام سے رشتہ توڑ لیا، رسول کی حدیثوں کو اس ملک میں آکر چھوڑ دیا، ان ناآگاہوں کی آگاہی کی ایک راہ کھولنی ہے، ورنہ ان واقعات کی اس ملک میں کب کمی رہی ہے، واقعہ یہ ہے کہ جن بزرگوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کی وفات ان کی قرآن پر نہیں بلکہ کسی شعر پر ہوئی ہے، کسی نے

کشتگان خنجر تسلیم را   ہر زماں از غیب جانے دیگر ست

شہادت کے کشتوں میں شریک ہو کر غیب کے رندوں میں اپنے آپ کو شریک کیا "سخن المؤمن" سے آزادی کسی کو "خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی" پر میسر آئی، تو کیا واقع میں یہ سب شعر تھا، لوگ غور نہیں کرتے ورنہ جسے وہ شعر سمجھ رہے ہیں، قرآن میں پا سکتے ہیں، ورنہ کیا یہ کوئی ایک دو قصے ہیں، تعلیم کا وہ نظام ہی اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ جینے والوں میں مرنے کا صحیح سلیقہ پیدا ہو جائے، ساری تربیت کا حاصل اسی دن سامنے آتا تھا جس دن اس دنیا سے وہ روپوش ہوتے تھے؎۔

؎ میری ایک کتاب "دم واپسیں" کا بکھرا ہوا مواد غیر مرتب حال میں پڑا ہوا ہے، چند اجزاء احتضاریات کے عنوان سے القاسم دیوبند میں شائع بھی ہوئے تھے پھر سمیٹنے کا موقع نہ ملا، خدا کرے کہ توفیق میسر ہو، عجب واقعات ہیں، ان کے بھی جو مرنے کے لیے جیتے تھے اور ان کے بھی جو جینے پر مصر تھے، لیکن بہر حال ان کو مرنا پڑا،

؎ میں نے مذکورہ بالا دو واقعات میں دراصل حضرت خواجہ بختیار کاکی اور حضرت حاجی امداد اللہ چشتی

(باقی اگلے صفحہ پر)

سید محب اللہ بلگرامی

میں نے کسی جگہ سید محب اللہ بلگرامی کا ذکر کیا ہے کہ عہدِ جوانی میں "در شش ماہ قرآن یاد کرد" مولانا آزاد نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "ستعال شعار خود ساخت" سپاہیوں کے لباس میں رہتے تھے، عالمگیر کے صاحبزادے محمد اعظم کی فوج میں بھرتی ہوگئے تھے، شاہزادہ کو اجین مالوہ کی صوبہ داری سپرد ہوئی فوج بھی ساتھ گئی، میر صاحب بھی اندر قرآن اور باہر میں ڈھال و تلوار لگائے شاہزادے کی فوج کے ساتھ اجین پہنچے۔

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ اجین کے قریب ایک مقام جس کا نام "سرائے سیسی" ہے گھوڑے پر سوار جا رہے تھے، وہیں "سرائے سیسی" کے کسی باغ میں گھوڑے سے اترے، زین پوش بچھائی، خدام جو ساتھ تھے اُن کو بھی روک لیا، گٹھری سے نیا سفید لباس نکالا، پہنا، شربت بنایا، پیا، اور "بہ تلاوت قرآن مشغول گشت" تلاوت ختم ہوئی، قرآن جزدان میں رکھا گیا، اور خود "چادر کشید" چادر تنی کی تنی رہ گئی لوگوں نے جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ

"جاں بحق سپردہ است" رحمۃ اللہ علیہ — جان نکل چکی ہے اللہ رحمت فرمائے۔

(ماثر ص ۱۱۳)

عالم نہیں، فاضل نہیں، پیر نہیں، فقیر نہیں، فوج کے ایک سپاہی کو دیکھ رہے ہو جو قرآن نے اپنا اثر اس پر قائم کیا تھا،

قرآن کے ساتھ جن کے اگلوں کا بھی یہی رشتہ تھا، پچھلوں کا بھی یہی تعلق تھا، جو درمیان میں تھے، ان پر بھی یہی کیفیت طاری تھی، خواص بھی اسی رنگ میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۳) مہاجر مکی کے خلیفہ مولانا محمد حسین الٰہ آبادی کی وفاتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جو عام طور پر مشہور ہیں غالب صاحب کا انتقال پہلے شعر پر اور مولانا الٰہ آبادی کا دوسرے شعر پر ہوا۔ ۱۲

عوام ۔۔۔ ی حال میں ڈوبے ہوئے تھے، اس کے بعد بھی کیا اپنے بزرگوں سے منہ پھلانا ان عزیزوں کا درست ہو سکتا ہے جن کے منہ خواہ غلنے بھی پھولے ہوئے ہوں، لیکن ان میں شاید کسی ایک کا دل بھی قرآن کے لیے اتنا پھیلا ہوا نہ ہو گا، جس انشراح اور دستوں کا نظارہ ہم ان بزرگوں کے قلوب میں کر رہے ہیں ۔

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ — جب صور میں پھونکا جائے گا۔

والی مشہور قرآنی آیت سے اثر پذیر ہو کر جامع ترمذی میں ہے کہ ایک تابعی خرّ مَغْشِیًّا علیہ (چکرا کر نماز میں گر پڑے) اور اسی بیہوشی میں وفات پا گئے، بلاشبہ یہ واقعہ بھی اہم تھا، اللہ ہے، اسی لیے ابو عیسیٰ ترمذی نے اپنی جامع میں اس کو جگہ دی، لیکن پوری کتاب میں ایک واقعہ ہے، لیکن قرآنی مخدرات کی دلبریوں، بلکہ جاں برآریوں کے کرشموں کو دیکھ رہے ہیں ہندوستان میں ان کی کمی کی ہے، یاران عزیز!

نام نیکو رفتگاں ضائع مکن

آخر حدیث میں بھی تو ہے۔

اُذْکُرُوْا مَوْتَاکُمْ بِالْخَیْرِ۔ — اپنے گذرے ہوؤں کا ذکر نیکی سے کیا کرو۔

ھٰذَا وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی

مولانا سید نور اللہ اور تلاوتِ قرآن

اس سلسلہ میں سردست جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ چکا، آخر میں ایک بات جس کا گذشتہ بالا واقعات میں مولانا آزاد نے تذکرہ کیا ہے، دل چاہتا ہے کہ تنبیہ کیے بغیر اسے نہ چھوڑا جائے، میرا اشارہ سید نور اللہ کے ترجمہ کے اس جزو کی طرف ہے یعنی مولانا آزاد نے جو یہ لکھا ہے۔

"وقتے اوراد بطے ایں راہ مشکلے پیش آمد — کسی وقت اس راستے کے طے کرنے میں انھیں
بخدمت سید العارفین اظہار کرد حضرت — ایک مشکل پیش آئی، سید العارفین کی خدمت

شغلہا فرمودند عقدہ وانہ شد آخر فرمودند
برو قرآن مجید حفظ کن، چند جزاز قرآن
حفظ کردہ بود کہ عقدہ انحلال پذیرفت،
آمدہ بہ پائے حضرت افتاد باقی قرآن
یاد کردن گرفت۔ (ص ۱۲۰)

میں اس کا اظہار کیا حضرت نے کچھ وظیفہ
بتا دیا۔ عقدہ پھر بھی حل نہ ہوا آخر میں حکم
فرمایا کہ قرآن پاک یاد کرو، ابھی چند ہی پارے
حفظ کئے تھے کہ عقدہ حل ہونے لگا۔ آکر حضرت
کے قدموں میں گر گئے اور جو باقی رہ گیا تھا اسے
کرنے میں مشغول رہے۔

اس واقعہ کا بہ تفصیل ذکر ہو چکا ہے، اس وقت اس کے نقل کرنے سے میری غرض پھر اسی مسئلہ کی طرف اشارہ کرنا ہے، جس کا ذکر مختلف طریقوں سے پہلے بھی ہو چکا ہے، پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ "حفظ قرآن" کو اس راہ کی مشکل کے حل کا ذریعہ کیا جوگیوں میں بتایا جاتا ہے، ہندوستان کا تصوف جوگیہ اور یوگیہ سے ماخوذ ہے، اس دعوے کے مدعیوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا اسی تصوف کا نام جوگیت اور براگیت ہے؟ پیر سید العارفین جنہوں نے اپنے مرید کو حفظ قرآن کا مشورہ دیا، ان کے طریقہ عمل کی خصوصیت مولانا آزاد نے یہ بیان کی ہے:

"ریاضات شاقہ کہ آدمی را فرسن سازد
نمی فرمودند و اگر مرید را بعین سن نشاندند
اغذیہ لطیف می دادند، می فرمودند
کہ قوام انسان غذا ہست اگر تندرست
است جہاد از و خوب می آید واگر ناتواں
قصور واقع شود"

ایسی سخت ریاضتیں کرنے کو نہ کہتے کہ آدمی
اپاہج اور شل ہو جائے، اور اگر چلے میں بٹھاتے تو
عمدہ غذا دیتے اور فرماتے کہ انسان کو تھامنے
والی چیز غذا ہے اگر وہ تندرست ہے تو
اس سے جدوجہد خوب ہو سکے گی اور
اگر کمزور ہو گا تو کوتاہی واقع ہو۔

اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مثلاً ان کے مرید سید نور اللہ کے متعلق جو یہ بات گذری کہ گیارہ گیارہ روز تک کچھ نہیں کھاتے تھے یہ ان کا خاص حال تھا، یہ

خیال کرنا کہ خود مرشدوں کی طرف سے اس کی تعلیم دی جاتی تھی، میرے نزدیک اکثر یہ صحیح نہیں ہے، اور کبھی کبھی اگر ایسا ہوا بھی ہے تو اس کی حیثیت کسی وقتی علاج کی تھی، اسی قسم کا وقتی علاج جیسے حضرت کعب بن مالک صحابی کا علاج بارگاہ نبوت سے وقتی طور پر یہ کیا گیا تھا کہ عموماً صحابہ کو ان سے ملنے جلنے بات چیت کی ممانعت کر دی گئی تھی، حتیٰ کے آخر میں ان کی اہلیہ کو بھی اسی کا حکم دیا گیا تھا، جس کی تفصیل بخاری میں موجود ہے، لیکن ظاہر ہے کہ چالیس پچاس دن کے لیے حضرت کعب کو یا ان کے ساتھ دو اور صحابیوں کو جو اس حال میں رکھا گیا تھا، اس کا تعلق ان کے خاص ذاتی خصوصیات سے تھا، اس کی حیثیت عام قانون کی نہ تھی،

اتباع کا لحاظ و پاس

مولانا آزاد نے یہ بھی ان ہی سید العارفین کے متعلق لکھا ہے کہ:

"از دلق پوشیدن، و مرقع دوختن، خود را در نظر خلق وا نمودن، منع می کردند و از تاہل و کسب معاش کہ سنت سنیۂ انبیاء است باز نمی داشتند"

گدڑی پہننے، پیوند لگانے اور مخلوق کی نظر میں ` کو نمایاں کرنے سے روکتے تھے۔ مگر شادی بیاہ، کسب معاش سے نہیں روکتے تھے کہ یہ سنت سنیہ انبیاء علیہم السلام کی ہے۔

لہ اور سید العارفین کے متعلق تو آپ یہ سن رہے ہیں کہ وہ کسب معیشت سے لوگوں کو صرف "باز نمی داشتند" یعنی منع نہیں کرتے تھے، مگر کسی مولوی یا کسی معاشی مسلمان نہیں بلکہ طبقۂ صوفیہ کے سرخیل، اس راہ میں ایک خاص مکتب خیال کے بانی حضرت علاء الدولہ ابو المکارم سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے مولانا جامی نے نفحات مشہد مطبوعہ کلکتہ میں ان ہی کا یہ قول نقل فرمایا ہے، یہ فرمانے کے بعد کہ حق تعالیٰ زمین و زراعت را بحکمت آفریدہ "یعنی زمین اور اس کی کھیتیوں کو خدا نے مصلحت اور حکمت سے (باقی اگلے صفحہ پر)

سیدالعارفین سے ان کے تصوف کا حاصل مولانا نے جو نقل کیا ہے وہ صرف یہ ہے

"مرد آن ست کہ ظاہرش با معاملہ خلق متعلق باشد، و باطنش در یاد مولیٰ مستغرق"

مرد وہ ہے جس کا ظاہر مخلوق کے معاملہ سے متعلق ہو اور باطن مولائے حقیقی کی یاد میں ڈوبا ہوا ہو۔

ص ۱۱۱

آپ اگر دیکھیں گے تو عام اسلامی صوفیہ کا آپ کو یہی مسلک نظر آئے گا، البتہ ان میں جو حضرات علمی اور دینی خدمات کے لیے اپنے آپ کو پابند بنا لیتے تھے، تو ظاہر ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۷) پیدا کیا ہے، حضرت سمنانی فرماتے تھے "می خواہد کہ معمور باشد و فائدہ بخلق رسد" (یعنی خدا چاہتا ہے کہ زمین اور اس کی قابل کاشت زمین آباد رہیں اور ان سے خلق اللہ کو نفع پہنچے) اس کے بعد ہے "اگر خلق بدانند کہ از عمارت دنیا کہ برائے فائدہ و دخل کنند نہ بوجہ اسراف چہ ثواب است ہرگز ترک عمارت نکنند" یعنی دنیا کی آبادی جو بغرض فائدہ اور آمدنی کی جائے محض فضول خرچی مقصود نہ ہو اگر لوگوں کو اس کا ثواب اور اجر معلوم ہو تو ہرگز زمین کو غیر آباد نہ رکھیں، اسی طرح "اگر بدانند کہ از ترک عمارت و گذاشتن زمین را معطل چہ گناہ حاصل می شود ہرگز نہ گذارند کہ اسباب او خراب شود" (یعنی غیر آباد رکھنے میں جو گناہ ہوتا ہے اگر لوگوں کو اس کا علم ہو جائے تو ہرگز آبادی کے اسباب و ذرائع کے برباد ہونے پر کوئی تیار نہیں ہو سکتا) بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی ہے آخر میں ارشاد ہے تمثیل سے سمجھایا گیا ہے۔ "ہر کسے کہ زمینے دارد کہ ہر سال ازاں زمین ہزار من غلہ حاصل می تواند کرد اگر بہ تقصیر و اہمال، نہ صد من حاصل کند و سبب آں صد من از خلق خلق دور افتد بقدر آں از وے باز خواست خواہند کرد" (یعنی کسی کے پاس زمین ہے جس سے ہزار من غلہ پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن قصداً کوتاہی اور غفلت کو کام میں لا کر بجائے ہزار من کے نو سو من ہی غلہ اس کھیت میں پیدا ہوا، تو سو من جو محض اس کی سستی اور کوتاہی کی وجہ سے خلق اللہ کے منہ تک نہ پہنچ سکا تو یہ سو من غلہ اس غافل سست عمل کاشتکار سے وصول کیا جائے گا اور اس کی باز پرس ہوگی)، بتائیے جس طبقہ کا یہ خیال ہو اس پر رہبانیت اور جوگیت کا اثر کسی حد تک درست ہو سکتا ہے تفصیل کے لیے دیکھیے میری کتاب "اسلامی معاشیات" ۱۲

کر کسب معیشت کا ان کو موقعہ کہاں سے مل سکتا تھا، خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو منصب نبوت و دعوت پر سرفراز ہونے کے بعد کوئی معاشی پیشہ اختیار نہیں فرمایا تھا،

یورپ کا تکروہ پروپگنڈا

لوگ باوجودیکہ عموماً ان باتوں سے واقف ہیں مگر پھر بھی حیرت ہوتی ہے کہ آخر ہندوستانی جوگیت اور ہمارے بزرگوں کے طریقۂ کار میں لوگوں کو کیا مشابہت نظر آئی، جو یورپ کے اس افترا کے تسلیم کرنے پر مضطر ہوگئے۔ یورپ تو تصوف ہی نہیں، ہمارے سارے علوم بلکہ خود ہمارے دین ہی کو بحیرا راہب اور ورقہ بن نوفل کی تعلیم سے ماخوذ قرار دیتا ہے، پھر ایک بیچارے صوفیہ نے کیا قصور کیا تھا، کہ اسلامی صفوں سے ان ہی کو باہر نکال کر سرقہ و انتحال کے الزام میں ان ہی کو گردن زدنی قرار دیا گیا، اس الزام سے اسلام کا کون سا شعبہ محفوظ ہے، ہندو فقیروں، جوگیوں، بیراگیوں کا طرز عمل کوئی ایسا پوشیدہ راز بھی تو نہ تھا کہ اسلامی صوفیہ کے طریقۂ کار اور اس کا موازنہ اور مقابلہ ناممکن ہوتا۔

ہندی تصوف اور جوگیوں کا حال

ابو الفضل طبا طبائی سبھوں نے تحقیق کے ساتھ ہندی تصوف کی کیفیت لکھی ہے، کم از کم لوگ اسی میں پڑھ لیتے ہیں طباطبائی کی کتاب سیر المتاخرین سے نقل کرتا ہوں کہ اس کے الفاظ ذرا مانوس ہیں، یہ بتا کر کہ ہندو درویشوں کی چند قسمیں ہیں، وہ لکھتے ہیں:

نخستین دا اول قسم صنف سناسیاں	پہلی قسم سنیاسیوں کی ہے ان میں ایک
اوّل خاک نشیناں جبے مہر خاموشی برلب	طبقہ خاک نشینوں کا ہے اور دوسرا گروہ
نہادہ حرف زدنی ندانند	خاموش رہنے والوں کا جو لب پر خاموشی کی مہر لگا لیتے ہیں۔

یہی لوگ مُنی ہوتے ہیں، یہ صوم صمت پر گویا عامل ہیں جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

لے ممانعت فرمادی ہے، اگرچہ حضرت مریمؑ کے قصہ میں قرآن نے اس روزہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

فرقیے ہر دو دست را مائل بآسمان گذارند	ان میں ایک فرقہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان
وبعضے خود را معکوس در درخت آویختہ	کی طرف اٹھائے رکھتا ہے اور بعض لوگ اپنے
تمکید تن خویشتن بآتش می نمایند وجمعے	کو درخت پر الٹا لٹکا کر اپنے جسم کو آگ سے
نظر بسوے آسمان برداشتہ نظر بر آفتاب	سینکتے ہیں۔ اور کتنے لوگ اپنی
دوختہ دارند وبرخے بہ پا ایستادہ شب	نگاہ آسمان کی طرف اٹھائے آفتاب پر نگاہ
وروزی گذارند	جمائے رکھتے ہیں اور کچھ لوگ یک پاؤں پر دن رات
	کھڑے رہتے ہیں۔

آپ ہی بتائیے کہ جو پانچوں وقت کی نماز اور وہ بھی با جماعت جس کے لیے پڑھنا ضروری ہو، کیا وہ اسلامی صوفی ان عجیب وغریب مشاغل کو مذہباً اختیار کر سکتا ہے، میری گفتگو کا تعلق ان بازاری بھنگڑوں سے نہیں ہے جنہوں نے بے دینی کا نام دین اور لا مذہبیت کا نام مذہب رکھ چھوڑا ہے، بلکہ اکابر وائمہ صوفیہ سے بحث ہے خصوصاً خواجگان چشت کے سربرآوردہ بزرگوں سے کہ ان ہی کی طرف ہندوستان کی خصوصیت کی وجہ سے اس قسم کے خرافات کا انتساب اس زمانہ میں ذرا زیادہ جسارت سے کیا جا رہا ہے، ان پر سب سے بڑا الزام سماع کا لگایا جاتا ہے، لیکن اس کی جو اصل حقیقت بزرگوں میں تھی اسے آپ سن چکے۔

سماع اور بزرگانِ چشت

اور سماع کے متعلق تو میرا خیال ہے کہ جس خاص طریقہ سے بعض صوفیوں میں یہ مروج تھا، اس کی نظیر دوسرے مذاہب میں بمشکل مل سکتی ہے، بلا شبہ گانے بجانے اچھلنے کودنے کا رواج بعض غیر مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے، لیکن ہمارے بزرگوں کی سماع کی مجلسوں کا جو طریقہ تھا اور جن خاص خصوصیتوں

کے ساتھ اکابر سماع سنتے تھے، میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں سے پہلے دنیا کی کسی قوم میں اس قسم کی مجلسوں کا رواج ہو، اب اگر کہیں مروج ہو ابھی ہو تو میں یقین دلاتا ہوں کہ اسلامی صوفیہ ہی سے یہ طریقہ ماخوذ ہے ورنہ کہاں وہ دیوتاؤں اور دیویوں کے سامنے اچھل اچھل کر چیخ چیخ کر بھجن خوانی، اور کہاں پاکوں کے یہ روحانی مجالس، کاش! جن لوگوں کو ریسرچ کا شوق ہے وہ اسی مضمون پر ریسرچ کرتے، میرے لیے تو اتنا وقت نہیں ہے کہ اس پر کوئی مفصل مضمون لکھ سکوں، اس لیے ان چند اشارات ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

سلطان المشائخ پر جادو کا واقعہ

خیال تو کیجیے کہ جن بزرگوں کا حال یہ ہو کہ معمولی جادوگروں اور ساحروں کی نفسانی قوتوں سے جو متاثر ہو جاتے ہوں اور اس کے ازالہ میں وہ اسی طرح عاملوں وغیرہ کے محتاج ہوں جیسے مادی امراض میں بھی مدبروں کے، کیا ان ہی کے متعلق یہ قابل تصور بات ہو سکتی ہے کہ وہ کچھ اسی قسم کی نفسانی ورزشوں سے اپنے اندر تصرف وغیرہ کی قوت پیدا کرتے تھے، فوائد الفواد میں حسن علاء سنجری نے براہ راست حضرت سلطان المشائخ کی زبانی یہ واقعہ نقل کیا ہے، یہ لکھنے کے بعد کہ:

"بندہ ایں خبر ناخوش آنحضرت ہم در شکر شنیدہ بود کہ کسے سحر کردہ بود ایں معنی عرضداشت کردہ شد کہ چہ گونہ بود"	بندے نے لشکر میں یہ ناخوشگوار خبر سنی کہ کسی شخص نے حضرت پر جادو کر دیا ہے، یہ عرض کر کے پوچھ رہا تھا کہ اس کی کیا صورت تھی۔

جواب میں سلطان المشائخ نے جو فرمایا میر نے آتے بجنسہ نقل کیا ہے، یعنی:

فرمودند کہ آرے مدت دو ماہ زحمت (بیماری) دیدم زحمتے عظیم شد تا مردے را بیاوردند کہ او در بیرون آوردن علامات سحر بہاتے	فرمایا ہاں دو مہینے بیماری میں مبتلا رہا بہت تکلیف ہوئی کہ ایک شخص لایا گیا جو جادو کے آثار نکالنے میں مہارت رکھتا تھا چنانچہ

داشت، القصه آں مرد پیاده پیش خانه
و حوالی آں می گشت و ہر بار قدرے گِل از
زمین بر می داشت و بوئی می کرد، دریں
میاں گِلے را بو کرد و گفت ایں جا بکاوید
علامات سحر پیدا شود آں گاہ اندک مایہ
خفتے پیدا شد، دریں میاں آں مرد گفت
من آں قدر مہارت می دارم کہ اگر بگوید
کسی را کہ سحر کردہ است نام آں ہم بگویم
خبر بمن رسانیدند، گفتم زنہار او را منع
کنید تا نگوید ہر کہ کردہ من از او عفو
کردم (فوائد الفواد) ص ۱۷۸

وہ آیا گھر کے آگے اور ارد گرد چکر لگایا اور
ہر بار زمین سے تھوڑی مٹی اٹھا لیتا اور
سونگھتا تھا، اس نے کوئی مٹی کو سونگھ
کر کہا اس جگہ کھودو، لوگوں نے اس جگہ کو کھولا کچھ
علامتیں ظاہر ہوئیں اس وقت تھوڑی سی
تسکین محسوس ہوئی اسی اثنا میں اس نے کہا
کہ میں اتنی مہارت رکھتا ہوں کہ اگر
آپ اجازت فرمائیں تو اس کا نام بتا دوں
جس نے جادو کیا ہے، لوگوں نے مجھ کو بتلایا
نے کہا اس کو منع کر دو ہرگز نام نہ بتائے
جس نے جادو کیا ہے، میں نے اس کو معاف کر دیا

سوچنے کی بات ہے کہ سحر اور جادو اور اسی قسم کی نفسانی دراندازیوں سے جو ایک عام آدمی کے طریقے سے متاثر ہوتے ہوں اور دعمل کرنے والے کی دفع سحر کے لیے ان کو بھی ایسی ہی ضرورت ہو، جیسے ایک عامی آدمی کو ہو سکتی ہے۔

شیخ فرید پر جادو

کیا ان کے تعلق جو گیا نہ مشقوں کا شبہ بھی ہو سکتا ہے، اور کچھ سلطان المشائخ ہی کے متعلق سحر کا یہ قصہ نہیں ہے، اسی کے بعد امیر حسن علاء نے لکھا ہے کہ

"دریں میاں عرضداشت کرد شیخ الاسلام
فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز را نیز
سحر کردہ بودند اثر می داد کہ آں سحر بود
آمد و آں را کہ مرتکب ایں کار بود ... یا نمند"

میں نے عرض کیا کہ حضرت شیخ
الاسلام فرید الدین پر بھی جادو کیا گیا تھا،
آپ نے فرمایا ... کیا گیا، اور جس
جماعت کی یہ حرکت تھی اسے لوگوں نے معلوم کر لیا۔

آگے طویل قصہ ہے کہ اجودھن کے والی نے ان ساحروں کو گرفتار کرکے حضرت شیخ گنج شکر گنج کے پاس بھیجا، آپ نے سب کو بخش دیا، اور حاکم سے سفارش کی کہ ان کو چھوڑ دیا جائے، واللہ اعلم والی اجودھن نے بخشا بھی یا نہیں کیونکہ اسلامی قانون میں تو ساحر واجب القتل ہے۔

سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر

اس واقعہ کے ذکر کرنے سے میری غرض یہ بھی ہے کہ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی بعض صحیح روایتوں میں جو آتا ہے کہ آپ پر سحر کیا گیا تھا، لوگوں کو اس پر حیرت ہوتی ہے لیکن میرے نزدیک تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اس پر بچولزم، اسمریزم وغیرہ ساحرانہ اعمال کا جو شبہ خواہ مخواہ دلوں میں ایسی ہستیوں کے متعلق ہوتا ہے جن کی ساری کرامت یا سارا معجزہ تعلق باللہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اس قسم کے واقعات سے اسی شبہ کی تردید قدرت کی طرف سے ہوتی ہے۔

پلٹ پلٹ کر ایک خاص مسئلہ میں میری واپسی ممکن ہے کہ بعضوں کو گراں بھی گذر رہی ہو، لیکن دلوں کی ویرانی کا جو عام حال ہے اس نے میرے اندر جو زخم پیدا کیے ہیں، کیا کروں، کہ اس ہی میں ٹیس آٹھتی ہے، خصوصاً ان مخلص نوجوانوں پر افسوس ہوتا ہے جو ہوائے دل کی بساط کے تارہ وار دہیں، دماغی تخمیر ہی کو کافی سمجھ کر ان میں اکثر اخلاص کے ساتھ عمل کے میدان میں اتر پڑے ہیں، لیکن ہلکی سی آزمائش معمولی سا ابتلاء ان کے قدم میں لغزش پیدا کر دیتا ہے اور یہ اس خامی کا لازمی نتیجہ ہے، جو غیر تربیت یافتہ قلوب میں بہرحال باقی رہ جاتی ہے، خواہ دماغوں کو کتنا ہی روشن کیا گیا ہو، آخر جس کی بینائی توی ہے کیا ضرور ہے کہ شنوائی بھی اس کی ضعیف نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ سارا اخلاص معمولی ٹھیس کی برداشت کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا، اچانک نفسانیت، تعصب، بے انصافی کے زہر سے سینے معمور ہو جاتے ہیں، جاتا

ہوں کر قلبی تربیت کی جو حقیقی صورت ہی رہ ہے، جن سے حریفوں نے بے بنیاد باتوں کے ذریعہ سے انہیں بدکا دیا ہے، اس کی متعلقہ غلط فہمیاں دور ہوں، ہو سکتا ہے کہ ان میں کوئی خیر کے ساتھ موفق ہو۔

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ	نہیں چاہتا ہوں میں لیکن صرف سلجھاؤ، جہاں تک
مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْ	میرے بس میں ہے (صداقت) کی توفیق اور اس کے
اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ	ساتھ میل اللہ ہی کے حکم سے ہو سکتا ہے اسی پر میں نے بھروسہ
وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۔	کیا، اور اسی کی طرف جھکتا ہوں۔

میں تو چند اوراق میں ایک مختصر مضمون لکھنے بیٹھا تھا، لیکن بے اختیار مضمون نے مقالہ کی، اور مقالہ نے اب تک تو شاید ایک مستقل کتاب ہی کی شکل اختیار کرلی بات میں بات نکلتی چلی آئی قلم کو میں نے بھی نہیں روکا، واللہ اعلم حق تعالیٰ کی کیا غرض ہے

اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ	زمین والوں کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ میرے ان ہفوات
اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا	سے اظہار سے، کیا گیا ہے، یا ان کے رب نے کسی خیر کا ارادہ فرمایا؟

تصوف اور تشیع

بہرحال جب طوالت کا مجرم ہو ہی چکا ہوں، تو اسی سلسلہ کی ایک اور چیز کیوں تشنہ چھوڑ دی جائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تصوف وصوفیہ کے متعلق جہاں ایک طرف جوگیت اور براگیت کے اتہام کو اچھالا گیا ہے، اسی سلسلہ میں بعضوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ تصوف کا رشتہ تشیع سے لاتے ہیں، منشا صرف اتنا ہے کہ عموماً صوفیہ کرام کا رجحان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف بہ نسبت زیادہ نظر آتا ہے، واقعہ یہی ہو یا نہ ہو لیکن بات مشہور کردی گئی، سوچنے اور غور کرنے سے پہلے چیزوں کو چلتا کر دینے کی عادت جن لوگوں میں ہوتی ہے، وہ اسے لے اڑے پھیلا دیا گیا کہ صوفی ایک قسم کے شیعہ ہیں، بلکہ بعض لوگ تو شیعیت کی ذمہ داری صوفیوں ہی کے سر تھوپتے ہیں۔

اس وقت مجھے اس سے بحث نہیں کہ حضرت سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے

ساتھ حضرات صوفیہ کے جس رجحان طبع کو مشہور کیا گیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے، یا اہل بیت نبوت سے کیا واقعی صوفیوں کا تعلق جادۂ اعتدال اور ایمان و اسلام کے حقیقی تقاضوں سے ہٹا ہوا ہے۔ اس کے لیے تو بجائے میرے زیادہ مناسب ہوگا کہ خود ان حضرات کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ غزالی، ابن عربی، سلاسل صوفیہ کے ائمہ حضرت سیدنا الشیخ جیلی سیدنا شہاب الدین سہروردی، سیدنا بہاء الدین نقشبند عارف روم اور ہندوستان[1] کے مشائخ چشت، اکابر مجددیہ وغیرہم کے اقوال، ملفوظات مکتوبات و تالیفات پڑھیے آپ پر خود حقیقت واضح ہو جائے گی، ان میں اکثر بزرگوں کی خود لکھی مستند کتابیں موجود ہیں، اور جن کی کتابیں نہیں ہیں ان کے ملفوظات یا مکتوبات پائے جاتے ہیں۔

---

[1] ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے خود اور ان کے بعد اس خاندان کے اکابر شاہ ولی اللہ میرزا مظہر جان جاناں شاہ عبدالعزیز وغیرہم حضرات نے تشیع کے خلاف میں جو کام کیا ہے وہ آج کس پر پوشیدہ ہے، اسی ہندوستان میں حضرت مولانا عبدالعلی بحر العلوم تھے، جو مجددی نہیں بلکہ شیخ ابن عربی کے غالی عقیدت مندوں میں ہیں، انکا نام ایک سطر کے آداب والقاب کے بغیر نہیں لیتے، ان کے متعلق حدائق حنفیہ میں یہ لکھا ہے، ان کا (مولانا بحر العلوم کا) قول تھا کہ مجھ کو عالم رؤیا میں حضرت ابوبکر صدیق رضی کی زیارت ہوئی انہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھ کو اپنی بیعت میں داخل کیا اور تعلیم و ارشاد طریقت کا حکم دیا پس میں خاص ان ہی کا مرید ہوں اور ان کے واسطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مجھے سلسلہ انتساب بیعت کا پہنچتا ہے ص۴۶۳ مولانا بحر العلوم کو اس بات میں اتنا غلو تھا کہ ۔۔۔۔۔۔۔ ا کہ اسی کتاب میں ہے، "چنانچہ جو شخص اس سلسلہ میں ان سے بیعت کرتا تھا، آپ اسے ایک واسطہ سے شجرہ لکھ کر اس کو دیتے تھے" ص۴۶۴ میرا خیال ہے کہ تصوف کا اگر تشیع سے کچھ بھی تعلق ہوتا تو سب سے زیادہ اس کا اثر سر خیل صوفیہ ابن عربی اور ان کے پیروؤں پر ہونا چاہیے، حالانکہ تشیع ہی کا یہ رنگ ہے نہ ان کے ماننے والوں کا۔

شیعوں کا مسلک صوفیاء کے حق میں

بہر کیف اس وقت جیسا کہ میں نے عرض کیا اس مسئلہ پر اس حیثیت سے گفتگو نہیں کرنا چاہتا بلکہ آپ کے سامنے میں ایک نئی چیز پیش کرتا ہوں، مطلب یہ ہے کہ صوفیہ کرام کی طرف تشیع کا انتساب صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ خود شیعوں کا حضرات صوفیہ کرام کے متعلق کیا خیال ہے، حضرت غوث پاک یا مجدد الف ثانی کے متعلق تشیع کے حلقہ میں جو ناگفتنیاں کہی جاتی ہیں، اس کی تو شاید یہ توجیہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان بزرگوں سے نفرت شیعوں کو شخصی حیثیت سے ہے، مگر میں بتانا چاہتا ہوں کہ اشخاص و افراد نہیں پورے طبقہ صوفیہ کے متعلق ارباب امامیہ کے کیا خیالات ہیں؟ نجوم السماء شیعہ علماء کی تاریخ ہے اس کے مصنف ..... مولوی میرزا محمد علی ہیں، جن کے نام کے آگے دو سطروں کے طویل القاب لکھے ہوئے ہیں یعنی شیعوں کے کوئی مستند عالم ہیں، انہوں نے مذہب امامیہ کے ایک عالم شیخ حر عاملی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"شیخ حر عاملی رسالہ اثنا عشریہ فی رد صوفیہ آوردہ کہ جمیع شیعہ انکار بر صوفیہ داشتہ اند و تکفیر ایشاں نمودہ اند، در روایات مذہب ایشاں از ائمہ معصومین علیہم السلام نقل کردہ اند" (نجوم السماء ص ۳۲)	شیخ حر عاملی نے رسالہ "اثنا عشریہ فی رد صوفیہ" میں لکھا ہے تمام شیعہ صوفیاء کا انکار کرتے ہیں اور ان کی تکفیر کرتے ہیں اور اپنے مذہب کی روایتیں ائمہ معصومین علیہم السلام سے نقل کرتے ہیں۔

صوفیاء پر شیعوں کی طرف سے کفر کا فتویٰ

سنا آپ نے جن بیچاروں پر تشیع کا الزام لگایا جا رہا ہے، ان پر ایک دو طرف سے نہیں بلکہ جمیع شیعہ کی طرف سے کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا ہے، بعض شیعی علماء مثلاً نور اللہ شوستری یا بہاء الدین

لہ اسی شیعی مولویوں میں صدر شیرازی المشہور بہ صدرا بھی ہیں، جو تذکرہ صوفیوں کے معتقد ہیں، باقی اگلے صفحہ پر

عاملی کی کتابوں میں بعض اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ابن عربی وغیرہ کی تعریف پائی گئی ہے، مصنف کتاب نے سب کو تقیہ پر محمول کیا ہے، بہاء الدین عاملی کے متعلق تو یہاں تک نقل کیا ہے، کہ تقیہ کے طور پر انہوں نے جو کچھ کہا ہو، لیکن اصل اعتقاد صوفیوں کے متعلق ان کا جو تھا، اس کا اندازہ ان کے اس طرزِ عمل سے ہو سکتا ہے کہ:۔

"ہرگاہ در مجلس شیخ بعضے ازاں فرقہ حاضر شدے بعد از بیروں رفتن او جناب شیخ بہ تطہیر فرش امر می فرمود" ص۔۳۳

جب کبھی شیخ کی مجلس میں صوفیوں میں سے کوئی حاضر ہوتا تو اس کے چلے جانے کے بعد شیخ موصوف فرش کو پاک کرنے کا حکم فرماتے تھے۔

یعنی فرقہ صوفیہ کا کوئی آدمی اگر ان سے ملنے کے لیے حاضر ہوتا تو اس کے باہر نکلنے کے بعد ملا نور اللہ اس فرش کے دھونے کا حکم دیتے تھے جس پر غریب صوفی تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتا۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ جس طرح اہلِ سنت والجماعت میں ایک گروہ اہلِ حدیث کا پیدا ہو گیا ہے، جو صوفیہ سے بدگمان ہے، اسی طرح شیعوں میں بھی "اخباریوں" کا ایک طبقہ جو حال ہی میں ظاہر ہوا ہے اور وہ بھی "اجتہاد وقیاس" کا دشمن ہے، شاید صوفیہ سے یہ ناراضی اخباری جماعت کی کوئی خصوصیت ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ مصنف کتاب نے یہ بتاتے ہوئے کہ امامیوں میں اخباری جماعت کی ابتداء ملا محمد امین بن محمد شریف استر آبادی سے ہوئی، جیسا کہ اسی کتاب میں ہے:۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۶) اس لیے طبقۂ شیعہ میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے ان کے بیٹے ابراہیم نامی کے تذکرہ میں لکھا ہے:۔

"میرزا ابراہیم، از علماء متبحرین وبخلاف پدر خود صدر الدین شیرازی مسالک حق دقیق بود۔

یہ بھی لکھا ہے کہ ابراہیم کی پیدائش ملا صدرا سے مصداق یُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ بود ص۴۸

"ادست (یعنی ملا امین) اول کسے کہ در وطعن بر مجتہدین کشاد و فرقۂ ناجیہ امامیہ اثنا عشریہ را بدو قسم منقسم گردانید، یکے اخباری و دیگر مجتہد" (ص ۱۴۱)

ملا امین پہلے شخص ہیں جنھوں نے مجتہدوں پر طعن کا دروازہ کھولا اور فرقہ ناجیہ امامیہ اثنا عشریہ کو دو قسموں میں منقسم کیا ایک اخباری اور دوسرے مجتہد

بہرحال مصنف کتاب نے اس تفریق کی یہ "تاریخ" بتا کر لکھا ہے کہ ملا امین نے

"در کتاب خود فوائد مدنیہ طعن و تشنیع بسیار درحق مجتہدین نمود، بلکہ گاہے ایشاں را بسوئے تخریب دین نسبت کردہ است"

انہوں نے اپنی کتاب فوائد مدنیہ میں ان پر بہت طعن و تشنیع کی ہے بلکہ کبھی تو ان کو تخریب دین کی طرف بھی منسوب کر دیا ہے۔

۱؎ شیعوں میں گویا یہ اہل حدیث کا فرقہ ہے، ملا محمد امین کی وفات ۱۰۳۳ھ میں ہوئی ہے، یعنی گیارھوی
صدی کے آگئی ہیں، یہ ٹھیک وہی زمانہ ہے جب یورپ میں عیسائی بھی دو فرقوں میں منقسم ہو کر باہم ایک دوس
کے ساتھ دست و گریباں تھے، یعنی رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ الاحتجاجیہ عجب اتفاق ہے۔
قسطنطنیہ جو یورپ اور ایشیا بلکہ اسلام اور عیسائیت کا سنگم تھا وہاں چونکہ ترکوں کی کڑی حکومت تھی،
یورپ کے اس مذہبی فتنہ کا اثر نہ پڑا لیکن بجائے قسطنطنیہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایران کا ایک شیعی عالم
مجتہدین یا عیسائی اصطلاح میں کہیے کہ کلیسا کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہا ہے، اور اس کے کچھ ہی دن بع
جامع ازہر کا ایک طالب العلم عرب کے ایک دور افتادہ علاقہ نجد میں پہنچ کر سنیوں کے اندر بھی یورپ
کی اسی آواز کو دہرا رہا ہے کہ ہم پر علماء و ائمہ کا قول حجت نہیں براہ راست قرآن و حدیث سے جو بات میری سمج
میں آئے گی وہی مانیں گے، یعنی وہی بات کہ کلیسا کی تشریح سے پروٹسٹنٹ فرقہ والوں کو اختلاف ک
تورات وانجیل سے براہ راست اجتہاد کرنے کے وہ مدعی تھے، کیا ان ہی دنوں میں نصرانیت نے
یورپ سے پاؤں نکال کر اسلامی ممالک کو اپنے سیاسی اقتدار کے نیچے دبانا شروع کیا۔ یہ ایک
دلچسپ بات ہے، میں نے صرف اشارہ کیا ۲۔

مصنف کی اس باب میں جو رائے ہے، اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

لیکن (ملا امین) سخن نیک نگفتہ است	لیکن ملا امین نے یہ اچھا نہیں کیا ہے
و کلام خوب نہ کردہ و بموافقت صواب	اور نہ اچھی بات کہی ہے اور یہ درستی اور صحت
و سداد نرسید زیرا کہ فسادے عظیم بریں	کو نہیں پہونچے اس لیے کہ اس پر ایک بڑا
مرتب شدہ است" (ص ۴۲)	فساد مرتب ہوا ہے۔

مندرجہ بالا قول جیسا کہ ظاہر ہے اس کی کھلی ہوئی شہادت ہے کہ مصنف کتاب کا تعلق اخباریوں (یا شیعہ وہابیوں)[1] سے نہیں ہے، بلکہ وہی پرانے خیال کے مجتہدیہ یا گروہ مقلدہ سے تعلق ہے۔ ورنہ اگر اخباریوں سے ان کا تعلق ہوتا، تو اپنے پیشوا ملا امین کی شان میں وہ یہ الفاظ نہیں لکھ سکتے تھے کہ اس نے اچھی بات نہیں کہی ہے، اور سیدھی راہ پر نہیں چلے ہیں، ان کی وجہ سے بڑا بھاری فساد پیدا ہوا۔

میری غرض اس تفصیل سے یہ تھی کہ صوفیہ کرام سے ناراضی اور اتنی سخت ناراضی کہ صوفی جس فرش پر بیٹھ جاتا تھا، اس فرش کو دھلوا لیا جاتا تھا، جن شیعوں میں صوفیہ اور تصوف کے متعلق یہ خیال ہو کیا تماشے کی بات ہے کہ ان ہی صوفیوں پر شیعہ ہونے کی تہمت جوڑی جاتی ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ اگر ان بزرگوں کا تشیع کی طرف میلان بھی ہوتا

---

[1] میرے اس اصطلاحی لفظ پر برہم ہونے کی ضرورت نہیں، ملا امین کے متعلق اسی کتاب میں لکھا ہے، "بود در مدینہ منورہ اختیار مجاورت نمودہ بود و بعد ازاں در مکہ معظمہ رحلت ... ت اندا[ختہ]، وہ مرے بھی ہیں کہ معظمہ ہی میں تاریخ کی کڑیوں کے ملانے والے اگر چاہیں تو بہت سی باتیں جو ابھی صیغہ راز میں ہیں ان کو پا سکتے ہیں، میں تو ابھی صرف اسی پر اس وقت قناعت کرتا ہوں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی کہ شیعوں کی طرف سے ان پر کفر کا فتویٰ عائد کیا جاتا، اور ائمہ کی طرف سے ان کی مذمت میں روایتیں پیش کی جاتیں۔

شیعی تحریک کا مقابلہ صوفیاء کی طرف سے

اس وقت صوفیہ کے باب میں انتساب تشیع کے متعلق مجھے صرف اتنی بات کہنی تھی، لوگوں کی معکوس فہمیوں کا ماتم کس سے کیجیے، افسوس ہے کہ اس وقت تفصیل میرے پیش نظر نہیں ہے، ورنہ میں واقعات کی روشنی میں بتاتا کہ شیعہ تحریک کا جتنی سختی سے مگر بطرز حکیمانہ کارگر و موثر مقابلہ حضرات صوفیہ نے کیا ہے، علماء ظاہر سے وہ بات بن بھی نہیں پڑی ہے، آج مسلمانوں کی اکثریت[1] جو اہل سنت کی شکل میں بحمداللہ کرہ ارض پر پھیلی ہوئی ہے، میرا دعویٰ ہے

---

[1] مشاہدات و محسوسات کے خلاف دنیا میں چند خلاف واقعہ باتیں جو مشہور ہو گئی ہیں بے سوچے سمجھے ہر شخص ان کو دہراتا رہتا ہے، ان میں سب سے بڑا فریب اور سفید جھوٹ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کی شہرت ہے۔ جہاں جائیے، جس سے سنیے یہی سنیے کہ فرقہ بندیوں نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر رکھا ہے، مسلمانوں کی بربادی اور تباہی میں تو شبہ نہیں لیکن فرقہ بندیوں کا دعویٰ قابلِ غور ہے، یہ صحیح ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جب غیر اقوام کے افراد فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے تو اپنے آبائی اور موروثی جراثیم اپنے ساتھ لائے شعوری یا غیر شعوری طور پر ان جراثیم کا اثر مسلمان ہونے کے بعد بھی کچھ دنوں ان میں باقی رہا، ان ہی آثار میں مذہبی اور اعتقادی اختلاف کا عارضہ بھی تھا۔ اسلام کے سوا آپ کسی مذہب کا جائزہ لیجیے، ایک ایک مذہب میں بیسیوں کمیونٹیاں سمپردائے فرقے آپ کو نظر آئیں گے، اور کیسے فرقے کہ باہم خدا تک ان کے الگ الگ ہیں، کسی کا معبود شیو ہے تو کسی کا وشنو، کوئی مسیح و بیٹے کا پجاری ہے کوئی باپ کا، کوئی ماں کا، میں نے جیسا کہ کہا کہ ابتدائی صدیوں میں غیر قوموں نے اپنے اس عارضہ کو مسلمانوں میں بھی منتقل کیا، ملل و نحل کی کتابوں میں ان اسلامی فرقوں کی ایک طویل الذیل فہرست نظر آتی ہے، لیکن کیا یہ حال ہمیشہ باقی رہا؟ واقعہ یہ ہے کہ بہ تدریج یہ سارے ذہنی اختلافات مٹتے مٹتے کچھ ہی دن کے بعد اسلام نے زمین کے اس کرہ پر اپنا یہ حیرت انگیز معجزہ پیش کیا اور شاید ربانی اعجاز ہو)

کہ سنیت کے مسلک پر کم از کم عامہ مسلمین کو قائم رکھنے میں سب سے زیادہ مؤثر حصہ حضرات صوفیہ ہی نے لیا ہے، اہل بیت اطہار کے ساتھ ان کا ایک خاص ربط باوجود شدید تسنن کے اس کامیابی کی بہت کچھ ذمہ دار ہے، ورنہ مولویوں کے مناظرانہ مباحث کتابوں میں جس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۳۴۰) ایک حد تک یہ تماشا ابھی ختم نہیں ہوا ہے کہ نسل انسانی کی اتنی بڑی برادری جس کی تعداد چالیس سے ستر کروڑ کے لگ بھگ بھی جاتی ہے، ان میں شیعوں کی ایک قلیل تعداد کے سوا جن کی فردی حیثیت ایک تی صدی بھی مشکل ہی سے ہے بحمد اللہ ایک عقیدہ ایک خیال ایک قسم کے جذبات رکھتے ہیں، یعنی جن کی عام تعبیر اہل السنت والجماعت سے کی جاتی ہے، نادانوں کا گروہ جو یا تو فرقہ کے مفہوم سے ناواقف ہے یا ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے اتباع اور پیروکاروں کے باہمی اختلافات کی جو نوعیت ہے اس سے جاہل ہے، بہرحال جو یہ سمجھتے ہیں کہ اہل السنت والجماعت میں بھی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی چار فرقے ہیں، کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں میں باہم علاً کچھ اختلافات ضرور ہیں لیکن کیسے اختلافات؟ اسی قسم کے جیسے خود حنفیوں میں امام محمد، ابو یوسف، زفر، ابوحنیفہ وغیرہ کے آرا میں اختلاف ہے، غور تو کیجئے کہ جب حنفی، شافعی کے پیچھے نمازیں پڑھتا ہے، باہم ایک دوسرے سے بیعت ہوتے ہیں۔ تمام سنی مسلمانوں کے سب سے بڑے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ حنبلی ہیں، مگر حنفی، شافعی، مالکی تمام مسلمانوں کے وہ پیشوا ہیں، کیا جن لوگوں میں اس قسم کے تعلقات ہوں ان لوگوں کو مختلف فرقوں سے متعلق سمجھا جا سکتا ہے؟ لوگ کتابوں میں معتزلہ کرامیہ کے ساتھ خدا جانے کن کن فرقوں کا نام پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں میں وہ اب بھی موجود ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ شیعہ فرقہ کے سوا تقریباً تمام فرقے صدیاں گذریں کہ ختم ہو چکے، شاید خارجیوں کی تھوڑی تعداد مسقط وغیرہ میں سنا جاتا ہے کہ پائی جاتی ہے، ورنہ بحمد اللہ شیعوں کے سوا سارے مسلمان اس وقت ایک فرقہ اہل السنت والجماعت کی شکل میں موجود ہیں۔ بعض فرقوں مثلاً داؤدیہ، سلیمانیہ، اسماعیلیہ وغیرہ دراصل شیعوں ہی کی مختلف قسمیں ہیں۔ کل شیعہ طبقہ جب سو میں ایک کی حیثیت رکھتا ہے تو وہ قابل لحاظ کب ہے، میرا خیال ہے کہ اس یکسانیت کے پیدا کرنے میں حضرات صوفیہ کا ہاتھ سب سے زیادہ ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

شکل میں پائے جاتے ہیں، ان کے پڑھنے والوں کے اندر کسی ایک طرف غلو اگر پیدا کر دے تو کچھ تعجب نہیں۔

بہر حال "تعلیم" اور "تربیت" دونوں کا جو نظام اس ملک میں قائم تھا قریب قریب تمام اسلامی ممالک نہیں تو اسلام کے مشرقی علاقے یعنی خراسان، ترکستان، ایران، ہندوستان وغیرہ میں صدیوں سے اسی اصول پر تعلیم بھی ہو رہی تھی، اور تربیت بھی، اور یہ سلسلہ اس وقت تک باقی رہا، جب تک بجائے مشرق کے مغرب سے ایک عجیب تعلیم اور غریب تربیت کا آفتاب طلوع نہیں ہوا تھا، اس کے بعد تو خیر قیامت ہی برپا ہو گئی ہند میں بھی، مصر میں بھی، ترکی میں بھی، ایران میں بھی، حتیٰ کہ اب تو اس کی شعاعیں عرب کو بھی گرما رہی ہیں؛ ور اسلام' غریب اسلام کا آخری کوہستانی حصار یا پناہ گاہ افغانستان بھی اسی کی روشنی نما تاریکی میں بتدریج گھرتا چلا جا رہا ہے۔ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا

خاتمہ

اب آخر میں اسی مرحوم تعلیم و تربیت جو ہندوستان میں جاری تھی اسی کی بعض دیگر خصوصیتوں کا ذکر کر کے کتاب کو ختم کر دیتا ہوں۔

مکتوبات امام ربانی کا عربی ترجمہ

میرا مطلب یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بلکہ ان سے پہلے حضرت شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ہندوستان کے دینی و علمی کاروبار میں جو نئی ہلچل پیدا ہوئی، اور اس کے بعد ہندوستان کی طرف سے بعض ایسی چیزیں دنیائے علم میں یا کم از کم اسلامی علوم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۱) لیکن صوفیہ کا زور جب سے گھٹ رہا ہے یا اغیار کی دسیسہ کاریاں اسے گھٹا رہی ہیں؛ اب کچھ حالات بدل رہے ہیں، اسلامی حکومتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا، عام مسلمانوں پر اقتدار رکھنے والی نہ روحانی قوتیں باقی رہیں اور نہ سیاسی، ایسی حالت میں اب جو کچھ بھی پیش آئے یا آرہا ہے تو اسی کس سے بیجے شاخ پر بیٹھ کر جڑ ہی کو کھودنے والوں کو کون سمجھا سکتا ہے کہ دیفن کے ساتھ خود ان کو بھی گرنا پڑے گا۔

کے حلقۂ اثر میں پیش کی گئی ہیں، ان کے متعلق اگر ہمارا یہ ملک امتیاز کا دعویٰ کرے تو
کچھ بیجا نہ ہوگا، اسلامی ممالک نے مجدد الف ثانی کے مکتوبات کو جس نظر سے دیکھا ہے،
اس کا اندازہ آپ کو اسی سے ہو سکتا ہے کہ ان کے فارسی خطوط کا عربی زبان میں ترجمہ
قازان (روس) کے ایک مہاجر مکہ عالم ملا مراد نے کیا، سلطان عبد الحمید خاں خلیفۃ المسلمین
ترکی مرحوم کے عہد میں بغداد کے ایک عالم جلیل شہاب محمود آلوسی نے نو جلدوں میں روح
المعانی کے نام سے جو قیمتی معلومات سے مملو تفسیر لکھی، بکثرت اس تفسیر میں آپ کو مجدد
رحمۃ اللہ علیہ کے ان فارسی خطوط کے اقتباسات عربی شکل میں نظر آئیں گے۔

شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ

یوں ہی حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیفات بدیعہ خصوصاً
حجۃ اللہ البالغہ کے متعلق بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم
اسرار الدین میں یہ کتاب اپنی آپ نظیر ہے، متعدد بار مصر میں اس کا شائع ہونا خود اس
کتاب کی اولیت کی دلیل ہے، اور شاہ صاحب کے بعد مسلسل ہندوستان کا اسلامی
علوم کی طرف جو رجحان بڑھتا رہا، اس نے چودھویں صدی تک پہنچتے ہوئے حقیقت
یہ ہے کہ اسلامی علوم کے متعلق ہندوستانی علماء اسلام کے خدمات کو امتیازی کر دیا
ہے کہ اس وقت اگر یہ کہا جائے کہ اس باب میں ہندی مسلمانوں کا کوئی شریک و سہیم
نہیں ہے تو اسے شاید مبالغہ نہیں سمجھا جا سکتا، صرف فن حدیث ہی میں ان پچھلے دنوں
میں جو کام ہندوستان نے کیا ہے، مصر ہو، یا عرب، ترکی ہو، یا ایران، تونس ہو یا
مراکش کیا اس کے مقابلہ میں اپنا کوئی سرمایہ پیش کر سکتا ہے؟ اجمالاً پہلے اس کا ذکر
بھی کیا ہے۔

شیخ علی مہائمی کی تفسیر

اسی طرح تفسیر قرآن کے سلسلہ میں ہندوستان کے بعض جدید
کارنامے ایسے ہیں کہ کسی دوسرے اسلامی ملک کی طرف سے
مشکل ہی سے کوئی ایسی چیز پیش ہو سکتی ہے جسے ہم ہندوستان کے ان کارناموں کے

مقابلہ میں قابل لحاظ قرار دے سکتے ہوں۔

قرآن کا ایک بڑا عمیق اور گہرا علم جس پر اس وقت تک بہت کم کام ہوا ہے، وہ قرآنی آیات اور سورتوں کے باہمی ربط کا مسئلہ ہے، عجیب بات ہے کہ باوجود مہم ہونے کے اس وقت تک قرآن کے اس پہلو کی طرف بہت کم توجہ کی گئی، اور کوئی تفسیر اس خاص نقطۂ نظر سے ایسی نہیں لکھی گئی جسے خصوصی حسن قبول اہل علم کے حلقوں میں حاصل ہوتا، سب سے پہلے اس سلسلہ میں جو چیز یعنی نویں صدی کے ابتدا میں پیش ہوئی، وہ ہندوستان ہی کے ایک عالم حضرت شیخ علی المہائمی کا کارنامہ ہے، یعنی اپنی تفسیر تبصیر الرحمٰن نامی میں علامہ مہائمی نے قرآن کے اس پہلو پر بحث کرنے میں بڑی قوت نظر سے کام لیا ہے اور ان کی تفسیر کی امتیازی صفت یہی شمار ہوتی ہے۔

مولانا فراہی کا سلسلہ نظام القرآن

مگر یہ تو پچھلے زمانہ کی بات ہے، میں نے جیسا کہ عرض کیا دینی الٰہی تجدید کے بعد ہندوستان نے اپنی نشأت ثانیہ میں جو کام اس سلسلہ میں انجام دیا ہے، میرا اشارہ حضرت الاستاذ مولانا حمید الدین الفراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر "نظام الفرقان" کی طرف ہے، جس میں علاوہ دوسری خوبیوں کے (یعنی قرآن اور بائبل کے تعلقات اور ادبی مباحث) کے سوا سب سے بڑی اور مشترک خصوصیت مولانا کی اس تفسیر کے تمام حصوں میں یہی ہے کہ انہوں نے آیات قرآنی میں ربط پیدا کرنے کی ایسی عدیم النظیر کوشش فرمائی ہے کہ بسا اوقات صرف آیات کے یہی روابط اس کی دلیل بن جاتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کے سوا اور کسی کی طرف سے نہیں ہو سکتی!

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی خدمت

بہر حال حدیث کے سوا عربی زبان میں بھی، اور عربی سے زیادہ ہندوستان کی جدید مقامی زبان اردو میں ہندوستانی علماء نے اسلامی علوم کے مختلف شعبوں کے متعلق بعض

ایسی چیزیں لکھی ہیں کہ ہندوستان کا اگر اسے طغرائے امتیاز وسرمایہ ناز قرار دیا جائے تو اس کا وہ بجا طور پر حقدار ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اسلام کا ایک خاص فلسفہ عہد جدید کی ذہنیتوں کے مطابق جو تیار کیا ہے،

سیرۃ النبی اور دار المصنفین کی دوسری علمی کتابیں | یا مجلس دار المصنفین اعظم گڑھ نے سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ترتیب جس نئے انداز میں انجام دی ہے بلکہ دے رہی ہے، حتیٰ کہ اسی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ اُردو کی اس کتاب کے چند حصوں کا ترجمہ ترکی زبان میں شائع ہو چکا ہے اور عربی میں بھی جہاں تک مجھے معلوم ہے، ترجمہ کی تیاری ہو رہی ہے، یا ہو چکی ہے، اسی تابینی ادارہ نے معرفۃ الصحابہ کے علم میں جو ضخیم مجلدات اُردو میں شائع کیے ہیں، نیز اس کے سوا دوسرے علمی شعبوں پر جن تحقیقی اور تصنیفی کاموں کا سلسلہ جاری ہے، مشکل ہے ان کی نظیر اس وقت آپ کو کسی دوسرے اسلامی ملک میں نظر آئے گی، خود مولانا شبلی مرحوم جو اس ادارہ کے بانی ہیں، شخصی طور پر اسلام کی سیاسی وعلمی تاریخ کے متعلق جو مختلف کتابیں اُنہوں نے لکھی ہیں، انصاف سے اگر کام لیا جائے ـــــ اور مذہبی اختلاف کو اعترافِ فضل میں بلاوجہ دخل نہ دیا جائے۔ تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کاموں کا اکثر حصہ ایسا ہے جو اپنی خصوصیات کی بنیاد پر اچھوتا ہے، اُردو ہی میں نہیں عربی میں بھی مولوی صاحب مرحوم کی تصنیفات ومقالات امتیازِ خاص کے حصہ دار ہیں۔

جسٹس سید امیر علی کی علمی خدمات | اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انگریزی زبان میں بھی اسلامیات کے متعلق اس وقت تک جتنا اچھا مواد مسلمانوں کے قلم سے منتقل ہوا ہے اس میں بھی سب سے بڑا حصہ ہندوستان ہی کا ہے، جس کا اندازہ آپ کو مصر کے جدید مصنفین کی کتابوں سے ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں زیادہ نمایاں کے

اقتباسات اور شواہد سید امیر علی اور صلاح الدین خدا بخش مرحوم کی کتابوں سے لیے گئے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اہلِ قلم کے سوا گویا انگریزی بلکہ شاید کسی دوسرے مغربی زبان میں بھی دوسرے ممالک کے مسلمانوں نے کوئی کام ہی نہیں کیا ہے۔

بہرحال ہندوستان کے یہ سارے کارنامے جو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کے بعد کے ہیں، جن کی اگر تفصیل کی جائے تو میں نے جو کچھ اجمالاً عرض کیا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ کاش! اس کام کو کوئی الگ کر کے دکھاتا، کیونکہ اس سلسلہ میں بہت سی چیزیں حقیقت یہ ہے کہ بالکل نئی ہیں، مگر میری بحث کا زیادہ تر تعلق چونکہ ہندوستان کے قدیم نظامِ تعلیم اور اس کے نتائج سے ہے اس لیے چند ایسی چیزوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جنہیں اگرچہ چنداں اہمیت حاصل نہیں لیکن خصوصیت بہرحال خصوصیت ہے۔ جب اس تعلیم اور اس کے نتائج کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہی ہو رہی ہے تو خصوصیت و امتیاز کے اس پہلو کو کیوں چھوڑ دیا جائے، بلکہ ممکن ہے جیسا کہ آئندہ شاید معلوم بھی ہو، کہ خصوصیت کے سوا ہندوستان کے ان خصوصی خدمات کی کوئی چاہے تو قیمت بھی پیدا کر سکتا ہے۔

کشاف اصطلاحات الفنون اور اس کے مصنف

اس سلسلہ میں بارہویں صدی کے وسط میں ایک کام ہندوستان کا وہ ہے، جسے ہم چاہیں تو اسلامی علوم کا ایک انسائیکلوپیڈیا یا دائرۃ المعارف قرار دے سکتے ہیں، میں حضرت شیخ محمد علی بن علی التھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "کشاف اصطلاحات الفنون" کی طرف اشارہ کر رہا ہوں عربی دائرۃ المعارف کے مصنف بستانی نے بھی "التھانوی" کے عنوان سے مولانا کی اس کتاب کا وزن دار الفاظ میں ذکر کیا ہے: (دیکھیے جلد ششم ص ۳۰۴، دائرۃ المعارف للبستانی)

اس کے مصنف کے حالات	افسوس ہے کہ صاحب کتاب کے متعلق باوجود تلاش وکوشش کے اب تک صرف اتنا ان ہی کی کتاب سے معلوم ہوسکا کہ ان کا نام اور

نسب تو یہ تھا، جیسا کہ خود لکھتے ہیں۔

یقول العبد الضعیف محمد علی بن شیخ علی بن قاضی محمد حامد بن مولٰنا اتقی العلماء محمد صابر الفاروقی السنی الحنفی۔	یعنی عرض کرتا ہے بندہ ضعیف محمد علی ابن شیخ علی بن قاضی محمد حامد بن مولانا محمد صابر جو اتقی العلماء کے لقب سے ملقب تھے (اپنے نسب کی طرف) فاروقی کے لفظ سے اور عقاید و عمل کے لحاظ سے سنی حنفی ہونا اپنے کو بیان کیا ہے۔

جس سے پتہ چلتا ہے کہ علمی خانوادے سے آپ کا تعلق تھا، غالباً آپ کے خاندان میں قضا کا عہدہ بھی چلا آرہا تھا، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں سب اپنے والد سے پڑھی تھیں جیسا کہ فرماتے ہیں۔

فلما فرغت من تحصیل العلوم العربیۃ والشرعیۃ من حضرت جناب استاذی و والدی۔	یعنی علوم عربیہ اور دینیہ شرعیہ کی تعلیم سے میں فارغ ہوا اور تعلیم حضرت جناب والد سے میں نے حاصل کی۔

البتہ علوم عقلیہ مثلاً طبیعیات، الٰہیات ریاضیات وغیرہ فنون کا اُستاد کی امداد کے بغیر خود مطالعہ کیا ہے، جو ان کے ان الفاظ سے ظاہر ہے۔

شمرت عنان ساق الجد الی اقتناء ذخائر العلوم الحکمیۃ الفلسفیۃ والحکمۃ الطبیعیۃ والالٰھیۃ والریاضیۃ کعلم الحساب والھندسۃ والھیئۃ والجبلۃ سطرلاب ونحوھا فلم یتیسر تحصیلھا	میں علوم حکمیہ فلسفیہ اور حکمت طبعی، الٰہی، ریاضی مثلاً حساب، ہندسہ، ہیئت، اسطرلاب وغیرہ کے سیکھنے کے لیے آمادہ ہوا، لیکن ان فنون کے اساتذہ سے پڑھنے کا موقع نہ مل سکا، تب میں نے ان فنون کی مختصر کتابوں

من الامائذہ فصرفت شطرا من الزمان إلى مطالعة مختصرات تھا الموجودة عندی فکشفھا اللہ علیّ	کا مطالعہ شروع کیا جو ہمارے پاس موجود ہیں، خدا نے ہم پر ان کے مسائل کھول دیے۔

بس ان چند اجمالی باتوں کے سوا اور کوئی تفصیلی خبر ان کے متعلق کسی کتاب میں اب تک نہیں ملی ہے۔ تذکرۂ علمائے ہند میں بھی ان کا ترجمہ درج نہیں ہے، جو محل حیرت ہے، دیباچہ کے آخر میں مصنف نے یہ لکھ کر "حصل الفراغ من تسویدہا سنۃ الف ومائۃ وثمانیۃ وخمسین" یعنی ۱۱۵۸ھ میں اس کتاب کی تصنیف سے فارغ ہوتے ہیں جس کا مطلب یہی ہوا کہ بارہویں صدی کے عالم ہیں، گویا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کے معصروں میں ہیں۔

کشاف اصطلاحات الفنون نامی کتاب کی حیثیت

بہر حال مصنف کتاب کے حالات نہ معلوم ہوں تو کام تو موجود ہے، میں نہیں جانتا کہ ہندوستان سے پہلے اس قسم کا جامع اور حادی کام کسی اور اسلامی ملک میں انجام دیا گیا ہے[1]۔ زیادہ سے زیادہ دو کتابیں یعنی میر سید شریف کا مختصر رسالہ "تعریفات" اور ابوالبقا کی کلیات کے سوا مجھے کسی دوسری کتاب کا اس سلسلہ میں حال معلوم نہیں، لیکن کشاف کے مقابلہ میں جاننے والے جانتے ہیں کہ ان دو کتابوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر سپرنگر کو اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور کلکتہ سے مدت ہوئی ٹائپ کے حروف میں دو ضخیم جلدوں کی شکل میں یہ کتاب شائع کی گئی لیکن اب تقریباً نادر الوجود ہے، صرف یہی اس کتاب کی خصوصیت نہیں ہے

---

[1] ایک کام قریب قریب اسی نوعیت کا ہندوستان کے جنوبی علاقہ احمد نگر میں مولانا عبد النبی احمد نگری نے دستور العلماء نامی کتاب کے ذریعہ سے انجام دیا ہے جس کے بعض اقتباسات کا ذکر اسی کتاب میں بھی کیا گیا ہے، دائرۃ المعارف حیدرآباد سے مدت ہوئی یہ کتاب چھپ کر شائع ہو چکی ہے ۱۲

ہر قسم کے علوم عقلیہ و نقلیہ مسلمانوں میں ان کے زمانہ تک مروج تھے ان کے اصطلاحات کی تعریفیں کتابوں سے اخذ کرکے اس کتاب میں درج کر دی گئی ہیں بلکہ خود اپنی ذاتی تحقیق سے بھی مصنف نے بکثرت کام لیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کتاب دنیا کی انسائیکلوپیڈیاؤں میں سب سے پہلی انسائیکلوپیڈیا ہے، بشرطیکہ چینی اور جاپانی انسائیکلوپیڈیاؤں کو مستثنیٰ کر دیا جائے کیونکہ وہ خصوصاً چینی انسائیکلوپیڈیا تو دیوار چین کی طرح دنیا کے عجائبات میں ہے، لیکن ان کے سوا یورپ میں بھی جو انسائیکلوپیڈیائیں لکھی گئی ہیں، جہاں تک میرا خیال ہے التھانوی کی اس عجیب و غریب کتاب کے بعد ہی مرتب ہوئی ہیں۔ انگریزی، فرنچ وغیرہ مغربی زبانوں میں انسائیکلوپیڈیا کا رواج اٹھارویں صدی کے وسط میں ہوا۔

دیگر ہندوستانی علماء کی تصانیف

البتہ فارسی میں ایک کتاب نفائس الفنون فی عرائس العنون ضرور ایسی کتاب ہے جسے حاویات اور محیطات کے سلسلہ میں جگہ دی جا سکتی ہے، لیکن پھر بھی کشاف الاصطلاحات الفنون کے مقابلہ میں یہ کتاب نہیں آسکتی۔ امام رازی نے بھی ایک کتاب حدائق الانوار فی حقائق الاسرار نامی ترکی بادشاہ کے نام سے لکھی ہے کہتے ہیں کہ اس کتاب میں ساٹھ علوم کے مسائل جمع کر دیے گئے ہیں۔

ایک کشمیری عالم کی تصنیف

مگر اسی کے ساتھ غالباً اس کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستان جس سے میں کشمیر وغیرہ کو مستثنیٰ نہیں سمجھتا کے ایک کشمیری عالم شیخ الاسلام مفتی قوام الدین محمد حسن کی وفات ۱۲۱۹ھ میں ہوئی ہے صاحب حدائق حنفیہ نے ان کے ذکر میں لکھا ہے کہ آپ نے

"کتاب صحائف سلطانی ساٹھ علم میں تصنیف کی۔" ص ۴۶۴

واللہ اعلم بالصواب یہ امام رازی کی کتاب سے ماخوذ ہے یا شیخ الاسلام نے کوئی الگ

کتاب لکھی ہے، بہرحال ہے تو ہندوستان کی یہ بھی ایک چیز اسی طرح واجد علی خاں کی کتاب مطلع العلوم ومجمع الفنون کا ذکر بھی کروں گا۔

فیضی کی بے نقط تفسیر

کشاف الاصطلاحات والفنون کے بعد دوسری چیز اس سلسلہ میں جو قابل ذکر ہے وہ وہی ہے جس کے متعلق میں نے پہلے بھی وعدہ کیا ہے، فیضی کی غیر منقوط تفسیر سواطع الالہام ہے فیضی اور ابوالفضل دونوں کے پدر بزرگوار کے دینی پہلو کے متعلق جو میرے خیالات ہیں مختلف حیثیتوں سے بغیر کتمان کے میں اس کا ذکر کرتا چلا آیا ہوں لیکن۔

"عیبہا جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو"

ناانصافی ہوتی، اگر میں اس کے ذکر سے لاپروائی برتتا۔

میرا خیال ہے کہ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر شاید دوسرے اسلامی ممالک کے علمی حلقوں میں نہیں مل سکتی، اشارہ ملا ابوالفیض فیضی کی مشہور تفسیر سواطع الالہام کی طرف کر رہا ہوں، یوں تو اہل علم میں ایسا کون ہوگا، جو ان کی اس تفسیر اور اُس کی خصوصیت خاصہ سے واقف نہ ہو، میں نے بھی شاید اشارے اس کی طرف کیے ہیں، لیکن اس تفسیر کے پیچھے جو واقعات ہیں، ان پر لوگوں کی کم نظر گئی۔

اتنا تو سب ہی جانتے ہوں گے کہ ملا فیضی نے عربی زبان میں کامل تیس پاروں کی تفسیر ایسے الفاظ میں کی ہے جن میں ہر لفظ غیر منقوط ہے، یہ تفسیر مدت ہوئی چھپ چکی ہے اہل علم کی نظروں سے عموماً گذرتی رہتی ہے یوں تو ظاہر ہے کہ کلام اللہ کی تفسیر کا کام ابتداء اسلام سے اس وقت تک جاری ہے، اور ٹھیک جس طرح حق تعالیٰ کے کام کے مظاہر کے عجائب ختم نہیں ہوسکتے، اور ہر دن اس عالم کون کے نئے نئے ناموسِ فطرت کے نئے قانون کا علم بنی آدم کو ہو رہا ہے، باوجود اس کے طے شدہ ہے کہ جو کچھ جانا گیا ہے وہ اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو ابھی نہیں جانا گیا ہے، بجنسہٖ یہی حال اللہ کے کلام کا بھی ہے۔ سمجھنے والے سمجھ رہے ہیں، جلد ہا جلد میں اس کی تفسیریں لکھی ہیں

لیکن ہر قرآن پڑھنے والے کو کم از کم اس کا احساس تو ضرور ہوتا ہے کہ اس کتاب کو جتنا سمجھا گیا ہے اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو نہیں سمجھا گیا ہے، خواہ جو نہیں سمجھا گیا ہے وہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مشہور روایت

لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ وَلَا یَخْلَقُ عَلٰی کَثْرَۃِ الرَّدِّ — قرآن کے عجائبات ختم نہیں ہو سکتے اور بار بار دہرانے سے وہ پرانی نہیں ہو سکتی۔

میں قرآن کی اس لامحدودیت کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے، اپنے ایک رسالہ "کائنات روحانی" میں مدت ہوئی، بعض نقاط خیال کا اظہار کیا گیا تھا، خیر یہ ایک مستقل بحث ہے۔ اس وقت مجھے یہ کہنا ہے کہ مذہبی اور دینی حیثیت سے فیضی اور اس کے طرز عمل کے متعلق جو رائے بھی رکھی جائے، اور ملا عبد القادر نے جو حالات اس شخص کے بیان کیے ہیں، کون ایسا مسلمان ہے جو اس کے بعد بھی اپنے دل میں فیضی کے متعلق کوئی گنجائش پا سکتا ہے، لیکن میری گفتگو اس وقت صرف علمی اور ادبی حیثیت سے ہے، اور اسی لحاظ سے ملا فیضی کے اس کام کو ہندوستانی تعلیم کے نتائج میں کم از کم میرے نزدیک نمایاں مقام حاصل ہے، اس تفسیر کی ضخامت پچھتر جز ہے، اور یہ واقعہ ہے، مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر منقوطیت کے اس التزام کے باوجود ملا نے یہ کمال کیا ہے کہ عام تفسیروں میں قرآنی آیات کے متعلق عموماً جو کچھ لکھا جاتا ہے، اس شخص نے ان تمام امور کے سمیٹنے کی جہاں تک میرا خیال ہے، ایک کامیاب اور ایسی کوشش کی ہے جس کی نظیر اس سے پہلے مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ مولانا غلام علی آزاد نے بھی اپنے زمانہ تک اس کا دعویٰ کیا ہے۔

"کہ دریں ہزار سال پیشتر با ہیچ ستعدے	اس ہزار سال میں ہم سے پہلے کسی ستعدے
را میسر نہ شدہ"	بھی یہ کام میسر نہ ہوا۔

اور اس سے بھی طرفہ تر ماجرا یہ ہے کہ پچھتر جزوں کا یہ ضخیم مجموعہ کتنے دنوں میں تیار ہوا ہے، مولانا

لکھتے ہیں۔

"طرز ایں کہ ایں چنیں کار دشوار را | عجیب تر بات یہ ہے کہ اس قدر دشوار کام
دو سال از مبدء تا منتہیٰ رسانید" | ابتداء سے انتہا تک صرف دو سال میں پورا ہوا

ہندوستان کے نظام تعلیم کا دماغی ارتقاء پر کیا اثر پڑتا تھا، ملا فیضی کے ذاتی عقائد کچھ ہوں لیکن ان کی اس تفسیر کو تو اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے، بادو سال کی مختصر مدت میں ایسے عجیب و غریب کام کا پورا ہونا کیا کوئی معمولی بات ہے، رہ گئی یہ بات کہ آخر اس ادبی زور جس کا عملاً ظاہر ہے کہ ایک "تحریر قصیدہ" سے زیادہ کوئی نتیجہ نہیں ہے اس کے محرکات عقلی کیا ہیں؟

ابو الفضل اور سنسکرت

واللہ اعلم بالصواب، پہلی بات تو میری سمجھ میں یہی آتی ہے جس کا اظہار ابو الفضل نے آئین اکبری میں کیا ہے، ابو الفضل نے ایک مستقل باب اپنی اس کتاب "ہندوؤں کے علوم و فنون" کی تفصیل کے لیے مختص کیا ہے۔ اور اس کے ذیل میں اس نے سنسکرت زبان کی نحو و صرف، قرأۃ، بدیع، بلاغت وغیرہ وغیرہ مختلف علوم کا ذکر کیا ہے، وہیں لکھتے لکھتے آخر میں اس کے قلم سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل پڑے ہیں

"پیش ازاں کہ بدیں زبان (سنسکرت) | اس سے پہلے کہ اس زبان سنسکرت سے
سخنے آشنا شود" | جو تھوڑا بہت آشنا ہوا۔

یعنی سنسکرت زبان کا تھوڑا بہت علم میں نے جو حاصل کیا ہے اس سے پہلے

"چناں می دانست کہ ضابطہ لغت عرب بے ہمتا | ایسا سمجھتا تھا کہ لغت عرب کے قواعد
باشد" | بے مثال ہوتے ہیں۔

مگر جب سنسکرت زبان سے آگاہی حاصل ہوئی تو آپ فرماتے ہیں:

"اکنوں چناں پیدائی گرفت (ظاہر شد) | اب ایسا ظاہر ہوا کہ ہندی نثر اول برابر

کر ہندی نثر ادا نمایاں کوشش ہا   کوشش کر کے اس کام کو درست کر لیا

آورده انده کار را استوار ساختہ"   ۔

گویا عربی زبان جو عہد اکبری میں ہر قسم کی تحقیر و توہین کی مستحق قرار پا چکی تھی، اس کے مقابلہ میں ایک اور باضابطہ زبان کا سراغ لگایا گیا، گو ابوالفضل نے کھل کر تو اظہار نہیں کیا ہے لیکن انداز کا رجحان بتا رہا ہے کہ سنسکرت کو عربی کے مقابلہ میں فضیلت بخشی جا رہی ہے، ظاہر ہے کہ ہم جیسے لوگ جو سنسکرت زبان سے قطعاً نا آشنا ہیں، ابوالفضل کے اس دعوے کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں، لیکن جس خاندان سے اس دعوے کا جھنڈا بلند کیا گیا ہے، شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی گھر سے عربی زبان کے متعلق کم از کم علیم سرمایہ داری کا جو ثبوت فیضی کی اس تفسیر سے ملتا ہے، میں تو گونہ ابوالفضل کی اس تعریض کا اسے ایک قدرتی جواب سمجھتا ہوں،

عہد اکبری میں عربی الفاظ سے فارسی کی تطہیر

بلکہ عہد اکبری میں بھی "عربی الفاظ" سے فارسی زبان کی العیاذ باللہ تطہیر کی جو خفیہ تحریک اٹھی تھی، جس کے ثبوت میں علاوہ ملا عبدالقادر کے بیان کے خود ابوالفضل کی طرز تحریر کو پیش کیا جا سکتا ہے، اپنی پوری کتاب میں گویا قسم کھائے ہوئے ہے کہ سمتوں کے بیان میں مغرب اور مشرق کے عام الفاظ استعمال نہیں کرے گا بلکہ اس زمانہ میں ٹھیک جس طرح پچھم اور اتری وغیرہ کے الفاظ سے شائستہ کانوں کو مجروح کیا جا رہا ہے، ابوالفضل بھی مغرب کی جگہ باختر اور مشرق کی جگہ خاور کے الفاظ استعمال کرتا ہے، شمال اور جنوب کے متعلق فارسی میں جو الفاظ تھے، شاید وہ اتنے نسیاً منسیا ہو گئے کہ ابوالفضل کو غالباً لغتوں میں بھی اس کا پتہ نہ چلا، اس لیے مجبوراً شمال و جنوب کو استعمال کرتا ہے، انتہا یہ ہے کہ کسی ملک کی مشرقی حد کو "خاور رویہ" مغربی سرحد کو "باختر رویہ" کہنے سے کبھی نہیں تھکتا۔ "مرکز" کی جگہ "الترا ناتا" "بن گاہ" کی بھونڈی

نظام تعلیم و تربیت (۲)،

ترکیب شاید اسی کی تراشی ہوئی ہے، اور یہی حال اس کا دوسرے عربی الفاظ کے متعلق ہے، یقیناً اس تنگ نلی کا یہ ایک زندہ جواب ہے، کسی زبان کا سرمایہ اتنا وسیع ہو کہ وہ سارے معانی اور مطالب جو عربی تفسیروں کی ضخیم مجلدات میں بیان کیے گئے ہیں، غیر منقوط الفاظ میں ادا کر دیے جائیں، کیا یہ کوئی معمولی بات ہے، دوسری زبانوں میں اس قسم کے التزامات شاید چند سطروں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ گو اس کی تفسیر میں مطالب کے لحاظ سے کوئی جدت نہیں ہے، تاہم بہرحال وہ ایک غیر معمولی ذہن ودماغ کا آدمی تھا، بیچ بیچ میں بعض نکتے اس کے قلم سے بے ساختہ نکل پڑے ہیں، اگر ان کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو اچھی خاصی چیز ایسی جمع ہو سکتی ہے، جسے اس کی تفسیر کی معنوی خصوصیت بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

عہد اکبری کا ایک واقعہ

اس سلسلہ میں ایک اور قابلِ ذکر بات بھی ہے، مآثر الامراء میں اکبری عہد کے ایک عجیب واقعہ کا ذکر ہے، لکھا ہے کہ جس زمانہ میں اکبر کے دربار میں دنیا کے تمام مذاہب کے علماء اور پیشواؤں کو مدعو کر کے ان کے مذہب کی حقیقت کی تحقیق ہو رہی تھی، انہی دنوں میں پارسیوں کے ایک پیشوا جس کا نام آذر کیوان مجوسی تھا، اکبر نے پٹنہ[1] سے اسے طلب کیا، کیوان خود تو نہیں آیا، لیکن ایک کتاب لکھ کر اکبر کے پاس بھیجی جس کی خصوصیت مآثر الامراء میں یہ بیان کی گئی ہے،

"کیوان مجوسی کتابے بر چہار جزو بر در اکبر فرستاد، ہر سطرش پارسی بحت یعنی شدہ فارسی بحتی) وتصحیف آن عربی؛	کیوان مجوسی نے ایک کتاب چار جزو پر لکھ کر اکبر کے پاس بھیجی اس کی ہر سطر خالص فارسی تھی اور تصحیف کے بعد عربی ہو جاتی تھی

[1] یہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ مولانا شبلی نے اپنے مقالات میں ایک جگہ لکھا ہے۔ آذر کیوان ہندوستان آیا، عظیم آباد پٹنہ میں سکونت کی اور ۱۰۲۷ھ میں ۸۵ سال کی عمر پاکر مر گیا۔ [2] مجموعہ مقالات

وچوں قلب می کردند ترکی مے شد با آن ہندی"	اور جب اسے الٹ کر پڑھتے تھے تو ترکی ہو جاتی اور پھر اسکی تصحیف کے بعد وہ ہندی بن جاتی تھی۔

مطلب یہ ہے کہ اصل کتاب کو سیدھے سادے طور پہ اگر پڑھیے تو خالص فارسی جس میں عربی الفاظ کا میل نہ ہو، آپ کو نظر آئے گی، لیکن اسی عبارت کے الفاظ کی تصحیف کر دیجئے، یعنی نقطوں کو حذف کر کے ان ہی الفاظ کو ہم شکل الفاظ کی صورت میں پڑھیے تو بجائے فارسی کے آپ کو یہ کتاب عربی زبان کی کتاب معلوم ہو گی، پھر ان الفاظ کو الٹ دیجیے یعنی حروف کو الٹ کر الفاظ بنائیے جسے صنعت قلب کہتے ہیں، تو اب یہ ترکی زبان کی کتاب ہو جاتی ہے، ان مقلوبہ الفاظ کی اس کے بعد تصحیف کیجیے، یعنی وہی نقطوں کو ادل بدل کر کے ہم شکل الفاظ کی صورت میں پڑھیے تو اب یہی کتاب آپ کو ہندی زبان کی کتاب نظر آئے گی۔

کیوان کی کتاب کے متعلق ابوالفضل کا بیان

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیوان نے اپنی کتاب کی ان ہی خصوصیات کو اپنے مذہب کی صداقت کی دلیل قرار دیا تھا، کیونکہ مآثر الامراء میں اسی کے بعد یہ فقرہ بھی درج ہے۔

"شیخ ابوالفضل می گفت، ایں نامہ افصح از قرآن ست" مآثر ج ۲ ص ۳۸۶	ابوالفضل کہتا تھا یہ نامہ قرآن سے زیادہ فصیح ہے۔

اس ابوالجہل کے نزدیک اگر اسی نقطی کرتب کا نام فصاحت ہے تو آپ کی فضیلت کو کیا کہا جا سکتا ہے یہ نشیانہ بازیگری جس کا کسی زمانہ میں پرانے مکتبوں میں رواج تھا،

ف بدایونی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ایک عالم میاں الہ داد نامی رہتے تھے، فقہ، اصول فقہ میں بڑی دستگاہ تھی، ملا عبدالقادر ان سے لکھنؤ میں خود بھی ملے ہیں۔ انہوں نے ملا صاحب کو اپنی مصنفہ چند کتابیں دکھائیں جس میں ایک کتاب کی خصوصیت یہ تھی:۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اس شخص کو ملاحظہ فرمائیے، آپ اسے فصاحت قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد قرآن کی فصاحت پر اسے ترجیح دیتے ہیں :۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۳۵۵) رسالہ کہ از طول چہاردہ سطر واز عرض ہماں قدر سطور بجدول نوشتہ بودند واحکام ومسائل چہاردہ علوم ازیں استخراج می یافت" ص ۸۶
یعنی لکیریں کھینچ کر انہوں نے طول اور عرض دونوں میں چودہ چودہ سطریں ایسے الفاظ میں لکھی تھیں کہ ان سطروں کے ایک ایک خانہ سے طولاً و عرضاً چودہ علوم کے مسائل پیدا ہوتے تھے، ملا صاحب نے لکھا ہے کہ دو چیزوں میں ایک عجیب اور نادر چیز تو ان کے پاس یہ دیکھی، اور کوئی شبہ نہیں کہ لفظوں کے الٹ پھیر سے ایسی عبارت بنانا کہ ایک طرف سے پڑھیے تو ایک فن کا مسئلہ ہو، اور عرض کی طرف سے پڑھیے تو دوسرے فن کا یوں ہی ایک ایک خانہ کو چھوڑ کر پڑھتے چلے جائیے الگ الگ فن کے مسائل کی وہ عبارت بنتی چلی جائے گی، یہ عباراتی عجائب نگاری کا ایک دلچسپ کمال ہے، اور میرے خیال میں آذر کیوان کے کام سے کم حیرت انگیز نہیں ہے۔ دوسری چیز "قیطون" نامی ان کی ایک اور کتاب تھی کہا ہے کہ "مثل مقامات حریری ناشست" گر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں کیا کمال یا خاصیت تھی، البتہ ایک اور کتاب کا جو ذکر کیا ہے کہ وہ نحو میں تھی جس عبارت میں مسئلہ بیان کیا گیا تھا وہی عبارت مثال کا کام بھی دیتی تھی، لیکن جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ اس میں میاں الٰہ داد کو تفرد و تقدم حاصل نہیں ہے، آج ہندوستان میں نحو کا ایک "متن" اسی صنعت میں ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی لکھ چکے تھے جس کا نام ارشاد ہے وہ چھپ بھی چکا ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ وہی کتاب ارشاد ہو کیونکہ مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے متعلق ملا صاحب نے لکھا ہے کہ میاں الٰہ داد کے بنی اعمام کہتے تھے کہ "رسالہ چہاردہ علمی و قیطونی تصنیف حکیم زبر قی است کہ وہ جونپور آمدہ باقاضی شہاب الدین مشہور معارضہ نمودہ" کیا تعجب ہے کہ یہی حال نحو کے اس متن کا بھی ہو، ملا عبدالقادر کو اس کی خبر نہ ہو۔ علامہ فخر الدین شکیل پشاوری کے رسالہ عنوان الشرف میں اسی طرز سے فقہ، صرف، نحو، عروض چار فن لکھے گئے ہیں، ہندوستان سے باہر بھی یہ رسالہ طبع کیا گیا ہے۔

میرے پاس اس کا کوئی یقینی تصریحی ثبوت تو نہیں ہے، لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آذر کیوان کی اس کتاب کی نقلی "مناعیوں" لے اگر واقع میں ایسی کوئی کتاب اس لے لکھ کر بھی ہی تھی، اس زمانہ میں کچھ خاص اہمیت حاصل کی شاید فیضی کی اگر دینی نہیں تو نسلی اور علمی حمیت کی رگ پھڑک اٹھی، اور اسی کتاب کے مقابلہ میں ایک دوسری نقلی صنعت کا التزام کرکے اس نے یہ تفسیر لکھی، اب خواہ یہ واقعہ ہو یا نہ ہو، اور فیضی کے سامنے آذر کیوان کی کتاب کا مقابلہ ہو یا نہ ہو لیکن میں تو اس کو بھی قرآن کی طرف سے ایک غیبی جواب سمجھوں گا کہ اصل قرآن کا مقابلہ تو خیر کوئی کیا کرسکتا ہے جس طرح خدا کے بنائے ہوئے کسی پتہ کا بھی جواب ہو بہو جیسا کہ وہ ہے آسمان وزمین کی کوئی طاقت پیش نہیں کرسکتی، یہی چیز قدرتی اور مصنوعی امور میں فرق پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے قرآن کے قدرتی ہونے کی دلیل میں متعدد جگہ اسی چیز کو پیش کیا گیا ہے کہ آدمی اس جیسا کلام نہیں بنا سکتا۔ مگر فیضی کے کام نے یہ ثابت کردیا کہ آذر کیوان کی کتاب کا مقابلہ قرآن کی ایک

لہ چند سال ہوئے کہ مسٹر ظریف نامی ایک صاحب نے اسلام اور مذہب کے خلاف میں ایک سخت کتاب لکھی تھی، جس کے متعلق ہنگامہ بھی سخت ہوا تھا، مولانا عبدالباری ندوی فرماتے تھے کہ مسٹر ظریف کشمیر میں تھے میں بھی وہیں تھا، کانپور کی مسجد مچھلی بازار والی کا قضیہ اسی زمانہ میں پیش آیا تھا۔ میں نے مسٹر ظریف کو دیکھا کہ جو لوگ اس مسجد کے سلسلہ میں شہید ہوئے تھے، ان سے ہمدردی کرتے ہوئے، حکومت کے خلاف سخت طعن کررہے ہیں، میں نے کہا کہ آپ کو جب اسلام ہی سے انکار ہے تو مسلمانوں سے ہمدردی کے کیا معنی؟ بولے کہ واہ تو کیا میں قومی حیثیت سے بھی مسلمان نہیں ہوں، مذہبی حیثیت سے مجھے ہمدردی نہ ہو، لیکن قومی حیثیت سے تو میرا تعلق مسلمانوں سے بھی ہے، اور مسجد سے بھی۔

تفسیر سے کیا جا سکتا ہے، جو معمولی آدمی کی لکھی ہوئی ہے، آخر آذر کیوان کی کتاب کی اس سے زیادہ تو کوئی خصوصیت نہیں کہ انشاءیا کتابت کی چند صفتوں کے التزام کے ساتھ چار جزو کا ایک رسالہ اُس نے لکھ دیا۔ یہی اسی قسم کی انشائی صنعت میں چار جزو کی تفسیر تیار ہے۔

فیضی کی تفسیر غیر ملکوں میں

فیضی کی تفسیر سواطع الالہام کے متعلق ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے، جیسا کہ میں نے کہیں ذکر بھی کیا ہے کہ اس تفسیر کے چند اجزاء بطور نمونے کے فیضی نے اسلامی ممالک میں بھی روانہ کئے تھے، اگرچہ ملا عبدالقادر نے رفیعی شاعر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اکبر اور دوسرے امراء سے انعام واکرام لے کر رفیعی جب اپنے وطن کاشان واپس جا رہا تھا، اور فیضی نے اس کے ساتھ

چند جزو از تفسیرے نقطہ بر تو تیعات (تو تریلات)، افاضل و دیوان بولایت برائے شہرت فرستادہ بود" (ایران وخراسان،	بے نقط تفسیر کے چند اجزاء شاہی مہروں کے ساتھ ایران وخراسان شہرت کے لئے بھیجے تھے۔

لیکن خدا جانے کیا نحوست پیش آئی ملا صاحب لکھتے ہیں کہ جہاز پر سوار ہو کر رفیعی جب ایران جا رہا تھا تو:۔

"چون از ہرمز (جزیرہ) گذشت نزدیک بہ کچ و مکران رسید کشتی او بہ تباہی انشد ہر چہ داشت بہ تاراج رفت" ص ۲۳۲	جب وہ جزیرہ ہرمز سے گذر کر کچ اور مکران کے نزدیک پہونچا اس کی کشتی تباہی کے لپیٹ میں آئی اور جو کچھ اس کے پاس تھا برباد ہو گیا،

اور اسی ہر چہ داشت میں فیضی بیچارے کا سرمایۂ شہرت بھی شاید بھی دریا برد ہو گیا، مگر ملا صاحب ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فیضی نے اپنی کتابوں کی نقل کے لیے ایک سر رشتہ قائم کر رکھا تھا۔

" زہائے جاگیر صرف کتابت و تذہیب تصانیف	جاگیر کے بعض حصے اپنی تصانیف مطلّا و مذہب

خودساختہ" ج ۲ ص ۲۰۵) کرنے پر صرف کرتا۔

ایک ایک کتاب کے کتنے نسخے فیضی نے تیار کرائے تھے اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد جب اس کا کتب خانہ شاہی خزانہ میں منتقل ہو رہا تھا، تو ملا صاحب نے لکھا ہے

"از وصد و یک کتاب نل دمن بود ۳۰۶ ہاں — ان کتابوں میں ایک سو ایک نسخے کتاب نل دمن کے تھے"

یعنی صرف مثنوی نل دمن کے ایک سو ایک نسخے تو وہ تھے، جو تقسیم و اشاعت کے بعد کتب خانے میں بچ گئے تھے، ایسی صورت میں کیا تعجب ہے کہ فیضی کے ساتھ جو نسخہ تفسیر کا بھیجا گیا تھا وہ ڈوب گیا ہو، مگر اور ذرائع سے جو نسخے اسلامی ممالک میں بھیجے گئے تھے وہ وہاں پہنچ گئے ہوں، اگرچہ اس تفسیر کا ذکر باہر کے علماء کی کتابوں میں ہم نہیں پاتے مگر جس کی ایک ایک کتاب کے سَو سَو نسخے بانٹنے اور تقسیم کرنے کے بعد باقی بچ جاتے ہوں اور جو اپنی جاگیر کی آمدنی کا بیش قرار حصہ صرف اپنی کتابوں کی کتابت و زیبائش پر خرچ کرتا ہو، اس کے متعلق یہ کیوں سمجھا جائے کہ اگر ایک نقل اس کی ڈوب گئی تو دوسری نقلیں اس کی کتابوں کی اسلامی ممالک میں نہ پہنچی ہوں گی۔

قسطنطنیہ کے ایک مصنف کی بے نقط تفسیر

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کچھ دن ہوئے قسطنطنیہ سے ایک تفسیر "دُرر الاسرار" نامی چھپ کر آئی ہے، مصنف اس کے سید محمود آفندی ہیں۔ دمشق کے رہنے والے ہیں، انہی اس تفسیر میں محمود آفندی نے بھی اسی صنعت اہمال کا التزام کیا ہے، یعنی پوری تفسیر غیر منقوط ہے، سلطان عبدالمجید خان خلیفۃ المسلمین مرحوم کے نام یہ کتاب معنون ہے، سنہ تالیف ۱۲۲۴ھ ہے یعنی سو سال سے کچھ ہی زیادہ زمانہ گذرا ہے۔

ظاہر ہے کہ فیضی کی تفسیر کے دو سو سال بعد یہ کتاب لکھی گئی ہے، چونکہ فیضی سے پہلے اس صنعت میں تفسیر لکھنے کا جہاں تک میں جانتا ہوں رواج نہ تھا[1]۔

(1) حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

کیا ایسی صورت میں اگر یہ خیال کیا جائے کہ شام کے ایک عالم کے دل میں اس تفسیر کے لکھنے کا ارادہ ہندوستان کے ایک مُلّا کے کام کو دیکھ کر پیدا ہوا تو کوئی دور از قیاس بات ہو سکتی ہے؟ میں نے فیضی کی تفسیر کے بعض مقامات کا مقابلہ محمود آفندی کی تفسیر سے کیا ہے، شاید دوسروں کو مجھ سے اختلاف ہو، لیکن اس مقابلہ سے مجھ پر تو یہی ظاہر ہوا کہ عموماً اظہار مطالب میں الفاظ کے ان ہی ذخیروں سے محمود آفندی نے بھی کام لیا ہے، جن سے فیضی پہلے کام لے چکا تھا۔ فرق دونوں میں اگر کچھ نظر آیا تو صرف اجمال اور تفصیل کا، فیضی نے جس مطلب کو دس سطروں میں مثلاً ادا کیا ہے، محمود آفندی نے اسی خیال کو مثلاً دو تین سطروں میں سمیٹ لیا ہے، اور اسی چیز نے دونوں کتابوں میں فرق پیدا کر دیا ہے، ورنہ اگر محمود آفندی بھی اسی تفصیل سے کام لیتے تو دونوں کتابوں میں اس وقت شاید امتیاز مشکل ہو جاتا،

جن لوگوں کو بایزید یلدرم عثمانی ترکی بادشاہ اور تیمور کے تعلقات کا علم ہے، اور جو عثمانی خانوادۂ شاہی اور تیموری خاندان کی موروثی چشمکوں اور رقابتوں سے واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ تیموری دربار کے ایک مُلّا کے کام کا جواب "اخوندِ روم"[1] کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۹ کا ملہ) مفتی عنایت احمد نے چالیس فن کے ایک ایک مسئلہ کا انتخاب کیا تھا اور ہر ایک مسئلہ پر چالیس ورق لکھنے کا قصد اس صفت کے ساتھ کہ مسئلہ بھی بے نقط ہو اور اس پر پوری بحث بھی شگفتہ عبارت میں اسی التزام سے کی جائے تفسیر میں وعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ کلھا کی تفسیر اور حدیث میں کل مسکر حرام رواہ مسلم منتخب فرمائی تھی بڑا حصہ مکمل ہو چکا تھا۔ سفر حج میں مسودہ مصنف کے ساتھ سمندر کے سپرد ہو گیا۔

[1] حاشیہ صفحہ ہذا۔ مغل سلاطین، سلاطین ترک کو "اخوند روم" ہی کے لفظ سے یاد کرتے تھے اکبر نے اپنے امیر پر الزام بھی لگایا تھا کہ اندرونی طور پر اخوند روم سے تعلق پیدا کرنا چاہتا ہے، مجدد الف ثانی کے مقالہ میں خاکسار نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

دربار کے عالم کی طرف سے اگر دیا جائے تو یہ چنداں محلِ تعجب نہیں ہو سکتا۔

ہندوستانی علماء کی فضیلت

بہر حال سید محمود آفندی کی بے نقط تفسیر درر الاسرار کے باوجود پھر بھی اس قسم کی تفسیر کی اولیت کا سہرا ہندوستانی نظامِ تعلیم کے سر سے اتارا نہیں جا سکتا، بلکہ اگر واقعہ یہی ہے کہ بایزید یلدرم کے وارثوں نے تیمور کے وارثوں کو اس طریقہ سے خاموش جواب دیا ہے تو یہ بات کہ فیضی کے کارنامے کے ساتھ بیرونِ ہند کے اسلامی ممالک نے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا، درست نہیں رہتا۔

خیر فیضی کی تفسیر سواطع تو گو ایک فنکارانہ کمال کا اظہار ہے، گو ضمناً اس ذریعہ سے اس زبان کی عجیب و غریب حیرت انگیز سرمایہ داری کا بھی ایک زندہ ثبوت مہیا ہو جاتا ہے، جس میں خدا کا آخری پیغام کرۂ زمین کی ساری نسلوں اور قوموں کے لیے نازل کیا گیا، اور رہتی دنیا تک اسی کو کافی ووافی قرار دیا گیا۔

ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی کی تصنیف

اسی سلسلہ میں ہندوستانی نظامِ تعلیم کے ایک اور نتیجہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا، میں نہیں جانتا کہ دنیا کے کسی ملک، اسلامی ہو یا غیر اسلامی، اور ان ممالک کی کسی زبان میں کسی دینی یا دنیوی علم یا فن کے مسائل کو اس طریقہ کے التزام کے ساتھ ادا کیا گیا ہو، کہ فن کا ہر مسئلہ خود ہی اس مسئلہ کی مثال بھی ہو[1]۔

---

[1] حال میں ایک مضمون مولانا ابو الاسرار رمزی کے قلم سے مجلہ "ندائے حرم" میں شائع ہو رہا ہے، میں مولانا سے شخصاً واقف نہیں ہوں، لیکن ادھر چند دنوں سے انہوں نے اپنی شہرت کا استعمال جس پاک مقصد کے لیے شروع کیا ہے، اس کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، انشاء اللہ مستقبل ان سے مستفید ہوگا، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ کہنا یہ ہے کہ ندائے حرم کے اسی مضمون میں "گرام آف لنگویج" نامی کتاب جو کسی نعمان کی ہے، آپ نے ایک بڑا اچھا فقرہ نقل فرمایا ہے "درحقیقت انسانی زبانوں میں عربی زبان سب سے زیادہ قابلِ استعمال اور مالدار زبان ہے" اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ جملہ اور دلائل کے عربی زبان کی مالداری کا ایک ثبوت ہندوستانی نظامِ تعلیم کا ایک نمایاں ثمرہ فیضی کی تفسیر بھی ہے، جو تیرہ جزوں کی کتاب میں سارے جہان کی تفسیری معلومات کا غیر منقوط الفاظ میں ادا کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے ۱۲۔

لیکن عوام تو خیر کیا واقف ہو سکتے ہیں شرح "ملا جامی" کے پڑھنے والے طلبہ کہیں کہیں اسی کتاب میں کافیہ کی شرح ہندی کا تذکرہ پاتے ہیں، اسی شرح ہندی کے مصنف ملک العلماء[۱] شہاب الدین دولت آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب الارشاد نامی علم نحو میں لکھی تھی، عجب کتاب، مولانا آزاد ارقام فرماتے ہیں۔

"ارشاد متن در علم نحو کہ تمثیل مسئلہ در ضمن تعبیر التزام کردہ و طرزے تازہ بروئے کار آوردہ" مآثر، ص ۱۸۹	علم نحو میں ارشاد نامی کتاب جس میں مسئلہ کے ضمن میں تمثیل کا التزام کیا گیا ہے اور جدید طرز سامنے لایا گیا ہے۔

یہ کتاب چھپ چکی ہے، لیکن اب نایاب ہے، غالباً کسی زمانہ میں درسی نصاب میں شریک تھی، محدث دہلوی نے اپنے حالات میں لکھا ہے اور اپنے تعلیمی نصاب کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے۔

"از مختصرات نحو مثل کافیہ و لب و ارشاد" اخبار، ص ۱۶۱	مختصر کتابوں سے جیسے کافیہ اور لب اور ارشاد وغیرہ

اغلب یہی ہے کہ ارشاد سے مراد ملک العلماء کا یہی "متن عجیب" ہے۔

۱؎ ملک العلماء کا خطاب ان کو جونپور کی حکومت شرقیہ کی طرف سے ملا تھا، دلی میں پیدا ہوئے تھے، مولانا آزاد نے لکھا "تولد او در دولت آباد دہلی ست" معلوم ہوتا ہے دلی میں دولت آباد نامی کوئی محلہ تھا، ملک العلماء مولانا خواجگی دہلوی کے شاگرد ہیں جو چراغ دہلوی کے اجلہ خلفاء میں تھے، کہتے ہیں کہ مولانا خواجگی نے قاضی شہاب الدین کے متعلق طالب العلمی کے زمانہ میں فرمایا تھا "بیشتر من طالب العلمے آمد کہ پوست او علم و مغز او علم و استخوان او علم ست" یہ تھی اس زمانہ کی سند اور اس عہد کا ڈپلوما جو اساتذہ اپنے خاص خاص طلبہ کو دیا کرتے تھے، فیروز تغلق کے بعد دلی کے تخت پر عموماً نالائق جانشینوں کا قبضہ ہو گیا اور ملک کا سیاسی نظام درہم برہم ہو گیا، تیمور نے موقع کو خالی پا کر حملہ کر دیا، کہتے ہیں کہ اس حملہ کی اطلاع حضرت سید محمد حسینی ربانی گیسو ہے

کافیہ کی شرح تصوف کے رنگ میں

اس زمانہ کے علمی ماحول کی ایک اور نادر دلچسپ چیز جسے لوگوں نے شاید کم کیا، کچھ اہمیت نہ دی، وہ اس ملک کے ایک نہیں بلکہ متعدد اہل علم کا ایک عجب کارنامہ ہے۔

شاید لوگوں تک یہ بات پہنچی ہوگی کہ ابن حاجب کی کافیہ سے ہندوستانی مولویوں نے اپنی عقیدت اس حد تک بڑھادی تھی کہ بجائے علم نحو کے انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کافیہ نحو نہیں، بلکہ تصوف اور حقائق کی کتاب ہے[1]۔ صرف دعویٰ نہیں بلکہ عملاً کافیہ کے الفاظ کی شرح اسی طریقہ سے کی گئی ہے، مولانا آزاد نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) گیسو دراز صاحب گلبرگہ قبل از قبل سے پہنچے تھے جو دلی چھوڑ کر بہمنیوں کی حکومت میں جو دکن میں قائم تھی چلے آئے، کچھ لوگ جونپور کی حکومت کی طرف چلے گئے، قاضی شہاب الدین جونپور جانے والوں میں تھے۔ وہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی، قضاء کا عہدہ سپرد ہوا اور ملک العلماء کا خطاب ملا، عربی زبان میں مختلف کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی زندگی ہی میں جیسا کہ محدث دہلوی نے لکھا ہے "دحیات ایشاں مشہور عالم گشتہ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کی اشاعت کا اس زمانہ میں کیسا نظم تھا، جونپور میں کتاب لکھی جاتی ہے، اور ترکستان میں جامی اس پر تنقید کرتے ہیں ان کی ایک تفسیر بحر مواج فارسی میں ہے نظر سے گذری ہے بعضوں کا خیال ہے کہ شرح ملا جامی دراصل دولت آبادی کی شرح کا ایک نسخہ ہے لیکن میں نے خود ہندی کی شرح نہیں دیکھی ہے اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا ۱۲۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] کتابوں کے ساتھ عقیدتمندی کبھی حد سے گذر جاتی ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مفتاح السعادۃ میں لکھا ہے: کان الشیخ الدلوۃ المعروف بابن الی طالب منقول زعم بعضہم ان المقامات وکتاب کلیلہ ودمنہ رموز الی الکیمیا" یعنی مقامات حریری اور کلیلہ دمنہ دراصل کیمیا کی کتابیں ہیں۔ گلستاں کے متعلق بھی بعضوں کا یہی خیال ہے۔

صاحب سبع سنابل میر عبدالواحد بلگرامی کے تذکرہ میں لکھا ہے،

" از نوادر تصانیف او رشرح کافیہ ابن حاجب	ان کی نادر تصانیف میں کافیہ ابن حاجب
است بطور حقائق (یعنی تصوف) تا بحث	کی شرح ہے جو تصوف کے طور پر لکھی گئی ہے
غیر منصرف "	یہ غیر منصرف کی بحث تک ہے۔

یعنی غیر منصرف کی بحث تک کافیہ کے جتنے مسائل ہیں سب کو بجائے نحو کے معارف وحقائق کی تعبیر قرار دے کر میر صاحب نے اسی التزام کے ساتھ اس کی شرح لکھ بھی ڈالی، اور کچھ میر صاحب ہی اس کام میں متفرد نہیں ہیں، مولانا آزاد ہی لکھتے ہیں۔

" مخفی نماند کہ دو شرح بعبارت عربی وفارسی	پوشیدہ نہ ہے کہ دو شرحیں عربی اور فارسی
تا بحث غیر منصرف بطور حقائق در نظر	میں غیر منصرف کی بحث تک تصوف کے رنگ میں اختر
فقیر آمدہ "	کی نظر سے گذری ہیں

پھر ان دونوں شرحوں، عربی وفارسی کے متعلق لکھتے ہیں۔

" نام شارح اول میر ابو البقا است ظاہر	پہلے شرح کرنے والے کا نام میر ابو البقا ہے
معاصر میر باشد و نام شارح فارسی	جو بظاہر میر کے ہمعصر ہیں اور فارسی میں شرح
ملا موہن بہاری ست کہ از میتا خرست "	کرنے والے کا نام ملا موہن بہاری ہے جو میر کچھ
آخر ، ص ۳۲	کے ہیں۔

میر ابو البقا اور ملا موہن

میر ابو البقاء کا حال تو معلوم نہیں کہ یہ کون صاحب ہیں، لیکن اتنا یقینی ہے کہ ہندوستان ہی کے رہنے والے ہیں، اور ملا موہن بہاری[1] کا ذکر تو پہلے بھی آچکا ہے کہ حضرت اورنگزیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ کے یہی استاد تھے۔

[1] کچھ عجیب بات ہے کہ بہار باوجودیکہ دار السلطنت سے کافی فاصلہ رکھتا تھا لیکن عموماً بادشاہی خاندان کے اساتذہ میں ہم بہار کے علماء کو پاتے ہیں، عالم گیر کے بعد شاہ عالم بادشاہ عالی گوہر کے استاذ مولوی شرف الدین صاحب کے متعلق تذکرہ صبح گلشن میں لکھا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

قرآن کی تفسیر سیاسی رنگ میں | اپنی طالب العلمی کے دنوں میں کافیہ کی ان صوفیانہ شرحوں کا ذکر جب میں سنتا تھا، تو قدرتی طور پر جیسا کہ چاہیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) " متوطن فرید پور کہ بہ فاصلہ شانزدہ کروہ از عظیم آباد ست وایں مولوی سراج الدین احمد شاہ عالم عالمگیر بادشاہ دہلی را استاد بود"

زیب النساء کے استاد ملا سعید کے متعلق بھی مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ مونگیر میں مدفون ہیں، مآثر الامراء میں ہے کہ سید محمد جونپوری مدعی مہدویت کے خلفاء کا مقدمہ جب حکومت دہلی کے سامنے پیش ہوا تو فیصلہ کے لیے ملا بدہ حقانی بہاری کے پاس مقدمہ بھیجا گیا، واللہ اعلم کیا بات تھی خود سید محمد جونپوری کو لوگ جونپور کا بتاتے ہیں لیکن ان کے واقعات و حالات میں دانا پور کا ذکر بکثرت کیا جاتا ہے جونپور کا گویا ایک محلہ ہے، ان کے تذکروں میں لکھا ہے کہ دعوئے مہدویت سے پہلے اسد العلماء کا خطاب ان کو دانا پور کے علماء نے دیا تھا، خود سید صاحب کے صاحبزادے سید محمود جن کی قبر گجرات میں ہے سارا گجرات "بھاری پیر" کے نام سے یاد کرتا ہے، یہی چیز شک میں ڈالتی ہے کہ مہدویوں کا مقدمہ ملا بدہ حقانی کے پاس بہار کیا اسی تعلق سے بھیجا گیا کہ سید محمد صاحب کا حقیقی وطن بہار ہی تھا، شرقیوں کی حکومت جب جونپور میں قائم تھی تو مقبوضہ رقبہ کے تمام باشندوں کو لوگ جونپوری کی طرف منسوب کردیتے تھے، صاحب شمس بازغہ ملا محمود جونپوری کے نام سے مشہور رہے۔ حالانکہ ان کا اصلی وطن دلیہ پور ضلع اعظم گڈھ تھا، ہو سکتا ہے کہ سید محمد کو اسی بنیاد پر بجائے بہار کے جونپور کی طرف منسوب کردیا گیا ہو، ملا الہداد ہدایہ اور بزدوی کے مشہور شارح و محشی بھی عموماً الجونپوری کی نسبت سے مشہور رہے لیکن ملا جیون نے اپنی تفسیرات احمدیہ کے دیباچہ میں غالباً ان ہی کو الشیخ الہداد البہاری کی نسبت سے ذکر کیا ہے، دیباچہ تفسیرات احمدیہ ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ سید محمد جونپوری کے والد کا نام بھی بدہ بتایا جاتا ہے، مغلوں کی زمانہ میں بہار میں ملا بدہ نامی ایک مشہور عالم گذرے ہیں، یعنی شیخ محدث نے لکھا ہے کہ وہ فصوص الحکم اور وحدت الوجود، صوفیانہ خیالات کے سخت مخالف تھے، اور یہ وہی ملا بدہ ہیں جن کی عبد تہلل شیر شاہ سوری اپنے ہاتھ سے ملا صاحب کے سامنے سیدھی کیا کرتا تھا۔

(دیکھیے اخبار الاخیار ذکر شیخ حسن طاہر ص ۱۹۵)

یہ کچھ عجیب بے معنی سی بات معلوم ہوئی، اس وقت بجز ایک لاحاصل کام کے اس کا کوئی مطلب سمجھ ہی نہیں آیا، اور میں خیال کرتا ہوں کہ جو بھی سنے گا حیرت کے ساتھ اس کا بھی یہی خیال ہوگا کہ بیٹھے بٹھائے ان لوگوں کو یہ کیا سوجھی؟ مگر دنیا کی کوئی چیز بے کار نہیں ہوتی، اس کا تجربہ مجھے شرح کے اسی طریقہ کے متعلق اس وقت ہوا جب مدت ہوئی دارالعلوم دیوبند کے قیام کے زمانہ میں دہلی آنا ہوا یہاں اس زمانہ میں قرآن کی تعلیم کا ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا، اس ادارہ کے بعض طلبہ سے ملاقات ہوئی، گفتگو کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ اس ادارہ میں قرآن مجید کو سیاسی نقطۂ نظر سے پڑھایا جاتا ہے، صاحب تفسیر یورپ کے موجودہ پارلیمانی نظام، ووٹنگ، حزب الاختلاف، ریزولیشن وغیرہ وغیرہ ساری باتیں قرآن سے ثابت کرتے ہیں، جوں ہی کہ یہ بات میں نے سنی معاً میرا خیال کافیہ کی اس صوفیانہ شرح کی طرف منتقل ہوگیا میں نے خود تو ان شروح کو دیکھا نہیں تھا لیکن جن صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی، ان سے میں نے عرض کیا کہ اگر الفاظ سے معانی پیدا کرنے میں اتنی آزادی برتی جائے گی تو بقول اکبر مرحوم

"مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے"

کافیہ کی شرح کا ایک طرز

ہر مدعا جو بھی پیش کیا جائے اپنی تفسیر کے زور سے اس مدعا کو قرآن سے نکال کر دکھایا جانے لگے، تو لیجیے میں آپ کے سامنے دعویٰ کرتا ہوں کہ کافیہ نحو کی نہیں بلکہ "النبوات" کی کتاب ہے، میں نے معاً اسی کے ساتھ مطلب برآری کا کام شروع کردیا بات تو لمبی تھی، لیکن کافیہ کے ابتدائی فقروں کا جو مطلب میں نے عرض کیا تھا، وہ غالباً یہ تھا "الکلمۃ" سے مراد النبی ہے، عقلاً تو اس لیے کہ کلمہ بھی ایک پوشیدہ مافی الضمیر حقیقت کو ظاہر کرتا ہے، یوں ہی حق تعالیٰ کی غیبی حقیقت کی ترجمانی نبی کرتے ہیں، اور نقلاً اس کی تائید قرآن ہی سے ہوتی ہے کہ مسیح علیہ السلام جو اللہ کے نبی تھے، ان کو کلمۃ منہ کہا گیا ہے قرآن میں لاغلبن انا ورسلی بھی ہے

اور ان کلمۃ اللہ ھی العلیا، بھی معلوم ہوا کہ کلمۃ اللہ سے یہاں رسل ہی مراد ہیں، جن کو غلبہ عطا کیا جاتا ہے، آگے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ عالم علوی سے طرف عالم سفلی کے نبی ملفوظ ہوتے ہیں یعنی پھینکے جاتے ہیں، ان کی حقیقی غرض چونکہ "مالکم من الٰہ غیرہ" اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے کی دعوت ہی ہوتی ہے، اس لیے۔ وضع لمعنی مفرد، بنایا گیا ایک مفرد معنی کے لیے، یعنی کلمۂ توحید اور معبود کی انفرادیت کا اعلان یہی نبی کا منصب حقیقی ہے جس کے لیے وہ بنائے جاتے ہیں، یوں ہی میں لے کہا کہ ایک قسم انبیاء کی تو وہ ہوتی ہے جن کی نبوت زماں و مکان کے قیود سے آزاد ہوتی ہے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوتِ عامہ ہے، سمو اور بلندی کی وجہ سے ان کو اسم کہہ سکتے ہیں، بعضوں کی نبوت کا تعلق کسی خاص قرن اور زمانہ کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے جیسے انبیاء سابقین اور بعض پیغمبر ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی نبوت کسی دوسرے نبی کی نبوت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی، جیسے حضرت ہارون کی نبوت کا تعلق موسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے ہے پس یوں فعل حرف اور اسم تینوں قسمیں النبی یعنی الکلمہ کی پیدا ہو جاتی ہیں، الیٰ غیر ذلک من الخرافات۔ وہ صاحب میرا منہ تکنے لگے میں نے عرض کیا کہ یہ کوئی بڑی ذہانت کی بات نہیں ہے اور نہ یہ تفسیر ہے، بلکہ تحریف ہے تغیر ہے۔[1]

---

[1] خیال آتا ہے کہ میں نے ان ہی صاحب سے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اگر کسی کلام میں مطلب کو یوں ہی باہر سے داخل کیا جا سکتا ہے، تو پھر داغ مرحوم کا سب سے اخش ترین شعر

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک — مٹی کی بھی ملے تو برا ہے شباب میں

کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں تیمم کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے یعنی حور، حورا کی جمع ہے حورا حواری سے مناسبت رکھتا ہے، حواری ماہی گیر تھے، ماہی گیروں کو پانی سے لزومی تعلق ہوتا ہے، پس لازم بول کر ملزوم مراد لیا گیا، یعنی پانی کا حشر تک سے، مراد ہے کہ آفتاب اتنا جھک جائے کہ نیزہ سوا نیزہ کے قریب آ جائے عصر کا وقت جب اتنا تنگ ہو جائے تو پانی کے انتظار کی ضرورت نہیں بلکہ شباب یعنی وقت کے جز کا وقت جب ہو، جوانی کی فرصتاں نقرا۔ رہا ہو تو مٹی پر ہاتھ مار کر تیمم کر لینا چاہیے ۱۲۔

واقعہ یہ ہے اللہ مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ کافیہ کی صوفیانہ شرح کی گوش زدہ بات ہی اس دن مجھے کام آگئی، اس وقت سے علماء ہند کے عجیب و غریب طول عمل کی بے حاصلی کا جو خیال تھا وہ بدل گیا۔

ہندوستانی علماء کی ذہانت

دل سوچنے لگا کہ ہندوستان کے علماء کو کسی کتاب کی ایسی شرح کا جس سے دور کا بھی تعلق نہ ہو آخر سوجھی تو کیوں سوجھی بیرون ہند کے علمی حلقوں میں اس نوعیت کی شروح کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا کہ سمجھا جاتا، تقلیداً ایسا کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ تو سراسر ان کا اجتہادی اور ابتدائی طریقہ ہے جس کا کوئی نمونہ کم از کم میرے علم کی حد تک اس سے پہلے اسلامی ادبیات میں نہیں ملتا، اسی کے ساتھ اس کا بھی خیال آتا تھا کہ میر ابوالبقاء کے سوا جن کی حقیقت کا صحیح علم اب تک حاصل نہ ہو سکا کوئی ہو سکتا ہے؛

میر عبدالواحد کی سبع سنابل

باقی دو صاحب۔ یعنی میر عبدالواحد بلگرامی کا شمار تو اپنے عہد کے ممتاز اور سربرآوردہ بزرگوں میں ہے، ایک مدت تک ان کی کتاب سبع سنابل علم و معرفت کے اونچے حلقوں میں خاص قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، مولانا آزاد نے براہ راست شاہ کلیم اللہ جہان آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ایک واقعہ[1] نقل کرنے کے بعد یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ:

---

[1] خلاصہ اس قصہ کا یہ ہے کہ شاہ کلیم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو مدینہ منورہ میں خواب کے اندر ذات ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ اس مجلس میں ایک شخص کو دیکھا کہ "حضرت باو لب تبسم شریں کردہ بروے نہانی زمند و التفات تمام دارند مو بحث سے معلوم ہوا کہ یہ میر عبدالواحد بلگرامی ہیں کتاب سبع سنابل ان کی مقبول ہوئی ہے، میر صاحب کی عمر سو سال سے متجاوز تھی، کہتے ہیں کہ یکے از کبار جبینان بدوست حضرت سیر دولت اسلام مشرف اند وزشد" ماثر۔ ص ۳۱۔

سنابل تصنیف اور در جناب حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم "مقبول افتاد" ص ۳۰ | ان کی تصنیف "سنابل" کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

اکبر جیسا بدعقیدہ آدمی بھی میر صاحب سے متاثر ہوتا تھا، پانسو بیگہ زمین بطور جاگیر بلگرام میں میر صاحب کو اکبر ہی نے عطا کی تھی۔

ملا موہن بہاری | اور ملا موہن بہاری کی عظمت وجلالت کے لیے یہی کافی ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت نے ہندی اسلام کو وہ فرزند سعید عطا کیا جس کا نام محی الملۃ والدین اورنگ زیب عالمگیرؒ ہے، آج اس ملک میں مسلمانوں کا وجود مختلف وجوہ سے اسی کی حمیت دینی، اور حق پژوہی کا رہین منت ہے۔[1]

پھر کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ ان فاضلوں کا واقعی یہ خیال تھا کہ ابن حاجب نے کافیہ میں بجائے نحوی مسائل کے صوفیانہ حقائق ومعارف بیان کیے ہیں ؟ اگر یہ بات نہ تھی، بلکہ انہوں نے اپنی طرف سے کافیہ کے الفاظ میں صوفیانہ خیالات کے بھرنے کی کوشش کی تھی تو سوچنے کی بات ہے کہ اسکا حاصل کیا ہو سکتا ہے، ان بزرگوں کو حقائق ومعارف ہی کے مسائل بیان کرنے تھے تو اسے کافیہ کی شرح بنائے بغیر یوں بھی لکھ سکتے تھے، یا کم از کم تصوف کی بیسیوں کتابیں سیکڑوں متون مل سکتے تھے، ان ہی کو بہانہ بنا کر دل کا ارمان نکالتے یہ بے جوڑ انمیل رشتہ کافیہ اور تصوف میں قائم کرنے کی کیا حاجت تھی ؟

واللہ اعلم کوئی تصریحی شہادت تو اس باب میں مجھے نہیں ملی ہے، لیکن دلی کا جو قصہ میں نے سنایا، اسی قصہ کی بنیاد پر میرا ذہن ادھر جاتا ہے کہ شاید ان بزرگوں پر بھی

---

[1] یہ واقعہ ہے کہ اکبر اور دارا شکوہ کے ذریعہ سے اسلام کا حشر قریب تھا کہ اس برہمن کدہ میں وہی ہو جاتا جو بدھ مت کے ساتھ حادثہ پیش آیا، لیکن حضرت مجدد کی روحانی اور اورنگ زیب کی سیاسی قوت نے اس قیامت کو برپا ہونے سے روک دیا، اور انشاء اللہ خدا کی غیبی تائیدوں کا یہ سلسلہ بند نہ ہوگا۔ ۱۲

کوئی اس قسم کی اُفتاد پڑی تھی جس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ اللہ ورسول کے الفاظ کو آڑ بنا کر جو لوگ اپنے خود تراشیدہ دماغی پیداواروں کو دنیا میں پھیلانا چاہتے ہیں، اور اسی کو اپنا بڑا ذہنی کمال سمجھتے ہیں کہ جس لفظ سے جس معنی اور جس مطلب کو چاہوں لوگوں کو نچوڑ کر بتا سکتا ہوں، گویا ایک قسم کا جادو کرتے ہیں اگر کے تھن سے عرق انار اور انار کے پھل سے گائے کا دودھ نچوڑتے ہیں۔

ہندوستانی دماغ پر سیاست کا جادو

دل سوچتا تھا کہ دوسرے اسلامی ممالک کے متعلق تو نہیں کہتا، لیکن ہندوستان کا علمی دماغ موجودہ زمانہ سے پہلے تو کبھی اس آفت میں مبتلا نہیں ہوا تھا، جس کا گذشتہ چالیس پچاس سال یا یوں کہیے کہ مغربی زندگی کے آسیب میں مبتلا ہونے اور یورپ کی علمی للکاروں سے مرعوب ہونے کے بعد شکار رہا ہے، قرآن سے ثابت کیا گیا کہ زندہ مستقل ہستیوں کا نہیں بلکہ عناصر کی عام قوتوں کا نام ملائکہ ہے، معجزہ کا ظہور ناممکن ہے، مسلمانوں کے نزدیک جنت اور دوزخ کا جو مطلب بارہ تیرہ سو سال سے سمجھا جاتا ہے، قرآن کی رو سے وہ قطعاً غلط ہے اور ان تمام قرآنی الفاظ سے وہی مراد ہے، جو یورپ ان مسائل میں اپنا خیال رکھتا ہے، خدا کا پیغام لے کر جبرئیل نامی فرشتہ کسی انسان پر نازل نہیں ہو سکتا، عقل کا بھی یہی تقاضا ہے، اور قرآن بھی اسی کا مدعی ہے۔

انیسویں صدی کی یہی چیز اس زمانہ میں اور آگے بڑھی، تا ایں کہ سرزمین ہند کے پیدا ہونے والوں میں سے بعض صاحبوں نے مسلمانوں کو متوجہ کیا کہ تمہارے قرآن میں ہمارا ذکر موجود تھا اور تم لوگ اب تک اس کو عرب کے رسول محمد نامی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر منطبق کرتے رہے، خاتم النبیین کے دعوے کو جس قرآن نے سب سے پہلے دنیا کے آگے پیش کیا تھا، عرب وعجم کے مسلمان اس کے جو معنی سمجھے تھے اسی معنی کو "خاتم النبیین" کے الفاظ سے پوچھ کر صاف کیا گیا، اور اپنی طرف سے خود ایک مستقل معنی پہیلی چیال کر بنائے گئے، اور

خود ساختہ معنی پر "خاتم النبیین" کا قالب کس دیا گیا۔

بدتمیزی کا یہی طوفان بالآخر بڑھتے ہوئے چڑھتے ہوتے اس نقطہ تک پہنچ کر رہا کہ دنیا کی وہ ساری قومیں جو قرآن کو اللہ کا کلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانتی۔ یہ ثابت کیا گیا اور قرآنی آیات ہی سے ثابت کیا گیا، کہ یہ سب کے سب کافر ہیں، جہنمی ہیں، لیکن قرآن خداوند تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب ہے اور محمد اللہ کے سچے رسول ہیں، جنہیں ان دونوں باتوں سے انکار اور قطعاً انکار رہے ثابت کیا گیا، قرآن کے نصوص اور آیات ہی سے ثابت کیا گیا کہ یہی لوگ مومن اور مسلم ہیں، خدا کی رضامندی ان ہی کے لیے ہے، جنت کے وارث یہی لوگ ہیں۔

مگر ظاہر ہے کہ ہندوستان میں یہ تماشے جن شکلوں میں بھی پیش ہو رہے ہوں، یہ اسی زمانہ کی بات ہے جب تعلیم کے نظام کو دینی اور دنیوی دو حصوں میں بانٹ دیا گیا، اور دماغ کی بیداری کے ساتھ دل کی جانب سے صرف غفلت ہی نہیں برتی گئی، بلکہ اس کو غافل بنانے اور سلا دینے کی جو ممکنہ ترکیبیں تھیں وہ اختیار کی گئیں۔

نظام تعلیم کی وحدت کی ضرورت

لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں نے تو اس ملک کو وطن بنانے کے بعد تعلیم کا جو خاکہ تیار کیا تھا، اس میں نظام کی وحدت کے ساتھ ساتھ علم کی طغیانی کے نشہ پر

اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی۔ (تیرے رب کی طرف رجعت (اس کا علاج ہے)

کی ترشی کا نچوڑنا بھی تعلیم کا قریب قریب ایک لازمی جز قرار دیا گیا تھا، تاکہ دماغ کی لگام ہمیشہ دل کے ہاتھوں میں یا عقل کی باگ ایمان کے پنجوں میں دبی رہے، شیخ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ جن دنوں میں اپنی دماغی بیداری کی تیاری میں مدرسوں میں کر رہا تھا، تو بار بار ان کے والد شیخ سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ متنبہ کرتے تھے کہ

"ہاں! تاملائے خشک ونا ہموار نہ باشی" دیکھنا خشک اور ناہموار ملا نہ بننا
(ص۱۳ اخبار)

ملائیت (تعلیم یافتگی کی یہ خشکی جس کالازمی نتیجہ ناہمواری ہے، ہندوستان کے مسلمان علم کے
ان طغیانی آثار سے واقف تھے، چونکہ اس ملک میں اسلام جب آیا تو دین کا سارا ذخیرہ
بحمداللہ منقح ہو چکا تھا، حدیثوں کی تنقیح ہو چکی تھی، فقہ کے اصول منضبط ہو چکے تھے یہاں
کے اہل علم کو یہ ساری چیزیں پکی پکائی حالت میں ملی تھیں، اس لیے مذہب کے متعلق صرف
عمل کا کام رہ گیا تھا، یا زیادہ سے زیادہ حوادث یومیہ جو لا محدود ہیں، ان کے متعلق
فقہی کلیات کی روشنی میں حکم پیدا کرنا، آپ دیکھیں گے کہ ایک مدت تک اس وقت تک
جب تک مذہب کو دماغی بازی گاہ کی گیند کی حیثیت سے استعمال کرنے کا لوگوں پر د
نہیں پڑا تھا، خاموشی کے ساتھ مذہب جن زندہ کمالات اور ارتقائی زینوں کے طے
کرنے کا ذریعہ ہے ان ہی مقاصد کے حصول تک مذہب کا استعمال محدود رہا، اس وقت
تک اس ملک کے مذہبی دائروں میں نہ فساد تھا نہ جھگڑے، ایک روح پرور سکون کا
عالم تھا جو طاری تھا۔

ہندوستان میں صدیوں مسلکی جھگڑے ناپید رہے

تقریباً صدیوں اس ملک کے مسلمانوں میں شی
اور سنی یا حنفی و شافعی کے اختلافات بھی نہیں
پائے جاتے تھے، سب کا ایک مسلک ایک مشرب تھا، اسی لئے سارا زور جس طرف ڈھلک
گیا تھا وہ عمل اور اخلاص کا زور تھا، چرچے تھے تو اسی کے، محفلیں تھیں تو اسی کی، کتابیں
لکھیں جاتی تھیں تو اسی پر، لوگوں کو اکثر حیرت ہوتی ہے کہ بہ نسبت دوسرے علوم و فنون کے
ہندوستانی مسلمانوں کی تصنیفات کے سلسلہ میں تصوف کی کتابیں زیادہ اور بہت زیادہ
کیوں نظر آتی ہیں، بے سوچے سمجھے جواب دینے والے خیال کر لیتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی تو اس
جواب کی جرأت بھی کر گذرتے ہیں کہ ان کو آتا ہی کیا تھا، تصوف کے چند رٹے رٹائے
مقررہ مسائل تھے، بس ان ہی کو یہ تختہ مشق بنائے ہوئے تھے۔
ہندوستانی علماء کو آتا کیا تھا؟ اس کا جواب تو بحمداللہ گذر چکا اور جلنا اک

گیا ہے، وہ اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے۔ جو نہیں لکھا گیا ہے، اور اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ تصوف کی کتابوں کی کثرت کی وجہ یہی تھی کہ اس ملک کے مسلمانوں پر اسی کی دھن سوار تھی ہمیشہ رسد طلب کی تابع رہی ہے اسی پر سکون فضا میں جو اکبری عہد سے پہلے اس ملک کے دینی اور علمی دائروں پر چھائی ہوئی تھی، مسلمانوں کی ساری توانائیاں اسی مسئلہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

اخلاص و عمل والا ہندوستانی ادب

افسوس کہ بات بہت طویل ہو جائے گی، ورنہ بتاتا کہ اخلاص و عمل پر ابھارنے والا جو تیز اور سریع النفوذ لوب تلم کے سوانح میں ہندوستانی مسلمانوں کے قلم نے تیار کیا ہے، علی الخصوص حضرت شاہ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری، بہاری، حضرت شاہ نور عالم پنڈوی بنگالی، سید محمد بن جعفر، حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز وغیرہم حضرات سلف میں اور اکبری فتنہ کے بعد شیخ مجدد سرہندی، شاہ ولی اللہ الدہلوی، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسمٰعیل رحمہم اللہ اجمعین کی کتابیں تیر و نشتر کے جن خزانوں سے بریز ہیں، مجھ پر شاید ہندوستان کی بیجا پاسداری کا الزام لگایا جائے گا، ورنہ کہہ سکتا تھا کہ ان بزرگوں نے اس خاص فن میں جو کچھ لکھا ہے دوسرے اسلامی ممالک میں ان کی نظیریں مشکل ہی سے دستیاب ہو سکتی ہیں[1]۔

---

[1] پچھلے بزرگوں خصوصاً حضرت مجدد، شاہ ولی اللہ، مولانا اسمٰعیل کے متعلق شاید عام لوگوں کو بھی واقفیت ہو، اگرچہ مولانا اسمٰعیل کی عبقات نامی کتاب باوجود مطبوع ہونے کے لوگوں تک نہ پہنچ سکی، اس لیے اس کتاب کی منزلت کا اندازہ نہ ہو سکا۔ میرا تو دعویٰ ہے کہ فن تصوف کو پہلی دفعہ اس کتاب میں فن کی صورت بخشی گئی ہے، باقی سلف کے جن بزرگوں کا میں نے نام لیا ہے، کچھ نہیں تو اخبار الاخیار محدث دہلوی میں ان کے کلام کے چند نمونے جو درج ہیں وہی دیکھ لیے جائیں۔ "شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہاری" کے متعلق ایک واقعہ یہاں (باقی اگلے صفحہ پر)

ہندوستان میں علمی مباحثے

مذہبی سکون کے اس زمانہ میں آپ چاہتے ہیں کہ ایامِ فتنہ کی وہ کتابیں ملیں جن سے صدی ڈیڑھ صدی کے اندر اندر ہندوستان کو کیا بتاؤں کہ کیا ہو گیا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ محکومیت کے اس قلیل عرصہ میں خلافیات کا جو لٹریچر ہندوستان نے تیار کر لیا ہے، حاکمیت کے قرون متطاولہ میں اس طرز کا رسالہ نکالنا بھی مشکل ہے اکبر کے عہد میں سنتے ہیں، جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے، "ملا عبد النبی گنگوہی اور مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطان پوری میں، کچھ مذہبی جھگڑے چلتے تھے، لیکن وہ اکبر کا زمانہ تھا، اکبر کے زمانہ میں جو کچھ بھی نہ ہوتا کم تھا۔ اس سے پہلے اور جب تک حکومتِ اسلامیہ کا شباب رہا، وہ اس کے بعد ہم مناقشاتِ بیہودہ کی کوئی کتاب اس طرز کی پاتے ہیں، کچھ نوک جھونک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) قابلِ ذکر ہے، جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر فلسفہ مولانا عبد الباری ندوی جو اسلامی و مشرقی فلسفہ کے سوا اس وقت مغربی فلسفہ کے بھی مستند علماء میں ہیں، مدت، مدت تک مغربی فلسفہ کی کتابیں ایم اے تک جامعہ عثمانیہ میں آپ پڑھاتے رہے ہیں، جدید فلسفہ کی کتابوں کے ترجمے اور مستقل کتابیں آپ نے جو لکھی ہیں ان کی تعداد نصف درجن کے شاید قریب ہو، جو دار الترجمہ سرکارِ عالی و دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہو چکی ہیں، بہرحال مولانا عبد الباری صاحب کو ایک دن میں نے شاہ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکاتیب پڑھنے کے لیے دیے، پڑھنے کے بعد کتاب جب مجھے انہوں نے واپس کی تو دیکھا کہ بیسیوں جگہ سرخ پنسل کے لگے ہوئے ہیں، میں نے عرض کیا یہ کیا ہیں، فرمایا کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس شخص کے کلام میں سطر دو سطر نہیں صفحے کے صفحے ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا موجودہ زمانے کے مغربی مفکرین کی کتابوں کا لفظی ترجمہ ہے، کانٹ ہیگل، برکلے، ہیوم، از قبیل فلاسفۂ جدید کے نظریات جن پر موجودہ فلسفہ کو ناز ہے شاہ صاحب کی کتاب میں بھرے ہوئے ہیں، میں نے بطور یادگار کے اس نسخہ کو اپنے کتب خانہ کے تبرکات میں شریک کر لیا ہے، شاہ شرف الدین یحییٰ منیری حضرت سلطان المشائخ کے معاصرین میں ہیں، آپ کی مستقل سوانح عمری سیرۃ الشرف کے نام سے مولوی ضمیر الدین احمد مرحوم بہاری سابق چیف سکریٹری بیگم صاحبہ بھوپال نے بڑی جانکاہی سے مرتب کر کے شائع کر دی ہے، غالباً موجودہ ہند کے حالات میں عصری رنگ میں سیرۃ الشرف پہلی کتاب ہے جسے ایک انگریزی خواں طبقہ کے فاضل نے مرتب کیا، بعض مکاتیب کا حضرت کے، انگریزی میں غالباً مسز سروجنی نائیڈو نے بھی ترجمہ کیا ہے، مزارِ مبارک قصبہ بہار شریف میں ہے۔

اس زمانہ میں اگر ہو بھی جاتی تھی تو عقلی مسائل میں مولانا آزاد نے ملا محب اللہ بہاری صاحب سلم و مسلم کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ ان کا اور مولا حافظ امان اللہ بنارسی کا اجتماع اتفاقاً لکھنؤ میں ہوگیا، یہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کا عہد تھا، ملا محب اللہ لکھنؤ کے قاضی تھے اور حافظ صاحب صدر الصدور، دونوں ایک ہی استاد مولانا قطب الدین محمد شمس آبادی کے شاگرد تھے اسی معاصرت نے دونوں میں مقابلہ کا بازار کچھ دن کے لیے گرم رکھا تھا، مولانا آزاد لکھتے ہیں:۔

"باہم طریق مباحثہ علمی مسلوک می داشتند" ص ۲۱۲ آپس میں علمی مباحث رکھتے تھے۔

مگر یہ "مباحثۂ علمی" تھا جو دونوں میں جاری تھا "مکافرۂ جہلی" جس کے شکار عہد حاضر کے علماء ہیں اس سے تو اس چھ سو سال میں غریب ہندوستان، جہاں تک میرا خیال ہے واقف بھی نہ تھا، عجب تماشا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کا دونوں کو دعویٰ ہے، اور ہر امتی دوسرے کی گردن پکڑ کر اسلام سے اس کو خارج کر رہا ہے۔

بہر حال ہم نے تو جہاں تک غور کیا ہے، مذہب اور مذہبی علوم کو ہمارے بزرگوں نے

لہ ملا محب اللہ بہاری سے تو خیر کون ناواقف ہے، بقول مولانا شبلی مرحوم جس نے ڈھائی صدی تک اسلامی نصاب کی نصف کتابوں کو اپنی سلم و مسلم کے نیچے دبائے رکھا، باقی حافظ امان اللہ بنارسی سے اب لوگ غالباً کم واقف ہیں، اپنے وقت میں مشاہیر مدرسین میں ان کا شمار تھا، بیضاوی، عضدی، تلویح، شرح مواقف، شرح حکمت العین، شرح عقائد جلالی، تقریباً اکثر درسی کتابوں پر ان کے قیمتی حواشی ہیں، محکم الاصول فقہ میں ایک مستقل متن ان کا بھی ہے۔ مسلم میں بھی ملا محب اللہ نے محکم پر چوٹیں بھی کی ہیں، حافظ صاحب نے میر باقر اور ملا محمود جونپوری کے درمیان مسئلہ دہر پر محاکمہ بھی لکھا ہے۔ دوانی کے قدیمہ و جدیدہ پر بھی ان کے حواشی ہیں، رشیدیہ پر مناظرہ کی کتاب پر تنقید بھی لکھی ہے۔

صرف عمل اور اخلاص کے لیے استعمال کیا تھا، دماغی ورزشوں کے لیے عقلی اور ادبی علوم کے دروازے کھلے ہوئے تھے، اگر سعدی و حافظ اپنے ادبی تحفے طوطیانِ ہند کی شکر شکنی کے لیے بھیج رہے تھے، تو کیا اسی زمانہ میں ہندوستان خسرو اور حسن کی شکر ریزیوں سے ایران اور ترکستان کو شیریں کام نہیں بنا رہا تھا، امیر خسرو اور امیر حسن علاء (مریدان سلطان المشائخ) کا جب انتقال ہوا تو مولانا جامی کے قلم سے بے اختیار یہ اشعار نکلے۔

آں دو طوطی کہ بہ نو خیزی شاں | بود در ہند شکر ریزی شاں
عاقبت سدرۂ افلاک شدند | خامشان قفس خاک شدند[2]

اور ان ہی دونوں پر کیا موقوف ہے، بیدل اور غالب جیسے شعراء جن کا سکہ سارے فارسی سمجھنے والے علاقوں میں رواں ہوا، ہندوستان میں ان کی کیا کمی ہے، میر جرجانی اور علامہ تفتازانی اگر اپنے عقلی اور ذہنی کمالات سے ہمیں سرفراز فرما رہے تھے تو سیالکوٹی، جونپوری، خیرآبادی، دولت آبادی کیا اس احسان کا [illegible] نہیں ادا کر رہے تھے

قرآن پاک کا غیر متعلق مسائل میں استعمال

بہر حال مجھے یہ عرض کرنا ہے، جب نصوص قرآنی اور احادیث نبوی کے ساتھ ہندوستان میں اس بازی گری کا رواج نہ تھا، جس کا تماشا ہم آج کر رہے ہیں کہ ہر وہ نظریہ، ہر وہ اصولِ حیات جو یورپ سوچتا ہے، قرآنی آیات میں اس کی گنجائش نکل آتی ہے، جب تک سرمایہ داری کا زور رہا تو قرآن ہی سے ثابت کیا جا رہا تھا کہ وراثت کا قانون قانون نہیں بلکہ مالک جائداد کے اختیاری فعل کے لیے ایک نیک مشورہ ہے، اور

---

[1] تعمیرات، نباتات، ملاحت، پارچہ بافی، طباخی اور سب سے زیادہ فنون حرب میں ہندوستانی مسلمانوں کے کارنامے اتنے شاندار ہیں کہ اس کی نظیر دوسرے ممالک میں مشکل سے ملتی ہے۔ ۱۲ ار

جب اشتمالیت اور اشتراکیت کے ڈنکے پر یورپ نے چوٹ لگائی تو ہر طرف سے قرآنی آیتیں تلاوت کرتے ہوئے لوگ باہر نکل آئے کہ اشتراکیت کے سوا تو قرآن نے کسی بات کی تعلیم ہی نہیں دی ہے۔

میں اس جستجو میں حیران تھا کہ کافیہ کی یہ شرحیں اگر اسی طرح ...ل کے جواب میں لکھی گئی ہیں، تو اس وقت جب کہ اس ملک میں یہ سوال ہی نہیں اٹھا تھا، جواب کی کیا حاجت تھی۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے باہر بعض دماغوں میں اس قسم کی کر نیزگی کے جراثیم ضرور پیدا ہوئے تھے، اور خصوصاً فرقۂ باطنیہ جنہیں قرامطہ بھی کہتے ہیں ان کے عقیدہ کی تو بنیاد ہی یہی تھی کہ قرآن جو کچھ سمجھانا چاہتا ہے، نہ اسی سمجھنا اور اسی کے مطابق عمل کرنا بے ایمانی ہے بلکہ ہم جو کچھ قرآن سے سمجھنا چاہتے ہیں، اُس پر ایمان لانا یہی عین ایمان ہے[1]، لیکن ظاہر ہے کہ قرامطہ کو ہندوستان کے اس دور سے کوئی

---

[1] اہل علم کے لیے یہاں ایک مسئلہ پر تنبیہ ضروری معلوم ہوتی ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ صوفیہ اسلام کے متعلق ایک چیز کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے یعنی کسی قسم کے اشعار ہوں ان میں ہجر و معشوق ہی کا ذکر کیوں نہ ہو لیکن اس تہ سے بھی وہ فیض لینے کے عادی ہو گئے تھے، اور یہ ایک عام رواج عربی اور فارسی دونوں قسم کی شاعری میں پایا جاتا ہے، اسی مشق نے ان کو یہاں تک پہنچا دیا تھا کہ بعض دفعہ بازار کے صدا لگانے والوں کی صدا پر بھی ان کو حال آجاتا تھا، مشہور ہے کہ بغداد کے بازار میں ککڑی بیچنے والا ککڑیاں بیچتے ہوئے یہ صدا لگا رہا تھا "عشر خیار بدانق" دس ککڑیاں ایک پیسہ میں، عربی میں خیار ککڑی کو بھی کہتے ہیں اور نیک لوگوں کو بھی، حضرت جنید یا شبلی بھی ادھر سے گزر رہے تھے، کان میں یہی صدا آئی، چیخ ماری اور بیہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے پوچھا گیا کہ کیا ہو گیا تھا، بولے کہ بھائی خیال گذرا کہ جب ایک پیسہ میں دس نیک بکتے ہیں تو بروں کا کیا حال ہوگا، بس اسی کا خیال آگیا طبیعت بے قابو ہو گئی، اب ظاہر ہے کہ ان کا غرض یہ قطعاً نہ تھی کہ بیچنے والے کا مقصد بجائے ککڑیوں کے نیک لوگ ہیں، بلکہ ان کا ذہن نیک لوگوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا، گو ایسا کم ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی بعض قرآنی آیات یا احادیث سے ان بزرگوں کا ذہن کسی معنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اور زبان یا قلم سے بھی وہ نکل بھی گیا ہے لیکن حاشا وکلا ان بزرگوں کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اللہ یا اللہ کے رسول کی بھی یہی غرض ہے، اپنے اس ذہنی انتقال کا انہوں نے نام بھی رکھ دیا ہے یعنی اس کو اعتبار اور "الاشارۃ" کہتے ہیں، لوگوں کو ان کی اس اصطلاح یا طرز عمل سے ناواقفیت کی وجہ سے کبھی کبھی ان پر بھی فرقۂ باطنیہ کی جیسی باتوں کا شک گذرتا ہے لیکن جب وہ خود اس کی تصریح کرتے ہیں کہ اس سے مراد حق (باقی آگے ملاحظہ ہو)

تعلق نہیں ہے جس کے متعلق ہم گفتگو کر رہے ہیں، ان کا ایک مخذول و مذموم طائفہ کہیں سے بھٹک بھٹکا کر ملتان یا سندھ کے بعض علاقوں میں، اگر آ بھی گیا تھا، تو غزنوی کی تلوار ان کا صفایا اس زمانہ سے بہت پہلے کر چکی تھی جب سلطان غوری رحمۃ اللہ علیہ کی بدولت ہندوستان کو اسلام کا وطن بنایا گیا تھا، بہرحال کافیہ کی ان عجیب و غریب شرحوں کے متعلق کوئی خاص بات میری سمجھ میں مدتوں نہ آئی۔

عبدالوہاب بخاری عرف مچھی روٹی

لیکن کچھ دن بعد جب اس پر نظر پڑی کہ جس زمانہ میں کافیہ کے ساتھ یہ کارروائی کی گئی، یعنی مغلوں کے عہد میں یہ شرحیں لکھی گئی ہیں اور مغلوں سے پہلے دلی میں جو لودیوں کی حکومت قائم تھی، کہیں ذکر آ چکا ہے کہ ان ہی لودیوں میں ایک بڑا علم دوست معارف پژوہ بادشاہ سکندر لودی بھی گذرا ہے، اسی سکندر لودی کے زمانہ میں ایک صاحب جن کا نام شیخ حاجی عبدالوہاب بخاری ہے، یہ شیخ محدث دہلوی کا بیان ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں ان بخاری صاحب کا عرف عجیب بتایا گیا ہے یعنی

"عبدالوہاب بخاری مشہور بہ مچھی روٹی" (ملفوظات عزیزیہ ص ۷، ۹)

شاہ صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ان کو دلی والے مچھی روٹی کیوں کہتے تھے، بظاہر یہ کچھ مجذوب سے آدمی معلوم ہوتے ہیں، خود ان کا یہ عرف "مچھی روٹی" گو یہ ان کی مجذوبیت کی دلیل ہے، ان کا مولد و منشاء ملتان تھا، ملتان ہی سے یہ منتقل ہونے کے بعد ایک خاص جذبہ کے تحت۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نہیں کہتے تو پھر باطنیوں کے طریقہ کار اور اس کے طریقہ عمل میں آسمان و زمین کا فرق پیدا ہو جاتا ہے یا طنیوں کی کتابیں عام طور سے نہیں ملتیں لیکن بازاروں میں ایک تفسیر شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے نام سے مشہور ہے، جو دراصل اسی قسم کے ایک گمراہ کاشانی نامی کی کتاب ہے، نمونہ دیکھنا ہو تو اسے دیکھ سکتے ہیں، ہر آیت کا مطلب وہ نہیں ہے جو سمجھا جاتا ہے ۱۲۔

"براہ خشکی بزیارت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بشتافت" (اخبار، ص ۲۱۵)

خشکی کے راستے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو حاضر ہوئے۔

اور ایک دفعہ نہیں متعدد بار ممالک اسلامیہ کی سیر کی اور حجاز آتے جاتے رہے۔ آخر میں ملتان چھوڑ کر دلی آگئے، سکندر لودی بادشاہ اہل دین وعلم کا قدر دان تو تھا ہی، ان کے ساتھ بھی خاص حسن سلوک سے پیش آیا، ان کے پیر شیخ عبداللہ تھے، شیخ محدث نے لکھا ہے کہ پیر کے ساتھ جب مفرط رکھتے تھے، شیخ محدث کے الفاظ ہیں:

"او را باد شاہ عبداللہ نسبت محبت و نیاز و طلب و استرشاد چنداں می بود کہ انچہ می گویند کہ فنانی الشیخ می باشد، ایں چنیں خواہد بود نسبت" ص ۲۱۵

ان کو شاہ عبداللہ کے ساتھ نسبت محبت ونگاؤ اور طلب استرشاد ایسی تھی سو وہ جو یہ کہتی ہیں کہ فنانی الشیخ ہوتا ہے اسی طرح کا تعلق تھا

عبدالوہاب بخاری کی عجیب تفسیر

اس سے بھی افتاد مزاج کا اندازہ ہوتا ہے، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ عبدالوہاب بخاری صاحب نے قرآن کی ایک عجیب وغریب تفسیر عربی میں لکھ ڈالی، عجب تفسیر؟ شیخ محدث فرماتے ہیں:

"اکثر قرآن بلکہ تمام قرآن را ارجاع بہ نعت پیغمبر کرد کردہ صلی اللہ علیہ وسلم"

یعنی الحمد سے لے کر والناس تک قرآن اور قرآن کی ہر آیت سے آپ نے یہ معنی پیدا کیے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور تعریف بیان کی گئی ہے، صرف دعوی ہوتا تو غنیمت تھا، پوری تفسیر اسی دعوے کے اثبات میں لکھ بھی ڈالی، اس قسم کی تفسیر میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ ظاہر ہے شیخ محدث نے بھی لکھا ہے:

"غالباً وقوع آں در غلبۂ حال و استغراق وقت بودہ است"

غالباً یہ واقعہ غلبۂ حال اور استغراق کے دوران پیش آیا۔

ظاہر ہے کہ حاجی صاحب کی زندگی چونکہ مخلصوں کی زندگی سمجھی جاتی تھی، اور یہی معلوم بھی ہوتا ہے، اس لیے اس کے سوا اس کی اور کیا توجیہ کی جائے کہ جذب اور استغراق میں یہ کام انہوں نے کیا۔

قرآن کی تفسیر عنوادی

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عوام میں ان کے اس کام نے بڑی اہمیت حاصل کی ہو گی، سارا قرآن پیغمبر کی نعت ہے، عام مسلمانوں کے لیے بظاہر ایک بڑا دلکش نعرہ ہے، میں نہیں جانتا کہ ہندوستان کے سوا قرآن کی ایسی تفسیر کہیں اور لکھی گئی ہو، کشف الظنون وغیرہ میں بعض ایسی الٹی پلٹی تفسیروں کا ذکر تو کیا گیا، جس میں من مانے مطالب قرآنی الفاظ میں بھرے گئے ہیں، بعض تو اس میں ناگفتہ بہ ہیں، لیکن غنیمت ہے کہ ہمارا ہندوستان اس زمانہ میں اگر بہکا بھی تو کسی بری بات کی طرف نہیں بہکا، اگرچہ بہکنے کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اور اگر قرآنی تعبیرات میں اس قسم کے کھینچ تان کی اجازت دے دی جائے تو جہاں کسی اچھے رجحان رکھنے والے آدمی نے سارے قرآن کو پیغمبر کی نعت بنا دیا۔ ہو سکتا ہے کہ شیطان کی کوئی ذریت سارے قرآن کو شیطان کی مدح ...ت کرنے پر آمادہ ہو جائے ... اور ہو جائے کیا معنی؟ اس زمانے میں دنیا جہان کے سارے مسلمانوں کو قرآن ہی کے رو سے کافر، اور کافروں کو مومن و مسلم جب ثابت کیا جا چکا ہے تو آپ تعجب کیوں کرتے ہیں اگر کوئی صاحب شیطانی مدح کے اثبات کی ہمت کر گزریں۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ لودیوں کے بعد مغلی حکومت جب قائم ہوئی اور اکبری زیغ کا عہد شروع ہوا، اس وقت اشرار نے بیچارے حاجی محمد روٹی صاحب کے اس طریقہ کار سے بھی ممکن ہے نفع اٹھایا ہو۔

اکبر کا مسئلہ تناسخ میں اصرار

غالباً یہ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اکبر کو تناسخ کے مسئلہ پر سخت اصرار تھا، جس کا تفصیلی ذکر حضرت مجدد الف ثانی والے مقالہ میں میں نے کیا ہے، اب کتاب کا تو نام صحیح طور پر اس وقت یاد نہیں، لیکن

اسی تناسخ کے مسئلہ کو قرآن کی آیت سے اس میں ثابت کیا گیا تھا، بات ذرا فحش سی ہے لیکن عبرۃً لاولی الابصار نقل کفر کفر نہ باشد کے طور پر ذکر کرتا ہوں، سورۂ یٰسین کی آیت

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا ھُمْ | پھر جب الصور میں پھونکا جائے گا، تو اچانک وے
مِنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی | قبروں سے اپنے رب کی طرف قطار در قطار نکلتے چلے
رَبِّھِمْ یَنْسِلُوْنَ۔ | آئیں گے۔

صور کے معنی سینگ کے ہیں، صورت مشابہت کی وجہ سے صور سے مردوں کے واسطہ توالد کو لے کر آگے مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب اس میں نفخ کی حالت پیدا ہوتی ہے تو اسی سے نکل کر الاجداث یعنی رحم کی قبروں سے گذرتے ہوئے لوگ اپنے رب کے زیر پرورش بننے کے لیے قطار در قطار نکلتے چلے آتے ہیں، اور یہی صورت تناسخ . میں پیش آتی ہے کہ مرنے کے بعد لوگ اسی طریقہ سے دوسرا جنم لیتے رہتے ہیں، اکبر کے زمانہ میں ڈاڑھی منڈانے کا رواج ہوا، کسی نے فقہی دلیل یہ نکالی کہ کما یفعلہ عصاۃ العراق کو قضاۃ العراق بنا کر پیش کیا گیا، طبی نکتہ پیدا کیا گیا کہ "ریش از خصیتین آب می خورد" اس لیے اس چیز کا رکھنا کیا ضرور ہے اور شاید اسی زمانہ میں استدلال ہے کہ حدیثوں میں واعفوا اللحیٰ کے الفاظ ہیں، عفو کے معنی بڑھانا اور مٹانا دونوں آئے ہیں، عفت الدیار محلہا فمقامہا جیسا ہیں عفو سے مٹانا ہی مراد ہے، قرینہ یہ قائم کیا گیا، کہ اس حدیث میں اور تو باتیں مثلاً ناخن کتروانا، بغل کے بال کا ازالہ، اور مونچھوں کا کتانا ان سب کا تعلق ازالہ سے ہے، پھر ایک چیز کا تعلق ابقاء سے کیوں ہو۔

قرآن و حدیث کے اصل مفہوم سے انحراف

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ طبقۃً بعد طبقۃٍ جس آیت یا جس حدیث کا مطلب مسلمان عہد صحابہ سے اس وقت تک نقل کرتے ہوئے چلے آرہے ہیں، اگر اس سے قطع نظر کرکے جس مطلب کو جو چاہے قرآنی آیات

واحادیث پر چسپاں کرتا چلا جائے۔ اگر اس کی عام آزادی لوگوں کو دیدی جائے جیسا
کہ اس زمانہ میں اس کی عام وبا پھیلی ہوئی ہے، تو اس ذریعہ سے بدیہی سے بدیہی مسائل
کو بھی نظری بنالیا جا سکتا ہے، ڈاڑھی کا بڑھانا اور مونچھوں کا کترانا صرف سنت نہیں بلکہ
اسلام کا ایک متوارث "شعار" ہے جسے غیر مسلمان بھی جانتے ہیں، لیکن یاروں کے جی میں آیا تو
اسی حدیث سے جس سے ڈاڑھی بڑھانے کا حکم پیدا ہوتا ہے العیاذ باللہ لوگوں نے ڈاڑھیوں
کے مٹانے کا حکم پیدا کر لیا،

جہاں تک میرا خیال ہے ... اچھے رجحان ہی کے تحت کیوں نہ ہوا ہو، لیکن
اس طریقۂ عمل کی ابتدا، سکندر لودی کے عہد میں ان ہی "مچھلی روٹی" والے صاحب سے
ہوئی، اور اکبر کے زمانہ میں مختلف قرائن ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غلط رجحانات
کی توجیہ میں اس سے فائدہ اُٹھایا گیا۔

قرآن میں من مانی کارروائی کی اجازت نہیں دی جا سکتی

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس
کوئی صریح شہادت تو اس کی موجود نہیں
ہے لیکن میرا غالب گمان یہی ہے کہ کافیہ کی صوفیانہ شرح بجائے ایک کے تین تین جو اس
ملک میں لکھی گئیں، وہ اسی قسم کے فتنوں کے سد باب کا ایک بہترین طریقہ تھا، اس قسم
کی گمراہ ذہنیتوں کا یہ بہترین علاج ہے، قرآن وحدیث میں تحریف معنوی کی قینچیاں
جو چلائی جاتی ہیں، تو چلانے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑی دور کی کوڑی لا رہے ہیں، گویا
ابھی ابھی عقد ثریا سے کوئی تازہ خوشہ توڑ کر لائے ہیں، حالانکہ میرے خیال میں یہ بدترین
غباوت، اور دماغی توازن سے محرومی کی دلیل ہے، کسی چیز کا نہ ماننا یہ اور بات ہے، سمجھ
میں نہیں آتا ہے تو اس کا انکار صاف لفظوں میں کر دینا چاہیے، آپ کی سمجھ میں آدمی کا
وجود تو ممکن ہے، مٹی کا یہ پتلا دیکھ سکتا ہے، سن سکتا ہے، الغرض اس سے سارے
حیاتی آثار ظاہر ہو سکتے ہیں، لیکن زندگی اور احساس کے یہی آثار اگر کسی غیر مرئی عنصر

مثلاً ہوا یا نار یا نور وغیرہ کے کسی ٹکڑے یا قطعۂ خاص میں ظاہر ہوں، تو آپ کی عقل میں اگر یہ بات نہیں سماتی ہے، جن اور ملائکہ کا وجود اسی وجہ سے آپ کی سمجھ میں نہیں آتا تو علمی دیانت کا یہ اقتضاء ہے کہ آپ اس کا علانیہ انکار کر دیجیے، لیکن اس خیانت اور مردہ ضمیری کا ثبوت تو نہ پیش کیجیے کہ قرآن میں کہیں نہ ملائکہ کا ذکر ہے، نہ جنوں کا، اور یہ الفاظ جہاں جہاں آئے ہیں، ان سے مراد آپ کا دماغی مقصد ہے یعنی عناصر کے قویٰ یا جنگلی آدمی وغیرہ وغیرہ۔ آپ کے نزدیک مسلمان اگر بدترین قوم ہے، خدا کی معتوب ہے، مقہور ہے، جہنمی ہے، تو آپ اس قوم سے جدا ہو جائیے اور جو آپ کی نظروں میں بہترین قومیں ہیں، خدا کی جو پیاری ہیں، جنت جن کا اجارہ ہے، ان میں جا کر شریک ہو جائیے، لیکن اپنے اس خیال کو قرآن پر تو نہ لادیے، آپ اس طریقہ سے خدا پر افتراء کر رہے ہیں، رسول پر جھوٹ باندھ رہے ہیں۔

بہر حال اس قسم کے ماؤف عقول و اذہان کے لیے میرا یہ مشورہ ہے کہ قرآن وحدیث کے جن الفاظ میں انہوں نے اپنے دماغی مطالب پہنائے ہیں، اور ان کو غلط فہمی ہو رہی ہو کہ ان کے ان دور از کار مطالب کی شاید قرآنی یا نبوی الفاظ میں کچھ گنجائش نکلتی ہو، ان کو چاہیے کہ ہندوستانی علماء کی ان تریاقی شرحوں کا مطالعہ کر لیں، جن میں نحو جیسے علم کی کتاب سے تصوف کے مسائل نکالے گئے ہیں، اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ بھینس سے انڈے اور انڈوں سے روغن گل نکالنے کا کرشمہ جو آپ بڑے ناز و انداز، فخر و غرور سے دکھا رہے ہیں، یہ شاطروں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، آپ اسی کو داہنے ہاتھ سے کھیلنے کی ناحق تکلیف اٹھا رہے ہیں، آپ کی ذہنی سمیت ان شاء اللہ ان کتابوں سے زائل ہو جائے گی، آخر اتنا غبی کون ہوگا جو واقع میں یہ باور کرنے لگے کہ ابن حاجب کی مراد کافیہ کی عبارتوں سے حقائق ومعارف کے مسائل ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر کچھ بھی کسی میں سمجھ ہوگی، ضمیر میں تھوڑی سی زندگی بھی جس کے باقی

ہو گی، اُن کی گردنیں ان کتابوں کے دیکھنے کے بعد شرم سے جھک جائیں گی ثابت ہو گا کہ اُنہوں نے بڑا کھیل کھیلا، کھیلنا تھا تو کچھ اسی قسم کی کتابوں کو بساط بنا کر کھیلتے جن کے ساتھ اس قسم کی بازیگری شاید گناہ نہ ہو۔

شیخ محدث دہلوی کی ابتدائی تعلیم

ہندوستانی نظامِ تعلیم کے سلسلے کی ایک اور بات جو بظاہر خواہ جتنی بھی ناقابلِ لحاظ نظر آئے مگر میرے خیال میں اربابِ فکر کے لیے خاص توجہ کی دعوت دے رہی ہے وہ شیخ محدث دہلوی کی خود اپنی خود نوشتہ سوانح عمری کا وہ جزء ہے جس میں اُنہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کی یہ عجیب خصوصیت بیان کی ہے، الشیخ نے اپنے حالات اخبار الاخیار کے آخر میں لکھے ہیں، اسی میں ارقام فرماتے ہیں کہ ان کے والد نے

"اوّل از قرآن مجید بے سابقہ تعلیم وقواعد حروف تہجی کہ اطفال خوانند دوسہ جزء بلکہ کمتر واللہ اعلم تعلیم فرمودند"	حروف تہجی کی تعلیم وقواعد کے بغیر پہلے پہل میری تعلیم قرآن مجید سے شروع ہوئی عام لڑکوں کی طرح قواعد بغدادی وغیرہ نہیں پڑھائی گئی اسی طرح تین پاروں سے کم پارے مجھے پڑھائے۔

جس کا یہی مطلب ہوا کہ ہجاء کے حروفِ مفردہ کی تعلیم کے بغیر براہ راست قرآن کے حروفِ مرکبہ ہی سے شیخ کی تعلیم شروع ہوئی اور یہی بات سوچنے کی ہے، شیخ فرماتے ہیں کہ:

"سبق بہ سبق ایشاں می نوشتند و من می خواندم"	روزانہ سبقاً سبقاً وہ لکھتے اور میں اسکو پڑھتا تھا۔

یعنی روزانہ قرآن کی چند سطریں لکھ لکھ کر ان کو پڑھاتے تھے، حروفِ تہجی کی شناسائی کے بغیر مرکب الفاظ سے تعلیم کا آغاز اور اُس میں آنی کامیابی کہ شیخ فرماتے ہیں کہ وہی دو تین جزء جو اس طریقے سے والد نے پڑھائے تھے بس نے قرآن کی اتنی ہی تعلیم حاصل کی۔

"قرآن ہمیں مقدار تعلیم کردہ ام"

آگے قرآن خوانی کا ایسا ملکہ پیدا ہو گیا، اور

چناں قوت رسید کہ ہر روز قدرے از	اس قدر استعداد ہو گئی کہ روزانہ مقدار
قرآن می خواندم و ہر مقدار کہ می خواندم	قرآن سے پڑھتا اور جتنا پڑھتا والد کی
پیش ایشاں (والد) می گذرانیدم	خدمت میں سنا دیتا۔

سنتے ہیں وہی قرآن جسے عموماً بچے برس برس بلکہ اس سے زیادہ مدت میں ختم کرتے ہیں یہ شیخ فرماتے ہیں۔

در دو سہ ماہ ختم قرآن تمام کردم انتہٰی	دو تین مہینے میں پورا قرآن ختم کر لیا۔

ص ۳۱۱

بچوں کی تعلیم

بچوں کی ابتدائی تعلیم کا مجھے ذاتی تجربہ نہیں ہے، لیکن شیخ نے جو بات لکھی ہے اگر یہ ان کے والد کی کرامت یا خود ان کی غیر معمولی ذہانت کا نتیجہ نہیں ہے، تو ان لوگوں کے لیے جو اس مسئلہ میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور عملی تجربات کے مواقع بھی ان کو حاصل ہیں کیا یہ مناسب نہ ہوگا، کہ اس کا تجربہ کریں، بظاہر اتنی بات تو میری سمجھ میں بھی آتی ہے کہ حروف مفردہ کی تعلیم میں بچوں کو جیسے حروف سکھائے جاتے ہیں، ' الف ، با' کی شکلیں پہچنوائی جاتی ہیں، بجائے ان کے خو الحمد اور اللہ وغیرہ کی شکلیں ان کو کیوں نہ پہچنوائی جائیں، تاہم مسئلہ غور طلب ہے، ہندوستان کی تاریخ میں چونکہ اس کا تجربہ ہوا ہے اس لیے ارباب نظر وفکر کے لیے اس کو پیش کر دیا گیا مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ چند سال ہوتے حیدرآباد کی نمائش میں ایک صاحب نے اُردو کے متعلق بھی کچھ اسی قسم کے تجربہ کا دعویٰ کیا تھا، لیکن معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا انجام کیا ہوا غالباً اُنہوں نے اپنی کتاب کا نام "بولتا قاعدہ" رکھا تھا، کاٹھیاواڑ کے رہنے والے تھے، مجھ سے بھی ملے تھے کہتے تھے کہ میرا قاعدہ تجربہ کی منزل سے گذر چکا ہے لیکن کسی نے توجہ نہ کی،

شیخ محدث دہلوی کی فارسی تعلیم

شیخ نے اسی سلسلہ میں اپنی فارسی تعلیم کا بھی ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ:۔

"شاید کہ چند جزو از بوستان وگلستان — چند اجزا بوستان وگلستان اور
ودیوان خواجہ حافظ تعلیم کردہ باشند" — دیوان حافظ شیرازی کے پڑھائے تھے۔

ان کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کی نظم ونثر کی تعلیم ان کی بس ان ہی چند کتابوں کے انتخابات تک محدود تھی اس کے بعد اُنہوں نے جو کچھ پڑھا عربی زبان ہی کے متعلق پڑھا، اور اس سے میرے اس نظریہ کی تائید ہوئی ہے کہ مسلمانوں نے فارسی کی جو شکل بنادی ہے، اور عربی الفاظ سے اس زبان کو اُنہوں نے مالامال کرکے جو قالب اس کا تیار کردیا ہے، کم ازکم اس فارسی میں قابلیت حاصل کرنے کے لیے مسلسل فارسی ہی کی کتابیں پڑھتے چلے جانا جیسے کسی زمانہ میں رواج تھا، یعنی یوسف زلیخا کی مثنوی، سکندر نامہ بدر چاچ بہار دانش، طغرا، مینا بازار، رقعات عالمگیری، سہ نثر ظہوری نثر شیرازی، ابوالفضل کے مکاتیب، انشائے خلیفہ، انوار سہیلی وغیرہ بیسیوں کتابوں کا ایک طومار تھا، لیکن پھر بھی جہاں کہیں کوئی قرآن کی آیت، عربی کا کوئی شعر، یا فقرہ یا عربی کا کوئی نامانوس لفظ یا نادر الجواب کے الفاظ ان کتابوں میں آجاتے تو طلبہ ہی کی نہیں مدرس صاحب کی پالکی بھی وہیں رکھ دی جاتی تھی، بچپن کے زمانہ میں خیال آتا ہے کہ گلستاں کے عربی اشعار کا ترجمہ مکتب کے جو مولوی صاحب آسانی کراسکتے تھے، اُن کا شمار فضلاء وقت میں ہوتا تھا، میرا خیال ہے کہ نظم خصوصاً نثر کی ان تمام فارسی کتابوں کی ساری دشواریاں عربی الفاظ سے پیدا ہوئی ہیں، معمولی صرف ونحو، قدرے عربی ادب کے جاننے والوں کے نزدیک ظہرا اور بدر چاچ، درہٴ نادرہ، انوار سہیلی وغیرہ کی عبارتوں کا حل کرلینا کچھ بھی دشوار نہیں ہوتا کہ ان کی دشواری عربی الفاظ ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

فارسی کے بعد عربی تعلیم

اسی لیے میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ فارسی کی تھوڑی سی مناسبت

پیدا کر دینے کے بعد فارسی اور اردو ادب کی تکمیل کے لیے ضرورت ہے کہ بچوں کو عربی کی ابتدائی کتابیں بلکہ قرآن اور حدیث کے ذریعہ سے ادب، عربی کی تعلیم، صرف و نحو کی معمولی تعلیم کے بعد فلانی زبان مفید ہو سکتی ہے، جس کی شہادت میں شیخ محدث دہلوی کو میں پیش کر سکتا ہوں، گلستان بوستان اور دیوانِ حافظ کے چند انتخابات کے سوا اُنہوں نے فارسی میں کچھ نہیں پڑھا تھا، لیکن فارسی زبان پر ان کو جو قدرت حاصل ہے، اس کا اندازہ ان کی فارسی کتابوں سے، ان کے مکاتیب وغیرہ سے ہو سکتا ہے، ان کی معیاری فارسی کا کون انکار کر سکتا ہے، فارسی کے بڑے سے بڑے انشاء پرداز کے مقابلہ میں شیخ کا قلم پیچھے نہیں رہ سکتا، نظم بھی اچھی لکھتے ہیں[له] اور یہی مشورہ میرا اردو کے لیے ہے کہ اردو کے لیے اردو ہی کی کتابوں پر کتابیں پڑھانے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ تھوڑی بہت فارسی فری جزوے چند از گلستاں و بوستاں و خواجہ حافظ اسی قسم کے منظومات و منثورات سے گذارنے کے بعد بچوں کو عربی میں لگا دیا جائے، عربی کی تعلیم میں فارسی اور اردو دونوں کی قوت اور ترقی کا راز مضمر ہے، کم وقت میں فائدہ زیادہ اور بہت زیادہ حاصل کیا جا سکتا ہے،

عربی تعلیم قرآن وحدیث کے ذریعہ

بلکہ عربی کی تعلیم اگر قرآن کے پاروں اور مختصر حدیثوں کے ذریعہ سے دی جائے، یعنی بجائے ادبی قصوں اور اشعار کے ان ہی کو ادبِ عربی کے سکھانے کا ذریعہ بنایا جائے۔ تو پھر مسلمان جس دینیات کے لزوم کا مطالبہ کر رہے ہیں، اس کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی، وقتی طور پر دینیات کے چند مسائل کا سکھا دینا، اور عمر بھر کے لیے بچوں میں اس کی صلاحیت پیدا کر دینی کہ براہِ راست خطابِ الٰہی کے وہ مخاطب اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد کو پیغمبری کی

[له] حدائق الحنفیہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ شیخ کی مکتوبہ سطروں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچی ہے۔

زبان میں سمجھنے پر قادر ہو جاتیں۔ دونوں میں کوئی نسبت بھی ہے، میں نے پہلے بھی اپنے اس مالیخولیا کا ذکر کیا ہے، اور دوبارہ پھر دہرایا ہے، شاید کہ کسی صاحب دل صاحب عمل کو ان ناچیز مشوروں کی طرف توجہ ہو جائے۔

قدیم تعلیمی نظام میں حساب

ہندوستان کے قدیم تعلیمی نظام میں جس چیز کی ہمیں کمی نظر آتی ہے، یا کم از کم اس کا تذکرہ نہیں کیا جاتا، وہ عجیب بات ہے کہ ریاضی (حساب) کا مسئلہ ہے، اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد میں ہندوؤں کے سوا خود مسلمانوں میں بھی بعض بڑے بڑے محاسب گذرے ہیں[1] لیکن مکتب خانوں میں بچوں کو حساب بھی سکھایا جاتا تھا یا نہیں، اس کا پتہ نہیں چلتا، ہندوؤں کے یہاں تو جیسا کہ اب تک پاٹھ شالوں میں رواج ہے، تقریباً حساب ہی سے تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، اور یہ خاص قومی مزاج کی علامت ہے، جس پر یہ قوم مغلوب ہے۔

برخلاف اس کے مسلمانوں پر خواہ وہ کسی حال میں ہوں، دین کا پہلو ہمیشہ غالب رہا ہے، اسی لیے سب سے پہلی چیز جس سے ان کے یہاں تعلیم کی ابتداء ہوتی ہے وہ قرآن کے حروف ہجا کی تعلیم ہے، ان کا خیال ہے اور بجا خیال ہے کہ آئندہ بچہ کے ساتھ کس قسم کے حوادث پیش آئیں گے، اسے کون جان سکتا ہے، تعلیم میں وہ کہاں تک جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کی ضمانت کون دے سکتا ہے، اسی لیے ان کی نگاہ میں جو چیز ایک مسلمان کے لیے سب سے زیادہ اہم ہے، یعنی قرآن اس سے بچوں کو آشنا کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں، آئندہ اگر کچھ بھی نہ پڑھ سکا تو بیچارہ سر پیٹ کر کچھ قرآن تو پڑھتا رہے گا، دنیا نہ سہی دین تو سنبھال لیگا، میرا بھی یہی خیال ہے کہ کچھ اور ہو یا نہ ہو، لیکن قرآن کی حرف شناسی کا جو مرحلہ ہے، اس کو تمام مراحلِ تعلیم پر مقدم رکھنا چاہیے۔

---

[1] مآثر الامراء دیکھیے خود فتح اللہ شیرازی خان اعظم اعلا لوگوں کا شمار تھا اس فن کے نوابغ (جینیس) میں ہے

ڈپٹی نذیر احمد کا نظریہ

ایک دلچسپ چیز اس سلسلہ میں ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی سوانح عمری "حیات النذیر" میں نظر آئی، مطلب یہ ہے کہ جب سے ہندوستان میں جدید نظامِ تعلیم کا رواج ہوا ہے، مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو معنی مطلب سمجھے بغیر بچوں کو قرآن پڑھانے کا مخالف ہے اور یہ گروہ اس طبقہ کے سوا ہے جو سرے سے قرآن پڑھانے کا ہی قائل نہیں، ظاہر ہے کہ یہ طبقہ تو قابل خطاب بھی نہیں ہے، کیونکہ ان کا مسلمانوں سے صرف نسلی تعلق ہے، دینی حیثیت سے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ دولت کو چھوڑ چکے ہیں، اپنے مرنے جینے کا فلسفہ انہوں نے خود گڑھ لیا ہے یا بجائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سلسلہ میں وہ کسی دوسرے کے مشوروں پر ایمان لا چکے ہیں۔

لیکن جو ابھی مسلمان ہیں مسلمان رہنا چاہتے ہیں، اور مسلمان ہی مرنا چاہتے ہیں خود بھی یہی چاہتے ہیں اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے بھی یہی چاہتے رہیں، مگر باوجود اس کے ان کے دماغ میں کسی نے یہ وسوسہ پھونک دیا ہے کہ معنی مطلب سمجھے بغیر قرآن کے خود پڑھنے یا بچوں کو پڑھوانے کا کیا فائدہ ہے، یہ ترقی پسندوں کا گروہ ہے، شروع شروع میں ترقی پسندوں کی جو ٹولی ہندوستان میں بنی تھی اس کے ایک سرگرم رکن جیسا کہ سب جانتے ہیں ڈپٹی نذیر احمد صاحب بھی تھے، تجددمآبی کا جنون جب شباب پر تھا، اس وقت ڈپٹی صاحب کے خیالات بچوں کو قرآن پڑھانے کے متعلق جو تھے، اسی کتاب میں ڈپٹی صاحب کے ایک خط سے (جو اپنے لڑکے مولوی بشیر احمد مرحوم) کے نام انہوں نے لکھا تھا، ان الفاظ میں منقول ہیں، ڈپٹی صاحب نے اپنے بیٹے کو لکھا تھا:

تم کو پہلے قرآن شریف شروع نہیں کرایا، کہ تم اس کو نہیں سمجھ سکتے اور بے سمجھے الفاظ کا دہرانا بے فائدہ اور لاحاصل ہے

ڈپٹی صاحب کے نظریہ میں تبدیلی

لیکن جوں جوں "ترقی پسندی" کا جوش ٹھنڈا پڑتا گیا،

قبر کا گڑھا، منہ بچاڑے سامنے جھانکتا نظر آنے لگا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی صاحب کے ہوش کچھ ٹھکانے ہوئے، اس کے بعد بچوں کو قرآن پڑھانے کے متعلق اپنی بدلی ہوئی رائے جو انہوں نے قلم بند کی تھی وہ اسی کتاب میں یہ ہے:

"بڑے ہو کر خدا جانے اعصاب دہن (یعنی منہ کے رگ پٹھوں) میں کچھ ایسی خشونت سختی کرختگی، آجاتی ہے کہ زبان عین حروف کے ادا کرانے کی ابتداء سے خوگر نہیں ہوتی پھر وہ اس سے بڑی عمر میں ادا نہیں ہو سکتے"

اور اسی تجربہ اور مشاہدہ نے ڈپٹی صاحب کو اس خیال کے قائم کرنے پر مجبور کیا کہ

"طوطے کی طرح پڑھنا بھی خاص کر مسلمان بچوں کے لیے ضروری ہے"

ڈپٹی نذیر احمد نے اس کے بعد ایک اور دلچسپ دلیل اس کی یہ پیش کی ہے:۔

"اگر یہ بے سود ہو، تو مولود (پیدا ہونے والے نوزائیدہ بچے) کے کان میں اذان کا دینا اس سے بھی زیادہ بے سود فعلِ عبث ہے"

کوئی شبہ نہیں کہ ڈپٹی صاحب کا یہ سوال ایک چبھتا ہوا سوال ہے، مگر ظاہر ہے کہ اس دنیا کے ترقی پسند انسان کو کیا معلوم کہ جس چیز کو آپ حجت میں پیش کر رہے ہیں، یعنی نو مولود بچوں کی کان والی اذان خود اسی کے افادہ پر ان ہی کے پروردہ ترقی پسند نوجوانوں کو کب اعتماد ہے۔

بچوں کو طوطوں کی طرح پڑھانے کا فائدہ

ڈپٹی صاحب نے اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ اور تجربہ کی بات یہ بھی بیان کی ہے کہ

"سب سے بڑا فائدہ بچوں کو طوطوں کی طرح بے فہم مطلب قرآن پڑھانے سے مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ چاہے کوئی اس کو حسن عقیدت سمجھے، یہ ہے کہ قرآن خواں لڑکے زیادہ مودب اور کم آزار دیکھے جاتے ہیں، وجہ یہ کہ قرآن شریف پڑھنے کے لیے مودب بٹھائے جاتے ہیں، اور ادب رفتہ رفتہ داخلِ عادت ہو جاتا ہے"

ایک فائدہ یہ بھی بتایا ہے کہ

• قرآن سے بچوں کو تعلیم شروع کرنے کا یہ مفاد بھی کچھ کم نہیں کہ ذہین بچے لڑکے ہوں یا لڑکیاں حافظ خفی کے سہارے قرآن کا اُردو ترجمہ پڑھنے پر قادر ہو جاتے ہیں، بہ یک کرشمہ دو کار۔

یہ بھی ان ہی کا آخری تجربہ ہے۔

"تعلیم کے پرانے طریقہ کے رو سے قرآن پڑھنے کے ضمن میں بچے چھوٹی چھوٹی دس پانچ سورتیں بھی نماز کے لیے یاد کر لیا کرتے تھے، یا اب یہ حال ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کے لڑکے جو جدید طریقہ سے تعلیم پا رہے ہیں ان کو "الحمد" تک پوری نہیں آتی، درود التحیات کی کون کہے، اور آگے کہاں سے، بیچاروں کو راستہ پر ڈالا ہی نہیں۔ مس ۱۱ حیات الندیر ایجوکیشنل کانفرنس کے پرانے جلسوں میں قدیم تعلیم کی تضحیک و تحمیق پر لکچر دینے والوں کو دیکھ رہے ہیں، وہی لوگ جنہوں نے مسلمانوں کو اپنی راہ سے پھیرا تھا آج اس کا دکھڑا لے کر بیٹھے ہیں کہ مسلمان بچوں کو الحمد بھی یاد نہیں ہوتی۔"

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ عفا اللہ عنہم!

بچوں کے لیے قرآن کا پڑھنا ضروری ہے

بہرحال اگر ہمیں اس ملک میں مسلمان ہو کر جینا ہے اور مرنا بھی ہے اسلام اور ایمان کے ساتھ، اپنے متعلق بھی جن کا یہی خیال ہے، اور اپنے بچوں کے متعلق بھی جن کی یہی آرزو ہے ان کے لیے ناگزیر ہے، خواہ کچھ بھی کہا جائے کچھ بھی سنا جائے لیکن قرآن مجید سے بچوں کی تعلیم کی ابتدا کا جو قاعدہ تیرہ سو سال سے نسلاً بعد نسلٍ ہر ملک اور خطہ میں چلا آ رہا ہے، اس کو بہرحال باقی رکھنا چاہیے۔

موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟

حساب سکھانے کا دستور

لیکن اسی کے ساتھ اس زمانہ کے جدید اسکولوں میں بچوں کو حساب کی تعلیم جس وقت اور جس عمر سے شروع کرائی جاتی ہے اس سے بھی غفلت نہ برتنی چاہیے، میں نے جیسا کہ عرض کیا ہندوستان میں کیا ہوتا تھا، اس وقت تک کوئی وثیقہ اس باب میں نفیاً یا اثباتاً مجھے نہیں ملا ہے، لیکن ابن خلکان سے ابن سینا کی ابتدائی تعلیم کے متعلق جو فقرہ میں نے نقل کیا تھا، اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے ساتھ ساتھ حساب الہند اور دوسرے حسابی قواعد بچوں کو قدیم زمانہ سے سکھانے کا رواج مسلمانوں میں پایا جاتا تھا[۱] بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے کہ عام سرکاری مدارس کے میٹرک کلاس تک حساب کی جتنی تعلیم دی جاتی ہے، اسلامی مکاتب میں اتنی تعلیم حساب کی تو ضروری ہے، گویا اردو اور اردو کو قوی کرنے کے لیے فارسی، فارسی میں زور پہنچانے کے لیے عربی کا ایک سلسلہ جاری رہے گا۔ اور دوسرا مضمون اسی کے ساتھ ساتھ حساب کا بھی مسلسل جاری رہنا چاہیے میٹرک کی منزل تک اسی سلسلہ کو پہنچا دینا چاہیے، نیز حکومت وقت کی جو زبان ہو اس کی تعلیم کی بھی گنجائش آغاز تعلیم کے تیسرے چوتھے سال سے نکالنی چاہیے، قرآن کے سوا ان تینوں سلسلوں کو مکاتب میں جہاں تک میرا خیال ہے لازمی طور پر ہر بچہ کے لیے جاری رہنا چاہیے، البتہ عمر کے حساب سے بعض سلسلے، مثلاً حکومت کی زبان کا سلسلہ خصوصاً جب اجنبی زبان ہو، مناسب ہوگا کہ چند سال کے بعد شروع کیا جائے۔

بعد کو دوسرے مضامین کی گنجائش نکالی جائے

ان تین لازمی سلسلوں کے ساتھ اور بھی کچھ گنجائش نکلے تو ایسے مضامین جو تعلیم کے بغیر نہیں آسکتے، ان کو بھی رکھا جا سکتا ہے،

---

[۱] ابو الفضل نے آئین اکبری میں عہد اکبری کے نصاب کا ذکر کیا ہے، اس میں اور چیزوں کے ساتھ حساب و ریاضی کا بھی ذکر ابتدائی کتبی تعلیم کے سلسلہ میں کیا گیا ہے ۱۲۔

لیکن مسلمانوں کو بہرحال بزرگوں کا وہ طریقہ یعنی قرآن سے تعلیم کی ابتدا، اس کو کسی حال میں قطعاً کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے البتہ سہولت پیدا کرنے کے لیے طریقۂ تعلیم میں ردوبدل ممکن ہے، مثلاً شیخ محمد رضا نے جو طریقہ اپنی تعلیم کا بتایا ہے اُس کو آزما کر دیکھا جائے، بہرحال کچھ بھی ہو، قرآن سے آغازِ تعلیم یہ ہمارے بزرگوں کا وہ متروکہ ہے جس پر ہر زمانہ میں ہر اسلامی ملک نے اصرار کیا ہے، اسلامی گھرانوں میں بشرطیکہ وہ اسلامی باقی بھی رہ گئے ہوں،

بسم اللہ کرانے کی رسم تسمیہ خوانی کی رسم کو جن خصوصیتوں کے ساتھ ہم آج پا رہے ہیں، بجنسہٖ اپنے ان ہی لوازم کے ساتھ یہ رسم اسی ملک میں آج سے پانچ چھ سو سال پیشتر بھی ادا ہو رہی تھی، فوائد الفواد میں امیر حسن علا سجزی ناقل ہیں کہ:

شنبہ شانزدہم ماہ محرم ۷۰۸ھ سعادت دست بوسی حاصل شد، بندہ آں روز خرد کے را از اعزہ پیش برد، عرضداشت کرد کہ ایں را بہ قرآن خواندن فرستادہ می شود، اول بخدمت مخدوم آوردہ شد خواست تا بہ برکت نظر مخدوم و نفس پاک خدائے تعالیٰ او را قرآن روزی کند" می لا ا	۱۶ ماہ محرم ۷۰۸ھ روز شنبہ دست بوسی کی سعادت حاصل ہوئی بندہ اُس دن ایک عزیز بچہ کو خدمت میں لے گیا کہ اس کو قرآن پڑھانے کے لیے بھیجا گیا ہے، پہلے آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے کہ مخدوم کی نظر کیمیا صفت کے صدقے میں اس کو قرآنی ارزانی ہوئی۔

اور یہی رواج بحمد اللہ مسلمانوں میں اب تک جاری ہے کہ شہر یا قصبہ، گاؤں میں نسبتاً جو زیادہ صاحب دین و علم ہو، بچوں کا مکتب ان ہی سے کراتے ہیں، امیر حسن اس کے بعد لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے یہ سن کر " دعا خیر ارزانی داشت"

جب دعا ہو چکی

"بعد ازاں تختہ بدست مبارک گرفت و نوشتہ بسم اللہ الرحمن الرحیم"

"اللہ الرحمن الرحیم" کی یاد تو ہر کام سے پیشتر مسلمانوں کا دستور رہی ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ آج بھی بچوں کے مکتب کا آغاز ہوتا ہے، سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں بھی آغاز کے وہی الفاظ مروّج تھے، حسن لکھتے ہیں کہ بسم اللہ کے بعد حضرت والا نے ارقام فرمایا۔

"رَبِّ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ" (اے اللہ علم کو آسان کر اسے دشوار نہ بنا)

"ا ب ت ث ج"

بجائے یہ حروف سلطان المشائخ نے اپنے دست مبارک سے لکھے، خرد ک آگے بڑھایا گیا، اور حضرت والا نے:

"آں گاہ ایں حروف را بزبانِ مبارک خود تلقین کرد"	اس وقت حضرت نے خود اپنی زبان مبارک سے بچہ کو یہ حروف کہلائے۔

بہار میں بسم اللہ کرانے کا دستور ہے، یہ چھے سو سال کی تسمیہ خوانی اور آغاز مکتب کی رپورٹ دلی کی ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، کہ مسلمان اس ملک کے جس گوشہ میں بھی آباد تھے، باوجود مسافت کے رنگ سب کا ایک تھا، عہد خلجی و تغلقی میں یہ تماشا آپ کو دلی میں نظر آرہا ہے، آئیے، سیکڑوں میل دور دلی سے مشرق چلے آئیے، بہار آجائیے یہاں مخدوم الملک حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیری، رحمۃ اللہ علیہ مسند ارشاد پر جلوہ فرما ہیں، ان کے ملفوظات طیبہ معدن المعانی کے نام سے طبع ہو چکے ہیں، ایک مجلس کا ذکر جامع ملفوظ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"قاضی شرف الدین خواہر زادہ خود بردہ بود عرضداشت کہ امروز روز تعلیم خواہر زادہ بندہ ماست، مطلوب این است کہ اول تختہ پیش مخدوم آغاز کند"

ایک ذہنیت، ایک ہی قسم کے الفاظ ہیں، جن کے ذریعہ سے دلی میں بھی بچے آغاز مکتب کے لیے بیٹھائے جا رہے ہیں اور بہار میں بھی۔

دلّی میں بھی آپ نے دیکھا تھا کہ تختہ کوٹ کر سلطان المشائخ نے اس میں ارقام فرمایا تھا، یہاں بھی دیکھئے جامع ملفوظ لکھتے ہیں کہ قاضی شرف الدین نے عرض کیا

"اول تختہ بندگی مخدوم بدست مبارک نویسد، بندگی مخدوم علمہ اللہ اجابت فرمود، بدست مبارک ایں چہار حرف نبشت ا۔ ب ت ث بعدہ او را ہمیں چار حرف تعلیم کرد"

البتہ یہاں طریقۂ تلقین میں ذرا سا فرق ہے، یعنی مخدوم الملک نے اس کے بعد خواہر زادۂ قاضی کو کہا۔

"بگو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ان بیست نے واللہ الرحمٰن الرحیم کے نام سے کر علم کو تجھ پر آسان کرے" بچہ لے

"بسم اللہ تمام گفت بعدہٗ آں چہار حرف تعلیم تلقین فرمود" — پوری بسم اللہ پڑھی اس کے بعد چار حروف کی تعلیم و تلقین فرمائی

بعد بچے سے صرف چار حروف ہی بسم اللہ کے ساتھ ادا نہیں کرائے گئے بلکہ

"ای میرک نیز چنانچہ بندگی مخدوم تعلیم فرمود ہمچناں حروف فہارا بگفت" — حضرت مخدوم نے ان میرک کو بھی پڑھایا۔ اسی طرح حروف تہجی بھی۔

واللہ اعلم خود بچے نے سب کے ساتھ اسے بھی ادا کر دیا یا ادا کرایا گیا، کتب کی رسم ادا ہو گئی۔

"بعدہ بر لفظ مبارک راند کہ "الحمد للہ" وایں دعا در حق وے ارزانی فرمود کہ حق تعالیٰ ترا عالم گرداند" — اس کے بعد الحمد للہ کہا بچہ کے لئے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تجھے عالم بنائے۔

بچہ کا کتب ختم ہو گیا، اب بڑوں کی تعلیم شروع ہوئی جامع ملفوظ لکھتے ہیں کہ اسی مناسبت سے حضرت والا نے انسانیت کی ان بلندیوں کی طرف اشارہ فرمایا جو آدمی زادہ کو تعلیم و ادا کرتی ہے، فرمایا۔

عجب بات فرمائی۔

"از الف تا با و تا کجا باید رسانید"

مخدوم الملک بہاری

خود جو یہ کہہ رہا تھا، اسی الف تا با نے دنیا اور دین کی مخدوم الملکی کے کس مقام تک اسے پہنچایا، کہ ابو الفضل جیسا طاغی بھی ان کے ترجمہ میں یہ لکھنے پر مجبور ہوا۔

فراواں تصنیف از و یادگار ازاں میان	آپ کی بہت سی تصانیف یادگار ہیں انہیں
مکتوبات او در سرشکنی نفس آزموں داد	میں آپ کے مکتوبات بھی ہیں جو نفس کشی میں
(ج ۳ ص ۱۷۱)	آزمودہ ہے۔

شیخ محدث نے تو بجائے تعارف کے یہ ارقام فرما کر

"وے از مشاہیر مشائخ ہندوستان ست	وہ ہندوستان کے مشہور مشائخ میں سے ہیں
بے احتیاج کہ کسے ذکر مناقب او کند او	وہ اس کے محتاج نہیں کہ کوئی ان کی منقبت
تصانیف عالی ست" ص ۱۱۷	کرے ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔

اور صرف چند مکاتیب کو نقل کر کے بجائے بگو یند کے مشک کے لیے یہ بو ید کے تجربہ پر ان کے فضائل کو محول کر دیا۔

رسم بسم اللہ کی مٹھائی

مکتب کے اس سلسلہ میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ حسب دستور مکتب کے بعد دعوت یا مٹھائی وغیرہ کوئی چیز تقسیم ہوئی یا نہیں، غالب گمان یہ ہے کہ یہ رسم ادا ہوئی ہو گی امیر حسن علائی نے ذکر نہیں فرمایا، لیکن مخدوم الملک کے جامع ملفوظات نے اس کا بھی ذکر کیا ہے لکھتے ہیں:

لطائف نیز آوردہ بودند پیش یا ماں کشیدند یک کاک (بسکٹ) وقدرے شیرینی بندگی مخدوم بستد و بہاں پسر کہ را خوانیدن گرفت واں لفظ فرمود کہ "با خدمت تو کنم" (معدن المعانی ص ۱۳۹)

ہر پہلی نسل پچھلی نسل کی خادم ہے، گویا اسی نظریہ کی طرف گو مرزا غالب ہی اشارہ تھا، رحمہم اللہ اجمعین، شاید اس بہاری مخدوم کے اس بہاری خادم کی غرض اپنی کتاب سے بھی یہی ہو۔

اللھم ارزقنا اتباعھم۔ وتقبل منا انک انت السمیع العلیم ھذا وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

ضمیمہ

مسلمانان ہند کا

نظامِ تعلیم و تربیت

مسلمانان ہند کے تعلیمی مشکلات ہی کا حل میری کتاب نظامِ تعلیم تربیت میں پیش کیا گیا ہے۔ جو سالہا سال کے غور و فکر اور مختلف تعلیمی نظاموں کے تجربہ کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے۔ چونکہ کتاب دو جلدوں میں پھیل گئی ہے اس لئے اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

ابتداہی میں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مسلمان رہتے ہوئے اور حتی الوسع اسلامی زندگی سے اپنی زندگی کی آبیاری کرتے ہوئے مسلمان کس طرح تعلیم حاصل کر سکتے ہیں میری بحث کا دائرہ صرف اسی بحث تک سردست محدود ہے۔ چاہتا ہوں کہ اپنی تجویزوں کو پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کردوں کہ جن مشکلات کے تصور نے ان تجویزوں کے سوچنے پر مجھے مجبور کیا ہے، وہ کیا ہیں۔

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے برخاست ہوجانے کے بعد حکومت مسلّطہ نے تعلیم کا جو نظام ملک میں (اسکولوں اور کالجوں وغیرہ) کے نام سے قایم کیا، مشاہدہ بتا رہا ہے کہ اس نظام کی تعلیم سے استفادہ کرنے والے مسلمانوں میں بتدریج اسلامی زندگی سے بُعد پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے یہ واقعہ ہے کہ جن خاندانوں میں جدید تعلیم تیسری اور چوتھی پشت میں اس وقت تک پہنچ چکی ہے ان میں اسلام کا صرف نام رہ گیا ہے، عام ابتدائی باتیں بھی ان لوگوں کو اسلام کی معلوم نہیں!

پرستی ہوئی نہیں بلکہ یہی ہوئی بات ہے کہ اچھے لکھے پڑھے لوگ جن کا نام بھی مسلمان کا سا تھا، لیکن وہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت تک سے ناواقف نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ اپنے دین سے جو اس حد تک دور ہو چکا ہو، وہ دین کی دوسری باتوں سے کس حد تک واقف رہ سکتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ جیسے جیسے دن گذرتے جاتے ہیں، اس قوم کے نام نہاد مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی جارہی ہے اور حالات میں کوئی تغیر اگر خدانخواستہ واقع نہ ہو تو یوں ہی یہ تعداد اور بڑھتی چلی جائیگی۔

(۲) حکومت کا میلان عموماً تعلیم کے لزوم کی طرف بڑھتا چلا جارہا ہے، اس وقت تک تو ابتدائی تعلیم کے دائرے کو وسیع ہی کرنے پر حکومت قناعت کررہی ہے، لیکن وہ دن دور نہیں ہے، کہ ملک کے ہر باشندے کو مجبور کیا جائے گا کہ حکومت کے منظور شدہ نصاب کی تعلیم لزوماً اپنے بچے اور بچیوں کو دلائے جس کے معنی یہی ہوسکتے ہیں، کہ عام مسلمانوں کو تھوڑا بہت تعلق اسلام سے ابھی جو باقی ہے، تعلیم کی وسعت اور اس کا لزوم اس تعلق کو بھی کمزور کرتا چلا جائے گا تعلیم یافتہ .... طبقہ سے مایوس ہو کر علماء اسلام جس عام مسلمانوں کی دینی عقیدت پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں اس عقیدت کی عمر بھی زیادہ دراز نظر نہیں آتی۔

(۳) مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں مختلف تحریکیں مختلف بھیسوں میں رونما ہوتی رہی ہیں۔ ان تحریکوں کا مقابلہ ہر زمانہ کے علماء نے ان تحریکوں کی گہرائیوں تک خود پہونچنے کے بعد کیا ہے، اور یہ بھی یہی بات کہ مرض کا علاج مرض کی صحیح واقفیت ہی کے بعد ممکن ہے، لیکن مرض کو مرض جیسی ناپاک چیز قرار دے کر اگر طبیب اس کے جاننے سے گریز کرے گا، تو مریضوں کا علاج ہو چکا۔

دراصل یہی تین باتیں ہیں، جنھیں دیکھ کر شعوری اور غیر شعوری طور پر اسلام کے مخلصین نہیں ہیں خاکسار بھی ان حالات سے ہمیشہ متاثر رہا ہے۔ تیس چالیس سال کے اس طویل عرصہ میں کیا کیا تجویزیں خود میرے دماغ میں آئیں، یا مجھ سے پہلے لوگوں نے اس سلسلہ میں مشکلات کے حل کی جو تدبیریں سوچیں، ان سے بحث میں طوالت ہوگی، اس وقت جن تجویزوں کو

اپنے دماغ میں رکھتا ہوں اور تفصیلی ذکر جس کا اپنی کتاب تعلیم و تربیت میں میں نے کیا ہے
اس کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے جو دو مستقل نظام دحکومتِ مسلط کے
قیام کے بعد جاری ہو گئے ہیں اس کی دوئی اور اثنینیت کو مٹا کر صرف ایک ہی نظام کو
قبول کر لیا جائے اسی لئے اپنی تعلیمی تجویز کا نام میں نے

"نظریہ وحدت نظام تعلیم"

رکھا ہے۔

میں نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ حکومت مسلط سے قبل مسلمانان ہند میں تعلیم کا جو
نظام قائم تھا۔ عام طور پر "درس نظامیہ" کے نام سے جسے شہرت حاصل ہو گئی ہے اس
کے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے، کہ وہ مسلمانوں کے صرف دینی تعلیم کا نظام تھا،
میں نے تفصیل سے د یا ہے کہ درحقیقت اس نصاب میں اس عہد کی دفتری زبان فارسی کی
نظم و نثر انشاء وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب خطاطی وغیرہ کی مشق کرانے
کے بعد اعلیٰ تعلیم عربی زبان کی کتابوں کے ذریعہ دی جاتی تھی ابتداء سے آخر تک اس
زمانہ کے تعلیمی نصاب کے ختم کرنے کی مدت پندرہ سولہ سال سے کم نہ تھی۔ اور اس پوری مدت
تعلیم میں درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے علماء صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل
تین کتابیں پڑھائی جاتی تھیں یعنی چند مختصر فقہی متون کے سوا قرآن کے متعلق جلالین (جو عربی
زبان میں قرآن کا ترجمہ اور مختصر حل ہے) حدیث کے متعلق مشکوٰۃ اور فقہ کے سلسلہ میں گو
بہ ظاہر نام تو دو کتابوں کا لیا جاتا تھا یعنی شرح وقایہ اور ہدایہ لیکن ہدایہ کے ان ابواب
کو نہیں پڑھایا جاتا تھا جو شرح وقایہ میں پڑھائے جاتے تھے اسی لئے میں کہتا ہوں کہ حکماً
وعملاً یہ ایک ہی کتاب کی تعلیم تھی زیادہ سے زیادہ میرے اس بیان پر یہ اعتراض کیا جاسکتا
ہے کہ ڈھائی پارے قرآن کے تفسیر بیضاوی کی رو سے بھی پڑھائے جاتے تھے اولاً یہ ڈھائی
پارے ہر جگہ نہیں پڑھائے جاتے تھے خیر آبادی خانوادے میں صرف سوا پارہ بیضاوی کا جزء نصاب تھا

لیکن اگر مان لیا جائے کہ بیضاوی بھی قرآن کے متعلق ایک کتاب درس نظامیہ والوں کو پڑھائی جاتی تھی، تو مطلب کیا ہوا؟ یہی تو کہ پندرہ سولہ سال کی مدت میں گویا خالص اسلامی دینیات کی چار کتابوں کا پڑھنا دینی علوم سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ ان چار کتابوں کے سوا تعلیم کی اس طویل مدت میں طلبار جو کچھ پڑھتے تھے، فارسی (یعنی دفتری زبان) کی مذکورہ بالا بیسیوں نظم و نثر کی کتابوں کے سوا منطق، فلسفہ، ہیئت، اقلیدس ادب عربی، اور بعض ایسے عقلی وادبی علوم جنھیں خود مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا، یعنی علم کلام اور علم اصول فقہ معانی و بیان وغیرہ ان ہی علوم و فنون کی اتنی کتابوں کا ختم کرنا ضروری تھا، جن میں صرف منطق و فلسفہ کی کتابوں کی تعداد آخر زمانہ میں چالیس پچاس سے متجاوز تھی میں نے بزرگوں کے اسی طرز عمل کو پیش کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا، کہ دینیات کی عمومی تعلیم کے لیے جب تین یا زیادہ سے زیادہ چار کتابوں کا پڑھ لینا کافی خیال کیا گیا تھا اور زیادہ وقت غیر دینی علوم ہی کی تعلیم میں صرف ہوتا تھا تو آج بھی کیا یہ ممکن نہیں ہے، کہ غیر دینی علوم کے اس حصہ کو جس کے اکثر نظریات و مسائل مسترد ہو چکے ہیں، کم از کم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے ان کو نکال کر عصر جدید کے مقبولہ علوم اور عہد حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو ان ہی تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی اور دنیاوی تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے حکومت سے یہ استدعا کی جائے کہ جیسے پہلے ان کی تعلیم میں دین کا عنصر ہر زمانہ میں ایک لازمی اور ضروری مضمون کی حیثیت رکھتا تھا اب بھی اس عنصر کو لازم کر دیا جائے اور اس طور پر لازم کر دیا جائے کہ جیسے درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے، دین کا علم ان کتابوں کے معیار کے مطابق اپنے پاس رکھتے تھے، اسی طرح بی۔ اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے، اس زمانہ میں بھی اس حد تک مذہب کے عالم ہو کر نکلا کریں ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پھر دینیات کے مدارس کے نام سے الگ عام مدرسوں کے

قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہ رہے گی، ہر عالم اس وقت گریجویٹ ہوگا اور ہر گریجویٹ عالم، ملا ہی مسٹر ہونگے، اور مسٹر ملا، عالم وتعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا۔

یہ ہے خلاصہ اس تجویز کا جسے "نظریۂ وحدت نظام تعلیم" کے نام سے اپنی کتاب میں میں نے پیش کیا ہے، اور اس کے تمام پہلوؤں پر جہاں تک میرے امکان میں تھا بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں میری تجویز پر جو شبہات کیے جاتے ہیں ان ہی کا جواب اس خلاصہ میں دیا جائے گا، پہلا شبہ یہ ہے کہ: دینیات کی ان تین کتابوں کے پڑھنے کے لئے عربی زبان سے کافی واقفیت ناگزیر ہے اور عربی زبان کا سیکھنا آسان نہیں ہے، اسی کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کا ایک حصہ تو وہ ہے جس میں مسلمانوں کی دینی چیزیں مثلاً: قرآن وحدیث وفقہ وغیرہ محفوظ ہیں، اس حصہ کے متعلق یہ بتایا گیا ہے، کہ اردو بولنے والی قوموں کے لیے عربی زبان کا یہ حصہ تقریباً مادری زبان کی حیثیت رکھتا ہے یعنی اسی پچاسی فیصدی الفاظ اس حصے کے اردو بولنے والے ہندی مسلمان کو باضابطہ عربی زبان سیکھے بغیر یوں ہی معلوم ہیں، چند اصولی باتوں کے جان لینے کے بعد اس عربی کو آدمی خود بخود سمجھنے لگتا ہے، البتہ عربی زبان کا وہ ذخیرہ جس میں ایام جاہلیت وعہد اسلامی کے شعراء کے اشعار یا محاضرات ومسامرات وانشار خالص ادبی نثر ونظم کی کتابیں ہیں یقیناً دشوار ہے۔ لیکن اس عربی کے سیکھنے کی ضرورت ہر اس شخص کو نہیں ہے جو اپنی واقفیت صرف اسلامی امور تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔

دوسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ صرف ان تین کتابوں کے پڑھنے سے کیا اسلام کے دینی علوم میں ماہرانہ قابلیت اور تبحر کیا کوئی حاصل کر سکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ عام لزومی واقفیت اور چیز ہے اور تبحر واختصاص کسی علم میں یہ بالکل ایک جداگانہ مقصد ہے، میری گفتگو صرف عام واز می واقفیت تک محدود ہے، درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے عام علماء کی واقفیت

ومناسبت کا جو معیار اسلامی علوم کے متعلق ہوتا تھا یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ان میں کتابوں کو صحیح طور پر پڑھ لینے کے بعد امید کیجاتی ہے کہ اب بھی ان کے پڑھنے والے واقفیت ومناسبت کے اس معیار تک پہنچ سکتے ہیں:

باقی تبحر واختصاص انسان علوم میں سے کسی خاص علم میں مہارت خصوصی کا مالک ہونا اس کے لیے ظاہر ہے کہ خصوصی مدارج کی تعلیم کی یقیناً ضرورت پڑے گی، جیسے غیر دینی علوم کے معیار کو خصوصی کلاسوں کی تعلیم سے بلند کیا جاتا ہے، وہی طرز عمل ہم اسلامی علوم کے متعلق بھی اختیار کر سکتے ہیں، بلکہ لازماً اختیار کرنا چاہیے:

تیسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ارباب فکر ونظر نے اب تک جو کچھ سوچا، سمجھا، لکھا پڑھا تھا دین سے ان کا خواہ تعلق نہ بھی ہو، تو کیا ان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا مناسب ہوگا علی الخصوص ایسے علوم جن کا دین سے گونہ تعلق بھی ہے، خصوصاً جن فنون کو مسلمانوں نے اسلام ہی کی صحیح تشریح کیلئے توضیح کے لیے ایجاد کر لیا تھا، مثلاً: اصول فقہ، کلام یا بیان ومعانی وبدیع وغیرہ کا جو حال ہے میں نے اس کا اپنی کتاب میں جواب دیا ہے کہ ان علوم کو زندہ رکھنے کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ دوسرے اختیاری مضامین کے ساتھ ان مضامین کو بھی اختیاری مضامین کے ذیل میں رکھ دینا کافی ہوگا، کچھ لوگوں کا پڑھنا پڑھانا ان کی بقاء اور ارتقاء کیلئے کافی ہے،

بلکہ عربی زبان کے دوسرے ادبی حصہ کے متعلق بھی میرا یہی خیال ہے کہ ان کو بھی اختیاری مضامین میں شریک کر کے زندہ رکھا جائے، لیکن ہر مسلمان کو مسلمان باقی رکھنے کے لیے خصوصاً موجودہ حالت میں اپنی دماغ کی تعلیمی بیداری کے بعد اس عربی کی ترویج تعلیم قطعاً ضروری نہیں ہے۔

ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے، کہ موجودہ مغربی تعلیم گاہوں کے نصاب میں دینیات کی تعلیم کے لازم کر دینے کے بعد اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ پڑھنے والوں کی زندگی اسلامی

زندگی بن جائے گی؟ کیا ان کا جو ماحول ہے، اس کے سمی اثرات کے ازالہ کے لئے عرف تعلیم کافی ہے؟ بلاشبہ یہ آخری سوال بڑا جان گسل زہرہ گداز اور حوصلہ شکن سوال ہے، ماحول حکومت کے نقطۂ نظر کا تابع ہوتا ہے، جب تک حکومت غیر اسلامی ہے اس کے پیدا کردہ ماحول میں اسلام کی قدر و منزلت کی توقع غلط توقع ہے۔ لیکن پھر کیا کیا جائے، کیا مسلمانوں کو اسی حال میں چھوڑ دیا جائے؟ میرا خیال ہے کہ تعلیم کا بھی کچھ نہ کچھ اثر قلوب پر ضرور پڑتا ہے، خصوصاً اگر پڑھانے والوں میں اثر کو متعدی کرنے کا سلیقہ ہو، اسی کے ساتھ طبائع بھی ایک طرح کے نہیں ہوتے، اسی مخالفانہ ماحول سے آخر مولانا محمد علی مرحوم ڈاکٹر اقبال مرحوم مولانا عبدالماجد دریا بادی جیسے لوگ پیدا ہوتے رہے، جب ناواقفیت کے باوجود اسلام نے ان لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ بالآخر ان کو صحیح اسلام سے واقف ہونا پڑا تو پھر خدا کی رحمت سے ناامیدی کی راہ کیوں اختیار کی جائے، ہوسکتا ہے کہ قرآن کی، پیغمبر کی زندگی کی، اسلامی نظام حیات (فقہ) کی تعلیم ان کو خود متاثر کرے۔ سب کو نہیں تو بعض کو تو انشاء اللہ ضرور متاثر کرکے رہے گی اور ان بعض کا اثر انشاء اللہ دوسروں کے متاثر ہونے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

بلکہ تعلیمی نظام کی وحدت کے ساتھ ساتھ مسلمان حکومت کے اس دور میں اتنا کام اسی تعلیم کے متعلق اپنے ذمہ اگر اور لے لیں، یعنی ہر تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ مسلمان طلباء کیلئے خاص اسلامی اقامت خانے بھی قائم کئے جائیں، اور اقامت خانوں کی نگرانی ارباب تقوی و دیانت کے سپرد کی جائے ان کا ماحول بالکلیہ اسلامی ماحول رکھا جائے گا تو جو اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے علاج کی ایک کافی کارگر صورت یہ بھی ہوسکتی ہے،

علاوہ ان تمام باتوں کے ایک چیز اس سلسلہ میں قابل غور یہ بھی ہے کہ انگریزی جامعات اور مغربی طرز کی یونیورسٹیوں کے ماحول پر اگر ہم قابو نہیں پاسکتے تو آج مسلمانوں کے جو دینی مدارس ہیں الا جب جدید نصاب کو جاری کردیا جائے گا تو ان کے ماحول تو ہمارے زیر اقتدار رہ سکتے ہیں، جدید علوم و فنون اور سرکاری عصری زبان کی تعلیم کیلئے مدرسین ان مدارس میں اپنے منتخب

کئے جائیں جو نام کے ساتھ کام بھی مسلمانوں کا کرتے ہوں، بحمد اللہ اب ان کی ایک کافی تعداد ملک میں پیدا ہو چکی ہے تلاش سے ایسے لوگ مل سکتے ہیں اور بالفرض سردست نہ بھی ملیں تو ایسی صورت میں میرا خیال ہے کہ بجائے ملحد اور بے دین نام نہاد مسلمانوں کے غیر اقوام کے اہل علم کا تقرر کر کے ہم خود اپنے یہاں ایسے لوگ پیدا کر سکتے ہیں جو آگے چل کر خود ہمارے قدیم علوم و فنون کی تعلیم کا کام انجام دے سکتے ہیں میں ملحد مسلمانوں سے غیر اقوام کے دہری معلموں کو اس باب میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

آخری بات اس سلسلہ میں ابتدائی تعلیم کے متعلق میری جو تجویز ہے اس کا پیش کرنا ہے میرا خیال ہے کہ مسلمانوں پر عربی تعلیم کے لزوم کا مطالبہ شروع ہی سے حکومت کے آگے پیش کرنا چاہیئے، لیکن عربی پڑھانے کا طریقہ یہ اختیار کرنا چاہیئے کہ پہلے بچوں کو بغدادی قاعدہ کے اصول پر عربی حروفِ ہجا سے آشنا کیا جائے، اور اسی طرح آشنا کیا جائے کہ جیسے اس وقت کیا جاتا ہے پھر ناظرہ قرآن بھی ہر بچے کو اسی طرح پڑھایا جائے۔ جیسے اب تک رواج ہے، قرآن کے بعد یا موقع ہو تو قرآن کے ساتھ ان ہی عربی حروف کی دوسری شکل یعنی خط نستعلیق سے بھی ان کو آشنا کیا جائے[1]، یعنی اردو پڑھائی جائے، اور یہ دیکھ لینے کے بعد کہ خواندگی کی قدرت بچے میں اردو کی پیدا ہو چکی ہے، اور آئندہ اسد کو چھڑا کر فارسی کے آمدنامہ اور کچھ تھوڑی بہت مناسبت اس سے پیدا کرا کے عربی میں طلبہ کو لگا دیا جائے، یہی

---

[1] نستعلیق یا فارسی حروف سے طلبہ کو آشنا کرنے کی ضرورت بھی اسی وقت تک ہے جب تک طباعت کے لیے نسخ کے حروف کو اردو کے لئے تسلیم نہیں کیا گیا ہے اگر یہ مسئلہ طے ہو گیا تو پھر اس کی بھی چنداں ضرورت باقی نہیں رہے گی، البتہ لکھنے کی حد تک نستعلیق کو باقی رکھنا چاہیئے، انگریزی میں طباعت اور کتابت کے حروف کی شکل جیسے ذرا بدل ہوئی ہے یہی طرزِ عمل ہم بھی اختیار کریں گے نسخ طباعت کے لئے اور نستعلیق کتابت کے لئے، ۱۲

عربی پڑھتے ہوئے بی اے تک پہونچے گی اور اسی سلسلہ میں کچھ تھوڑی بہت ابتدائی عربی کے بعد دینیات کی مذکورہ بالا درس نظامیہ والی کتب ثلٰثہ کے ختم کرانے کی کوشش کی جائے گی، عربی زبان کی تعلیم کا مطلب دینیات کی ان ہی تینوں کتابوں کو پڑھنا ہوگا۔

میری تجویز کا یہ اجمالی خاکہ ہے، رہیں تفصیلات تو اصول کے طے پا جانے کے بعد ان کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں ہے، مشورہ سے ان تفصیلات کو مرتب کیا جا سکتا ہے، البتہ اجمالاً چند کلی باتیں اس سلسلہ میں بھی جو میری سمجھ میں آئی ہیں اگر عرض کردوں تو نامناسب نہ ہوگا،

(۱) تعلیم کی مدت اگر وہی باقی رکھی جائے جو اس وقت یونیورسٹیوں میں مقرر ہے تو میٹرک تک عربی کے سلسلہ کو اس طریقہ سے پہونچانا چاہیئے کہ میٹرک پاس کرنے والے معنی اور مختصر مطلب کے ساتھ قرآن ختم کرلیں، اور انٹرمیڈیٹ پاس کرنے والوں کو مشکوٰۃ یا اسی قسم کی کوئی کتاب مجموعۂ حدیث کی پڑھادی جائے اور بی اے پاس کرنے والوں کو فقہ کے متعلق اتنی معلومات حاصل کر لینا چاہیئں جو شرح وقایہ اور ہدایہ کے پڑھنے سے حاصل ہو سکتی ہیں، مطلب یہ ہے کہ دینیات کی جن تین کتابوں کا تذکرہ شروع ہی سے میں کرتا چلا آرہا ہوں ان میں سے قرآن کو تو بہرحال قرآن ہی کے ذریعے سے پڑھانا چاہیئے لیکن مشکوٰۃ وہدایہ وغیرہ کا تذکرہ میں نے تمثیلاً کیا ہے، مقصود معیار کو متعین کرنا ہے، یعنی ان کتابوں کے پڑھ لینے کے بعد حدیث وفقہ میں جتنی دسترس کے حاصل ہونے کی توقع کی جاتی ہے اس کو کسی ذریعہ سے حاصل کرنا چاہیئے، املاء کا طریقہ اگر مفید سمجھا جائے تو اسی کو اختیار کیا جائے اور اگر یہ خیال ہو کہ کتاب کے ذریعے سے زیادہ فائدہ پہونچ سکتا ہے تو کتابی تعلیم کے اسی طریقے کو باقی رکھا جائے جو اب تک عربی مدرسوں میں جاری ہے،

(۲) میرا خیال ہے کہ وحدت تعلیم کے نظریہ پر اگر اتفاق کر لیا جائے تو عربی کے عام مدارس کو مدارس فوقانیہ (ہائی اسکول) کی شکل میں بدل دیا جائے، جن میں دینیات کی تعلیم ... قرآن پڑھانے تک ختم ہو جائے گی، البتہ بعض بڑے تعلیمی مراکز ان کے تحتانی درجوں

کو ثانوی اسکول کی حیثیت دے دی جائے اور ان بڑے مراکز میں سے مختلف مرکزوں کو مختلف دینی واسلامی علوم کی تکمیل کی تعلیم گاہ بنادیا جائے جہاں عام یونیورسٹیوں کے فارغ شدہ طیلسانیوں کو دینی علوم میں سے کسی خاص علم مثلاً تفسیر یا حدیث یا فقہ یا کلام میں اعلیٰ تکمیلی تعلیم کے حاصل کرنے کا موقع مل سکتا ہو، ہو سکتا ہے کہ تفسیر کے لیے ندوہ کو اور حدیث کے لیے دیو بند کو مختص کر دیا جائے اور فقہ کے لیے فرنگی محل میں کوئی تکمیلی ادارہ قائم کیا جائے۔ کلام اور تصوف کے لیے اجمیر شریف میں انتظام کیا جائے، جہاں اس وقت بھی سرکار نظام کی طرف سے عربی کا ایک بڑا مدرسہ قائم ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں جن باتوں کا اجمالاً تذکرہ مقصود تھا، وہ ختم ہو چکیں، آخر میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ بعضوں نے جو یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حکومت مسلمانوں کے اس تعلیمی مطالبہ کو کیا تسلیم کرے گی؟ اس کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ اس سے بھی زیادہ سخت اور خطرناک مطالبوں کے تسلیم کرنے پر اس زمانہ میں جب حکومت کو مجبور کیا جا سکتا ہے، تو مسلمانوں کا صرف اتنا مطالبہ کہ ایسی تعلیم جو بتدریج ہماری نسلوں کو غیر مسلم بناتی چلی جارہی ہے، اس تعلیم میں اتنی ترمیم کر دی جائے جس سے ارتداد و بے دینی کے اس سیلاب کا انسداد ممکن ہو جائے، تو یقیناً کوئی ایسا مطالبہ نہیں ہے، جسے خواہ مخواہ حکومت مسترد کرنے پر ضد کرے گی۔ ممکن ہے کہ ہندوستان اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات کو حیلہ بنا کر پیش کیا جائے۔ لیکن اس حیلہ کا جواب باآسانی دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر بھی مناسب ہو گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ پٹنہ یونیورسٹی میں یہ تحریک جو ہندو لیڈروں نے پیش کی تھی، پاس ہو گئی ہے، کہ سنسکرت زبان کی تعلیم ہندو طلبہ کے لیے لازم کر دی جائے۔ گو مسلمانوں کی طرف سے کوئی بولنے والا کھڑا نہ ہوا، لیکن تعلیمی وزن کو برابر کرنے کے لیے مسلمان طلبہ پر بھی ان کی کلاسیکل زبانوں (عربی و فارسی) میں سے کسی زبان کا لینا ضروری قرار دیا گیا ہے نہ جانے کی وجہ سے کہیئے یا خود مولویوں کی طرف سے عربی کی دشواری

کی غلط شہرت، عموماً بجائے عربی کے فارسی ہی کے لینے پر طلبہ کو سنا ہے کہ آمادہ کر رہی ہے
اگر یہ واقعہ ہے اور جن ذرائع سے یہ خبر مجھ تک پہونچی ہے اس میں شک کی بظاہر کوئی وجہ
بھی نظر نہیں آتی، تو یوں سمجھئے کہ جس مطالبہ کی منظوری میں لوگ مایوسی کا اظہار کر رہے
ہیں، حکومت اس مطالبہ کو منظور کر چکی ہے۔ کلاسیکل زبانوں کی تشریح و تفصیل خود ہم مسلمانوں
کو اسی شکل میں کرنا چاہیے جس کا ذکر اپنی تجویز میں خاکسار نے کیا ہے، جس میں اردو
و فارسی و عربی تینوں زبان کی تعلیم عربی زبان کی تعلیم کی عملی شکل ہو گی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ
اردو زبان کے مسئلہ کو بھی اسی تعبیر اور اسی تدبیر سے ہم بغیر کسی کش مکش کے بآسانی حل کر سکتے
ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اردو کو مضبوط اور قوی کرنے کا صحیح ذریعہ یہ نہیں
ہے کہ اردو کی ایک کتاب کے بعد اردو ہی کی دوسری کتاب مسلسل بچوں کو پڑھائی جائے۔
بلکہ اردو کو قوی کرنے کے لیے ضرورت ہے فارسی سے مناسبت پیدا کرانے کی اور فارسی
میں قوت وہی حاصل کر سکتا ہے جس نے عربی زبان سیکھی ہو۔ پانی میں پانی ملاتے چلے
جانے سے کوئی نئی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح اردو کی ایک کتاب کے بعد دوسری
اور دوسری کے بعد تیسری کے پڑھانے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ جو وقت اردو کے پڑھانے
میں صرف کیا جاتا ہے اسی وقت میں اردو کے بعد فارسی، اور فارسی کے بعد عربی سے
طلبہ کا لگاؤ پیدا کیا جائے۔ یہ اردو ہی کے قوی کرنے کا ایک کارگر بے خطا نسخہ ہو گا۔
بعض بزرگوں نے میری تجویز پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ علوم جدیدہ خصوصاً سائنس کیمیا
وغیرہ جیسے علوم کی تعلیم بہت پُر مصارف ہے عربی کے غریب مدارس سے ان مصارف کی
پا بجائی ناممکن ہے۔ لیکن خاکسار یہ کب کہتا ہے کہ عربی مدارس میں ان علوم کی تعلیم کا
انتظام کیا جائے۔ میری تجویز تو یہ ہے کہ دینیات کی تعلیم کو ان مدارس میں منتقل کر دیا جائے
جہاں حکومت نے جدید علوم و فنون کی تعلیم کا نظم کر رکھا ہے۔ چاہے تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی
مدارس کو انگریزی مدارس نہیں، بلکہ انگریزی مدارس کو میں چاہتا ہوں کہ مسلمان بنالیا جائے

رہے عربی مدارس سو عرض کر چکا ہوں کہ غیر مرکزی مدارس جو عموماً اس وقت شہروں اور قصبوں میں قائم ہیں، ان کو قرآن کی ابتدائی تعلیم کا مدرسہ قرار دے کر جدید علوم وفنون کا ہائی اسکول مسلمانوں کے لئے بنالیا جائے۔ اور اسلامی علوم کی تکمیلی تعلیم کا مرکز عربی کے مختلف مرکزی مدارس کو قرار دیا جائے۔

اس وقت ہر صوبہ میں شرکائے وطن کے سیکڑوں فوقانی مدارس یعنی ہائی اسکول موجود ہیں، لیکن مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بعض صوبوں میں تو ان کا کوئی اسلامی اسکول ہی نہیں ہے اور جہاں کہیں ہیں بھی تو ان کی تعداد شرکائے وطن کے قائم کردہ اسکولوں کی تعداد کے مقابلہ میں صرف صفر کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن جو تجویز پیش کی گئی ہے، اگر عمل کا قالب اس نے اختیار کرلیا تو مسلمانوں کے اسکولوں کی تعداد بھی اپنی آبادی کی نسبت سے کم نہ رہے گی بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس مناسبت سے ان کی تعداد بڑھ جائے۔ کیونکہ مشکل ہی سے ہندوستان کے کسی صوبہ کا کوئی ضلع، ضلع کا کوئی ایسا تعلقہ برٹش انڈیا خصوصاً شمالی ہند میں ایسا ہوگا جہاں کسی نہ کسی قسم کا عربی مدرسہ نہ قائم ہو۔ جدید علوم وفنون کی تعلیم کو قبول کرلینے کے بعد حکومت کا محکمہ تعلیمات مالی اعانت پر مجبور رہے گا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ حکومت کی مالی اعانت اور چندوں سے جو امداد اب تک ان مدارس کو مل رہی ہے۔ ان دونوں قسم کی رقوم سے بآسانی ہمارے عام عربی مدارس اچھے ہائی اسکولوں کی شکل اختیار کرلیں گے کہنے کو تو یہ ہائی اسکول کہلائیں گے، لیکن دراصل قرآن پڑھانے اور سمجھانے کے یہ مدارس ہوں گے۔ علماء ہی کی نگرانی میں عموماً چونکہ یہ مدارس ہوں گے اس لئے توقع کی جاتی ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی دور مسلمان بچوں کا اسلامی ماحول ہی میں گذرے گا۔ باوجود اختصار کی شدید کوشش کے مضمون میں پھر بھی کافی طوالت پیدا ہوگئی، لیکن کیا کروں ضروری چیزوں سے خاموشی اختیار کرنے پر دل راضی نہیں ہوتا، آخر میں اتنی بات جس پر اپنی کتاب میں میں نے کافی بحث کی ہے، اور بھی کہہ دینی چاہتا ہوں

کہ مسلمانان ہند کی تعلیم کے ان دو مستقل نظاموں کو ختم کر کے ایک نیا نظام تعلیم عمومی کا اگر نہ قائم کیا جائے گا تو اس علمی رقابت کی وجہ سے جو ان دونوں نظاموں سے استفادہ کرنے والے طبقات میں پیدا ہو گئی ہے، روز بروز اس میں اور شدت پیدا ہوتی چلی جائیگی اس کا خاتمہ نہیں ہو سکتا آج تو اس کے نتائج چنداں اہم نہیں محسوس ہو رہے ہیں لیکن خدانخواستہ بات اگر یوں ہی بڑھتی رہی تو کچھ بعید نہیں ہے کہ مسلمانوں ہی میں مذہب اسلام کے دشمن اسی لیے پیدا ہو جائیں کہ مذہب کے نمائندوں سے ان کے قلوب میں نفرت بڑھ رہی ہے، بالکل ممکن ہے کہ مذہبی نمائندوں کی یہ نفرت خدانخواستہ خود مذہب سے نفرت کا ذریعہ بن جائے لا اقدر اللہ[1] میرا خیال ہے کہ ملا اور مسٹر یا عالم اور تعلیم یافتہ کی تفریق کا جہاں تک جلد ممکن ہو خاتمہ کر دینا چاہیے۔ اور نظام تعلیم کی وحدت کے سوا اس کا بظاہر کوئی دوسرا علاج کم از کم میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

بلکہ آج اپنے مذہب اور مذہب کی اساسی کتابوں سے ناواقف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو یہ دھوکا جو دیا جا رہا ہے کہ جس شکل میں مذہب ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، یہ مولویوں کا خود تراشیدہ مذہب ہے۔ اس مغالطہ کے ازالہ کی شکل بھی یہی ہے کہ ہر پڑھے لکھے مسلمان میں اس کی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ اپنے دین کی بنیادی کتابوں کا وہ خود مطالعہ کر سکے رجو تجویز ناکسار نے پیش کی ہے انشاء اللہ اس سے یہ توقع پوری ہو جائے گی۔

یہ خدشہ کہ جدید تعلیم یافتہ طبقات کو قرآن و حدیث سے واقف بنانا

دادن تیغے بدست راہ زن

کے انجام کو کہیں نہ پیدا کرے، یہ بظاہر بے بنیاد خطرہ نہیں ہے۔ بلکہ اولاً قرآن کی لاہوتی قوت پر اعتماد کرنا چاہیے، تجربہ اسی کا مصدق ہے کہ انسانی دماغ کی منطق کے سلجھانے میں قرآن سے زیادہ کارگر کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ یہ درست ہے کہ مغربی

[1] خدا ایسا نہ کرے!

تعلیم کے باطنی رجحانات آدمی کی فطرت کو سلامتی و صحت کے نقطۂ اعتدال سے ہٹا دیتے ہیں۔

اور اسی لیے

ہر چہ گیرد علتی علت شود

کا خطرہ غلط نہیں ہے۔ ڈر ہے کہ مذہب بھی ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر علت کی شکل نہ اختیار کر لے۔ لیکن پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ ان ہی الجھے ہوؤں میں سے انشاء اللہ سلجھے ہوئے بھی نکلتے رہیں گے، اور بگڑے ہوؤں کو درست کرنے کا کام بھی انشاء اللہ وہی انجام دیں گے۔ بہرحال مذہب اور مذہبی تعلیم کی عمومیت سے گریز میرے نزدیک تو بے حقیقت ہے، اسلام نے ان خطرات کا مقابلہ کیا ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ جس حد تک عمومیت اس کی تعلیم میں پیدا ہونے کا امکان ہو، اس سے نفع اٹھائیں اور اس قسم کے خطرات کو خدا کے سپرد کر دیں، اپنے آخری دین کی بہرحال وہ حفاظت فرمائے گا۔

وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۔

دعاءِ خاتمہ

کتابوں میں "خاتمہ" لکھنے کا بھی عام دستور ہے، جب میرے اس مضمون نے کتاب ہی کی شکل اختیار کر لی، تو یہ رسم بھی کیوں چھوڑی جائے۔ لیکن کیا لکھوں؟ بعض کتابوں میں دیکھا گیا ہے کہ دیباچوں، یا تمہیدی کلام ہی میں ان کے مصنفین کتاب کے ناظرین سے صلہ کی خواہش خواہ وہ کسی شکل میں ہو مثلاً" دعا ہی کی آرزو اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے کرتے ہیں مگر بہ ظاہر میرے خیال میں یہ استدعا کچھ قبل از وقت ہے، حقیقی مقام اس کا خاتمہ ہی ہو سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پڑھنے کے بعد اگر کسی کو اس کتاب سے یا اس کے کسی جزء سے کسی قسم کا کوئی فائدہ محسوس ہوا ہو، تو غالباً اس کے بعد "دعاء ظہر الغیب" کی تمنا بے جا نہ ہو گی، اسی بنیاد پر اب میری التجا ہے کہ تو مجھے، میرے والدین مرحومین اور میرے اساتذۂ کرام کو ناظرین حسنِ خاتمہ اور مغفرت کی دعاؤں سے محروم نہ فرمائیں گے، علی الخصوص عم محترم استاذ معظم حضرت مولانا الحکیم الحاج السید محمد ابو النصر الگیلانی رحمۃ اللہ علیہ جن کی آغوشِ تربیت میں فقیر کی تعلیم ہوئی، اور سلامت روی کی راہ کا بڑا حصہ ان ہی کی پاک صحبتوں میں میسر آیا، فاتحہ خیر سے ان کی روح پُر فتوح کو سکون بخشیں گے۔

اَللّٰھُمَّ ارْحَمْہُمَا کَمَا رَبَّیَانِیْ صَغِیْرًا

اسی کے ساتھ آخر میں اپنے عزیز دوست و صاحب مولوی محمد مخدوم محی الدین صاحب حیدر آبادی سلمہ اللہ تعالیٰ کا شکریہ خود اپنی طرف سے اور ان تمام لوگوں کی طرف سے ادا کرنا اپنا فرض خیال کرتا ہوں جو اس کتاب کو اپنے مطالعہ سے سرفراز فرمائیں گے۔ مخدوم صاحب نے بڑی جانکاہی اور محنت سے میرے مسودہ (نامہ سیاہ) کو سچ پوچھیے تو بیضہ (نامۂ سفید) کی شکل میں بدل دیا ہے، اگر ان کی دستگیری میسر نہ آتی تو جس طرح میرے بہت سے مسودے مسودوں کی حیثیت سے آگے نہ بڑھ سکے اس کا حال بھی یہی ہو جاتا، ناظرین اپنی دعاؤں سے ان کو بھی اور ان کے والد مرحوم کو فراموش نہ فرمائیں گے۔

غالباً خواہد گشود از خامہ ام کارے کہ دوش

من ہمی کردم دعا و صبح آمین می دمید

(عارف شیرازی)

۲۶۔ ذی حج ۱۳۶۱ھ م یکم اسفندیار ۱۳۵۲ ف

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔

آج ۴ر جنوری ۱۹۴۳ء بروز دوشنبہ بعد الظہر اپنے وطن گیلان (بہار) میں اس بیضہ کی نظرِ ثانی سے فراغت میسّر آئی۔

کہف الایمان گیلان" (بہار)